مقالات فریدی

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ کے مقالات

(جلد دوم)

جامع و مرتب :

مولانا محب الحق

مقالات فریدی

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ کے مقالات

(جلد دوم)

جامع ومرتب

مولانا محب الحق

استاذ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ

ادارۂ ادبیات دلی

۵۸۰۳ صدر بازار دہلی

جملہ حقوق بحق جامع محفوظ

نام کتاب	:	مقالات فریدی (جلد دوم)
جامع ومرتب	:	مولانا محب الحق (پروہی مدھوبنی بہار)
کمپوزنگ	:	عبدالصبور (عبدالرحمٰن کمپیوٹر گرافکس، شاہی چبوترہ، امروہہ)
ناشر	:	ادارۂ ادبیات دلی ۵۸۰۳ صدر بازار دہلی
طباعت	:	جید پریس بلی ماران دہلی
تعداد	:	۵۰۰
سن اشاعت	:	۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء
قیمت	:	-/۲۵۰ روپے

محمد احمد نے ادارۂ ادبیات دلی کے لئے جید پریس بلی ماران دہلی میں چھپوا کر شائع کی۔

ترتیب

مقالاتِ فریدیؒ

انتساب

مصنفین اور مؤلفین کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی تصنیفات اور تالیفات کو اپنے کسی عزیز یا بزرگ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ میں اس مجموعۂ مقالاتِ فریدی (جلد دوم) کو سید العلماء مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ اور اپنے والدین مرحومین کے نام معنون کرتا ہوں۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

خاکپائے حضرت فریدیؒ

محبّ الحق

یکم محرم الحرام ۱۴۳۱ھ

۱۹؍دسمبر ۲۰۰۹

افتتاحیہ

نحمدهٗ و نصلی علیٰ رسوله الکریم ، اما بعد!

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ (متوفی ۵؍ربیع الاول ۱۴۰۹ھ موافق ۱۸؍اکتوبر ۱۹۸۸ء) کی تحقیقات، تصنیفات اور ذوق مطالعہ کے بارے میں مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی مدیر ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ نے الفرقان کے خصوصی نمبر میں جو مولانا فریدیؒ کی یاد میں شائع ہوا تھا ''نگاہ اولین'' کے عنوان سے جو ارقام کیا ہے اس کا مختصر اقتباس اس کتاب مقالات فریدی جلد دوم میں شامل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''حضرت مولانا فریدیؒ رئیس التحریر اور سلطان القلم تھے۔ وہ کیا بلحاظ تصنیف اور کیا بحیثیت تالیف و تدوین اور کیا از روئے مقالہ نگاری ایک کامیاب بلند پایہ محقق و مبصر تھے۔ انھوں نے مولانا گیلانیؒ کے بارے میں جو یہ لکھا تھا کہ:

''وہ پی. ایچ. ڈی. نہ تھے لیکن اس راہ کے کتنے امیدواروں کو انھوں نے کامیاب بنایا ہے اور ایسی شاہراہ قائم فرما دی ہے کہ میدانِ تحقیق میں ایک ذہین طالب علم بآسانی گامزنی کر سکے اور اسلاف کی کتابوں، تاریخوں اور تذکروں کے بحرِ ذخار سے علم وحکمت کے موتی نکال سکے۔ سچ پوچھیے تو پی۔ ایچ۔ ڈی. بننا آسان ہے۔ مناظر احسن بننا مشکل۔''

آج یہ بات خود مولانا فریدیؒ پر حرف بحرف صادق آتی ہے انھوں نے بلا مبالغہ سیکڑوں مقالے لکھے اور ان میں خداداد بصیرت علمی اور فنی کاوش کا پورا پورا ثبوت دیا، نصف صدی سے زیادہ عرصہ

تک ان کا دریائے علم و تحقیق مجلاتی مقالات اور گرانقدر تصنیفات کی
شکل میں خوب خوب روانی اور جولانی دکھاتا رہا، ان کے خونِ جگر کی
گل کاریوں سے چمن علم و تحقیق میں تازہ بہاریں آگئیں۔''

اسی خصوصی نمبر میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سابق مدیر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ
''گدڑی میں لعل'' کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں:

''مولانا نسیم احمد فریدیؒ عالم، ادیب اور محقق تھے۔ ذوقِ مطالعہ سے
سرشار اور کتب بینی کے عاشق تھے۔ یہ سب اپنی جگہ قابل قدر اوصاف
ہیں مگر مولانا کی ذات میں یہ اوصاف کچھ زیادہ ہی تابناک اس لیے
ہوگئے تھے کہ ان کے پہلو بہ پہلو وہ مسکینی اور خود شکنی تھی جو عربی مدارس
کے بعض طالب علموں میں ملا کرتی ہے یا کسی خانقاہ کے مخلص و بے
نفس خادموں میں۔ عمر بھر اس مسکینی اور خود شکنی کی گدڑی میں
لپٹا ہوا دیکھا ان کے علم و ادب و ذوق تحقیق و مطالعہ کے لعل جب اس
کے اندر سے جھلکتے تو ان کی شان کچھ اور ہی نظر آتی تھی۔

مولانا کا جیسا وسیع ادبی اور تحقیقی مذاق تھا وہ بڑی آسانی سے ایسے
موضوعات میں خامہ فرسائی کی طرف مائل ہوسکتا اور اپنا سکہ منوا سکتا
تھا جن موضوعات کی چند سالہ خدمت گزاری آدمی کو سکہ بند ادیب
اور محقق کا درجہ دلا دیتی ہے۔ مولانا لائبریریوں کی خاک چھانتے تھے
، نادر و نایاب مخطوطات تلاش کرتے اور ان کی نقلیں لیتے تھے۔''

یہ ہیں مولانا فریدیؒ کی تحقیقات کے متعلق موجودہ اور سابق مدیرانِ الفرقان کی رائیں۔

اللہ نے مولانا فریدیؒ کی فطرت میں تحریر و تصنیف کا عمدہ سلیقہ بچپن سے ودیعت فرمایا تھا
بلکہ تصنیف و تالیف اور مطالعہ کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کے خاندان میں متعدد لوگ صاحب

تصنیف و تالیف گزرے ہیں اور انھوں نے کتابی صورت میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

مولانا فریدیؒ کی عمر تقریباً ۱۰-۱۱ سال کی ہوگی تو دل میں کتاب تصنیف کرنے کا شوق و ولولہ پیدا ہوا۔ چند مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرکے ''مجمع البیان'' حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نامی کتاب تصنیف کی اور حکیم سید سلطان احمد رضوی مرحوم امروہوی نے جو کہ آپ کے ماموں زاد بھائی اور ہمدرس تھے اپنے خرچ سے شائع کرائی۔ اس کتاب کو دیکھ کر ایک صاحب نے طنزاً کہا کہ: میاں! تمہاری تو یہ قابلیت نہیں کہ کتاب لکھو۔ کہاں سے نقل کرلی؟ معترض کو علم نہیں تھا کہ

بالائے سرش ز ہوش مندی ☆ می تافت ستارۂ بلندی

مولانا فریدیؒ کی تصنیفات و تالیفات اور مقالات معارف و حقائق کا مجموعہ ہیں۔ اللہ نے آپ سے وہ کام لیا جو ایک کمیٹی یا ایک ادارہ انجام نہیں دے سکتا۔

قارئین جب ''مقالاتِ فریدی'' کا مطالعہ کریں گے تو بخوبی محسوس کریں گے کہ مولاناؒ نے کتنی محنت، جانفشانی، کاوش اور عرق ریزی سے یہ مقالات لکھے ہوں گے۔

مقالاتِ فریدی جلد اول کے منصۂ شہود پر آجانے کے بعد برادرم محمد احمد خاں امروہوی ادارۂ ادبیات دلی ۵۸۰۳ صدر بازار دہلی نے فوراً دوسری جلد کے لیے تقاضہ کردیا کیونکہ پہلی جلد ان کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔

اس جلد کا آغاز و اختتام ملت اسلامیہ ہندیہ کے دو عظیم مصلحین و مجددین کے تذکروں سے کیا گیا ہے۔ آغاز شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی سرہندیؒ سے اور اختتام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم سہارنپوری مہاجر مدنیؒ پر کردیا گیا ہے۔ اس جلد میں بارہ مقالے ہیں اور پہلی جلد میں تیرہ۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے ان کرم فرماؤں کا تذکرہ نہ کروں جنھوں نے راقم کی ہر ممکن ہمت افزائی کی۔ خصوصاً (مولانا) ڈاکٹر سید محمد طارق مہتمم جامعہ اسلامیہ عربیہ

جامع مسجد امروہہ نے احقر کی درخواست پر پیش لفظ تحریر کیا، ساتھ ہی استاذ گرامی مولانا محمد اسماعیل (استاذ حدیث جامعہ ہٰذا) کی رہنمائی حاصل رہی، اور میرے لڑکے مولانا مفتی حافظ قاری امداد الحق بختیار سلّمہٗ (نائب مفتی دار العلوم حیدر آباد) کا بھی تعاون رہا۔ مولوی محمد انظار دیناجپوری اور مولوی محمد پرویز بھاگلپوری سلمہما نے پروف ریڈنگ میں مدد دی اور عبد الصبور سلّمہٗ امروہوی نے کمپوز کر کے اس کتاب کے حسن کو دوبالا کیا۔

قارئین سے عاجزانہ درخواست ہے کہ جہاں آپ مولانا فریدیؒ کے لیے دعا فرمائیں وہیں راقم الحروف کے والدین مرحومین کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ جن دو صاحبوں نے (بغیر نام کے) کتابت اور طباعت میں تعاون کیا اللہ تعالیٰ ان سب کے ساتھ ان دونوں کو بھی اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین

آخر میں التماس ہے کہ اس سیاہ کار کی بھول چوک کو دامن عفو میں جگہ دیں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

مولانا فریدیؒ کہاں اور کہاں یہ حقیر میں تو ''رمزی اٹاوی'' کے اس شعر میں اپنا مافی الضمیر دیکھ رہا ہوں ؎

یہ رمزی بے بصیرت ہے ترے رتبہ کو کیا جانے ☆ جو ہم رتبہ ہو تیرا وہ ترے اوصاف پہچانے

خاکپائے حضرت فریدیؒ

محبّ الحق

خادم التدریس

جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ

یکم محرم الحرام ۱۴۳۱ھ

۱۹؍دسمبر ۲۰۰۹ء

پیش لفظ

ڈاکٹر (مولانا) سید محمد طارق صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ

مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہیؒ سرزمین امروہہ کی چند مشہور ترین علمی اور دینی شخصیات میں سے ایک تھے۔ امروہہ کی کسی محفل میں صرف لفظ مفتی صاحب یا فریدی صاحب استعمال کیا جاتا تو سننے والا اس سے مولانا فریدی ہی کو مراد لیتا تھا۔ ماضی قریب میں امروہہ کی شخصیات میں اپنے گفتار، کردار، علم و عمل، تاریخی معلومات، بزرگانِ دین اور صوفیاء کے مختلف خانوادوں، ان کی اہم شخصیات اور ان کے حالات و واقعات کہ ماخذ کے بارے میں اس قدر معلومات رکھنے والا کوئی دوسرا شخص شاید ہی کوئی ہو۔ پھر اس مرتبہ اور درجہ کے باوصف اتنی آسانی سے دستیاب اور طلباء علم و طالبان فن کی ہر طرح کی مدد کے واسطے اس طرح حاضر تو یقیناً کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ نتیجہ ظاہر ہے چھوٹے بڑے، کھوٹے کھرے، عوام و خواص، اہل ظاہر و اہل باطن، اپنے پرائے، مقامی و مسافر، ہر فرد کی آنکھوں کا تارا اور دل کا پیارا نام تھا مفتی نسیم احمد فریدیؒ۔

خادم ان کا حقیر شاگرد بھی رہا اور حاضر باش بھی۔ ان کی مزاج شناسی اور اپنے بزرگوں کے گھریلو تعلقات کی بنا پر کسی قدر بلکہ بہت زیادہ گستاخ بھی۔ لیکن معمولی اور محبت سے بھرپور بزرگانہ تنبیہ کے علاوہ نہ کبھی غصہ ہوئے، نہ ڈانٹ پھٹکار کی، محبت سے سمجھا دیا اور خوش ہو گئے۔ جب تک میں امروہہ رہا مدرسہ میں بھی اور جھنڈا شہید کی مسجد میں بھی حاضری تقریباً روزانہ ہوتی رہی۔ کبھی کچھ پڑھوا لیتے، یا کسی مسئلہ پر کچھ پوچھنا ہوتا تو بڑی تفصیل سے سمجھاتے۔ میں رام پور چلا گیا تو وہاں حکیم سید سلطان احمد رضوی مرحوم امروہوی ثم رامپوری کے یہاں قیام تھا۔ حکیم صاحب حضرت مولانا کے ماموں زاد بھائی اور درسی ساتھی بھی تھے۔ انھیں کے یہاں قیام فرماتے، مطب کے کمرے میں ہم دونوں کے بستر ہوتے۔ ۱۲،۱۱ بجے تک حکیم صاحب کے ساتھ محو گفتگو رہتے، میں باہوش و گوش یا گوش ہوش گفتگو میں شریک رہتا یعنی ہوش کے ساتھ کان لگائے سنتا۔ جب حکیم صاحب اندر تشریف لے جاتے تو اس گفتگو کے بارے میں دورانِ سماعت جو سوالات ذہن میں محفوظ کر رکھے ہوتے پیش کرتا۔ کہتے اچھا تم سن رہے تھے؟ میں اثبات میں سر ہلا دیتا تو مفصل جواب دے کر ذہن کو مطمئن کر دیتے۔ کچھ نہ کچھ سوتے سوتے بھی،

شروع میں جب تک بینائی سلامت رہی پڑھتے پھر سنتے اور تعریف کرتے، بہت دیر ہو جاتی تو کہتے اچھا سو جاؤ صبح تمہیں اسکول جانا ہے۔

پھر میں علی گڑھ چلا گیا تو جب بھی تشریف لاتے پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی مرحوم کے یہاں (جو کہ آپ کے بھانجے تھے) قیام رہتا۔ مجھے اطلاع دیتے میں پہنچ جاتا۔ آخری زمانہ میں اکثر مولانا محب الحق صاحب ساتھ ہوتے، نظامی صاحب سے گفتگو رہتی، ہمیشہ علی گڑھ کی مشہور علمی شخصیتوں خصوصاً پروفیسر نذیر احمد، مولانا ابرار حسین فاروقی، مولانا فضل اللہ مونگیری، مولانا فضل الرحمٰن گنوری اور دیگر مشرقی علوم سے وابستہ شخصیات کے گھر تشریف لے جاتے۔ ان کی مشایعت کے طفیل ہم جیسے نالائقوں کو بھی اہل علم سے ملاقات اور اس کے ذریعہ ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کا موقع مل جاتا۔ پروفیسر اطہر عباس شیعی نے ہندوستان کی مسلم احیائی تحریکوں پر ایک کتاب لکھی اس میں شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندیؒ کو اپنی تنقید کا مرکز بنایا۔ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے مولانا کو اس کتاب کے مضامین اور زہریلے تیر ونشتر سے آگاہی دی اور جواب لکھنے کی درخواست کی۔ اس کتاب کو پڑھ کر اردو میں خلاصہ سنانا میرے ذمہ کیا۔ میں نے دوسرے ہی دن یہ ذمہ داری ادا کرنی شروع کردی۔ اس کتاب پر پروفیسر حبیب صاحب کا طویل مدحیہ پیش لفظ تھا جس میں مجدد صاحبؒ کو طعن وطنز کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے شروع کی چند سطریں ہی سنی تھیں کہا رکو، رکو اور نظامی صاحب کو آواز دی۔ نظامی صاحب پروفیسر موصوف کی لیاقت کے بڑے مداح تھے۔ مولانا نے فرمایا میاں تم تو حبیب صاحب کے علم کی بڑی تعریف کرتے ہو انھوں نے تو شیخ عبدالحقؒ کو یا تو سرے سے پڑھا نہیں یا پھر سمجھے بغیر ان کی تحریر سے استدلال کر کے مجدد صاحبؒ کو موردِ طعن وتشنیع بنایا ہے۔ نظامی صاحب کو اپنے ممدوح حبیب صاحب کی یہ ناواقفیت سن کر یقین نہ آیا اور مجھ سے اس حصہ سے فارسی متن کو پڑھوا کر سنا۔ انھیں علم ہی نہ تھا کہ پروفیسر موصوف فارسی زبان سے واقف تو تھے لیکن ماہر نہ تھے۔ بہر حال میں نے پوری کتاب تقریباً ایک مہینے میں پڑھ کر سنائی۔ مفتی صاحبؒ نوٹس لیتے رہے اور اس کے بعد اس کا جواب تحریر فرمایا جو واقعی دنداں شکن ہے اور یہ جواب تجلیاتِ ربانی جلد اول کے مقدمہ میں شامل ہے۔

اسی طرح حضرت مولاناؒ کے تعلق سے بہت سی ایسی چیزیں پڑھنے اور آپ کے ذریعہ سمجھنے کا موقع نصیب ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ دورانِ مطالعہ نہ صرف پڑھنے والے کی غلطیوں کی تصحیح کرتے جاتے بلکہ اہم اور مشکل نکات کی تسہیل بھی فرماتے جاتے جو زندگی میں کام آئے اور

اس ناچیز کے کام آئی معاف فرمائیں

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم ☆ چنانکہ حرف عصاء گفتِ موسیٰ اندر طور

میں یہ عرض کر رہا تھا یا کرنا چاہ رہا تھا کہ طالب علمی کے زمانہ سے انھیں درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ تاریخ و تصوف، بزرگانِ دین کے حالات، واقعات و تصانیف کی تحقیق و تلاش اور مطالعہ کا شوق تھا۔ خصوصاً بزرگوں کے مکاتیب اور قلمی تحریروں کا پتہ لگانے، اس کے لیے دور دراز کا سفر کرنے، مشکلات اور دشواری برداشت کرنے، ان تک رسائی، ان کا بنظر غائر مطالعہ، ان کی تلخیص یا نقل کرنے، اہلِ علم اور شوقینانِ فن سے ان کو متعارف کرانا یا چھپوانا ان کا خاص شوق تھا۔ اس سلسلے میں انھیں جہاں پتہ چلتا وہ سفر کر کے وہاں پہنچتے اور ہر طرح کے تعلقات استعمال کرتے، مطلوبہ دستاویز تک رسائی حاصل کرتے اور انتھک جدوجہد اور محنت کے ذریعہ انھیں اہل علم و فن سے روشناس کراتے۔ تحقیق و تجسس کے اس شوق نے انھیں مخطوطات کے مطالعہ کا ماہر، خصوصاً دینی اور مذہبی بزرگوں کے علمی تبرکات کا رمز شناس بنا دیا تھا۔ بزرگانِ دیوبند سلسلۂ چشتیہ، خانوادۂ ولی اللہی اور خاندانِ مجددی کے بزرگوں اور اہل قلم کے حالات و تحریروں کی تلاش جستجو اور تعارف ان کا خاص میدان تھا۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کئی مرتبہ فرمایا کہ آپ کے کاموں خصوصاً مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کتاب ''آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی'' کے نقد پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنی چاہیے۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے ان کا تعلق اور پھر ان کے ساتھ ان کے مشہور رسالہ ماہنامہ ''الفرقان'' سے وابستگی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور مولانا فریدی اور مولانا نعمانیؒ کے تعلق نے مولانا فریدی اور الفرقان رسالہ کو یک جان و دو قالب بنا دیا۔ اس سلسلے کی مولانا فریدیؒ کی علمی و دینی تحقیقات و اطلاعات پی. ایچ ڈی کے سیکڑوں مقالات پر بھاری ہیں۔ الفرقان کے علاوہ روزنامہ ''الجمعیۃ'' کے روزانہ و ہفت روزہ اور خصوصی نمبروں، اخبار ''مخبر عالم'' مراد آباد، ''نیر اعظم'' مراد آباد اور ماہنامہ ''دارالعلوم دیوبند'' ماہنامہ ''تذکرہ دیوبند''، ماہنامہ ''سلطان العلوم'' ، ماہنامہ ''الحرم'' میرٹھ، ماہنامہ ''تاج'' لاہور، ماہنامہ ''برہان'' دلی میں مولانا کے قلم سے نہ جانے کتنی نادر تحقیقات معلومات محفوظ ہو کر یادگار بن گئی ہیں۔ ضرورت تھی کہ یہ تمام علمی سرمایہ اور تحقیقی معلومات کے شہ پارے کتابی شکل میں مرتب ہو کر اہل نظر کے سامنے آتے اور اہل تلاش و ضرورت کے ہاتھوں میں پہنچتے اور نجی اور قومی کتب خانوں میں محفوظ ہوتے تاکہ وقت ضرورت

طلباءِ علم و تحقیق، اساتذہ کرام، محققان عظام اور وہ دلدادگانِ احوال و آثار، بزرگانِ دینِ متین ان سے استفادہ کر سکتے۔

مولانا محب الحق صاحب جو مفتی صاحبؒ کے شاگرد بھی ہیں، خادم بھی، برسوں ان کے نہ صرف دن رات کے ساتھی، بلکہ حقیقتاً حضرت مولاناؒ کے ہاتھ اور آنکھ بنے رہے۔ انھوں نے دراصل اپنے علمی بازوؤں کو مستحکم اور آنکھوں کو منور کیا ہے۔ یہ ان چند خوش قسمت افراد میں سے ایک ہیں جنھیں عرصۂ دراز تک مولانا فریدیؒ کی صحبت میں حاضر باشی کا شرف حاصل رہا ہے۔ مولانا کی بینائی جاتے رہنے کے بعد مولانا محب الحق صاحب نے ایک عرصہ تک ان کے قلم و نگاہِ فیض رسا اور احسان بخش کارنامہ بھی انجام دیا ہے یعنی مولاناؒ کے لیے یہ ماخذ پڑھ کر سنانا اور اس کے نتیجہ میں حضرت مولاناؒ کے حاصل شدہ نتائج کو تحریر کا جامعہ پہنانا۔ ان دونوں ذمہ داریوں سے مولانا کو علمی مدد حاصل ہوئی اور ان کی صلاحیتِ علمی اور محنت و اعانت سے جو علمی و تحقیقی شہ پارے منصۂ شہود پر آئے وہ ملت کے لیے ایک قیمتی تحفہ اور بیش بہا خزانہ بنے۔

ضرورت تھی کہ حضرت فریدیؒ کے علمی نوادر جو اخباروں، رسالوں اور خصوصی نمبروں کے صفحات کی شکل میں کتب خانوں کی زینت ہیں، مضامین کے مجموعوں کی مستقل علمی شکل میں مرتب ہو کر علم کے متلاشی اور حالات و واقعات کے ضرورت مندوں کے ہاتھوں میں پہنچتے۔ بزرگوں اور اہل علم کے تقاضوں سے متاثر ہو کر مولانا محب الحق صاحب نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مضامین فریدی کا پہلا مجموعہ ''مقالاتِ فریدی'' کے نام سے منصۂ شہود پر آچکا ہے جس پر دیگر حضرات کے ساتھ مشہور و معروف عالم دین، عصر حاضر کے یگانہ مفسر قرآن حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلویؒ جو ابھی کل ہی ہم سے جدا ہو کر عازم وطن حقیقی ہوئے ہیں، کی تقریظ جو شاید آخری یا آخری یادگار علمی تحریروں میں سے ایک ہوگی، شامل ہے۔

دوسرا مجموعہ ''مقالاتِ فریدی جلد دوم'' پریس جانے کو تیار ہے اس میں حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ کے بارہ مقالے شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصنفؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور مرتب سلمہ اللہ تعالیٰ کو دین و دنیا میں کامیاب و بامراد رکھے اور زورِ قلم میں اضافہ اور علمی شہ پاروں کی جمع آوری اور عاشقان علم و فن تک ان کی رسائی کی مسلسل توفیق و کامیابی نصیب فرمائے۔ آمین۔

۲۸ر شوال المکرم ۱۴۳۰ھ سید محمد طارق امروہہ

مطابق ۱۸را کتوبر ۲۰۰۹ء

مقالاتِ فریدی (۱)

الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ[1]

(از افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ)

بلاشبہ حضرت مولانا گیلانی برّد اللہ مضجعہ، رئیس التحریر اور سلطان القلم تھے۔ وہ کیا بلحاظ تصنیف اور کیا بحیثیت تالیف و تدوین اور کیا از روئے مقالہ نگاری ایک کامیاب اور بلند پایہ محقق و مبصر تھے۔ وہ "پی. ایچ. ڈی." نہ تھے لیکن اس راہ کے کتنے امیدواروں کو انھوں نے کامیاب بنایا ہے اور ایسی شاہراہ قائم فرما دی ہے کہ میدانِ تحقیق میں ایک ذہین طالب علم بآسانی گامزنی کر سکے اور اسلاف کی کتابوں، تاریخوں اور تذکروں کے بحرِ ذخار سے علم و حکمت کے موتی نکال سکے، سچ پوچھیے تو پی. ایچ. ڈی. بننا آسان ہے؛ مناظر احسن بننا مشکل ع

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدور پیدا

بقول سید سلیمان ندویؒ:

"ہمارے[2] پی. ایچ. ڈی. زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں اور ساری عمر اسی کو چومتے، چاٹتے رہتے ہیں۔"

علامہ گیلانیؒ نے بلا مبالغہ سیکڑوں مقالے لکھے اور ان میں اپنی خداداد بصیرت اور علمی و فنی کاوش کا پورا پورا ثبوت دیا۔ ان کے خونِ جگر کی گلکاریوں سے چمنِ علم و تحقیق میں تازہ بہاریں آگئیں۔ وہ جدید و قدیم دونوں روشوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے تعلیم

---

[1] یہ مقالہ ماہنامہ الفرقان لکھنو کے گیلانی نمبر سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

[2] معارف سلیمان نمبر ص ۳۷۲ (فریدی)

"دارالعلوم دیوبند" میں پائی اور معلمی جدید زاویہ نگاہ رکھنے والوں میں کی۔ وہ دونوں وادیوں کے پیچ وخم سے آگاہ تھے۔ ان کی تحقیق سے ایک طرف قدیم طرز کے طلباء کو تسکین ہوتی تھی دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات اطمینان حاصل کرتے تھے۔ ان کے وجد انگیز قلم کے جتنے نمونے ہیں بہترین شاہکار کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کی اردو نثر ان کے صاحب طرز انشا نگار ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی زبان "قلعہ معلی، دارالعلوم دیوبند، عثمانیہ یونیورسٹی اور صوبہ بہار" کے علمی گھرانوں کی ملی جلی خصوصیات کی آئینہ دار تھی۔ ان کی تحریر میں فصاحت، بلاغت وسلاست وروانی، جدید وقدیم علمی اصطلاحیں، جذب وکیف، جوش وخروش، پیغام و طنز سب ہی کچھ موجود تھے۔ ان کا کلام دماغ سے زیادہ دل سے اپیل کرتا تھا۔ ان کے اکثر و بیشتر جملے الہامی ہوتے تھے۔ عبرت اور سبق حاصل کرنے والوں کے لیئے ان کے یہاں بہت سی کام کی باتیں لمبی لمبی تحریروں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کے سوز وغم میں نشاط اُخروی کی جھلک ہے۔ اور ان کے دل کی دھڑکن فلاحِ دارین کی منزل پر پہنچانے کے لیے "جرس کارواں" کا کام دیتی ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک تقریر "دارالحدیث دیوبند" میں سنی تھی۔ اس کی لذت آج تک دل ودماغ پر حاوی ہے۔ دو ایک جگہ ان کے خطوط دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ ان میں بھی عجیب لطف سخن پنہاں ہے۔ مرحوم نے جذبات وتحقیق کی آمیزش سے اپنی تحریروں میں ایک خاص رنگ بھر دیا تھا۔ "القاسم دیوبند" میں ان کے مضامین پڑھ کر مجھے ان سے پہلا تعارف حاصل ہوا تھا۔ پھر ان کی کتاب "النبی الخاتم" دیکھی جس میں "مکی" زندگی اور "مدنی" زندگی کے پُر کیف نظارے دکھائے گئے ہیں۔ اس میں محبت رسولؐ ہے کہ اُبل رہی ہے، جذبات عقیدت کا سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اللہ اکبر! کتنی کیف آور کوثر تحریر ہے کہ ناظرین وسامعین کے قلوب کو غرق موجِ کوثر کر دیتی ہے۔ "الدین القیم، نظام تعلیم وتربیت اور سوانح قاسمی" کا بھی مطالعہ کیا۔ سب نے متاثر کیا اور سب اپنے اپنے رنگ

میں خوب ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ان کی شخصیت سے تفصیلی تعارف ان دو مقالوں سے ہوا جو "الفرقان" کے مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے لکھے گئے تھے۔ اُس وقت میں بریلی میں موجود تھا۔ مجدد الف ثانی نمبر والا مضمون الفرقان کے لیے پہلا مقالہ تھا جو ۱۳۵۵ھ میں آیا۔ بس یہ "ابتدائے عشق" تھی جس کے آگے سب نے دیکھا کہ "بہار" کے "مجذوب محقق" نے دامن الفرقان میں جذبات وتحقیقات کے کیسے کیسے موتی برسائے۔

غالباً ۱۳۷۲ھ تک سترہ، اٹھارہ سال ان کے مضامین کی سلسلہ جنبانی رہی۔ یوں سمجھیے گویا مولانا گیلانیؒ الفرقان کی مجلسِ ادارت کے بھی ایک اعلیٰ رُکن تھے۔ ہائے مولانا گیلانیؒ! خدا ان کو بخشے۔ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ اب ان جیسا "حریف مے مرد افگنِ عشق" بن کر "میخانہ راز و نیاز" میں کون آئے گا؟ ع دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

اب ہم ان کی تازہ تحریر کی ایک سطر بھی نہ پڑھ سکیں گے۔ بے شک خزاں کے دور میں جب بوئے گُل سے محرومی ہوجاتی ہے تو عرقِ گلاب ہی کی جستجو ہوتی ہے۔ اسی لیے ادارۂ الفرقان نے سوچا اور بہت اچھا سوچا کہ الفرقان میں شائع شدہ مضامین گیلانیؒ کا "عطر مجموعہ" نکال لیا جائے۔

میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر لکھے ہوئے ان کے مقالے کی تلخیص اور اس پر تبصرہ کروں۔ یہ کام بھی کوئی معمولی کام نہیں کہ مجھ جیسا "نا آشنائے لذّت پرواز" انجام دے لیکن میاں (مولانا) عتیق الرحمٰن سنبھلی کی فرمائش پر جیسا کچھ بھی انجام دے سکا ہوں پیش کر رہا ہوں اور روحِ گیلانیؒ سے شرمندہ ہوں کہ اس "بادشاہ فصاحت وبلاغت" کا اس کی شایانِ شان اعلیٰ پیمانہ پر کوئی علمی تعارف نہ کرا سکا۔

سب سے پہلے بطور تمہید ومقدمہ چند باتیں عرض کرلوں پھر دائرۂ موضوع میں آؤں گا۔

(۱) اکبری فتنہ جو دین الٰہی کے نام سے برپا ہوا تھا درحقیقت ایک خطرناک فتنہ تھا اگر

بروقت اس کی خبر گیری نہ ہوتی تو اسلام کا دیوالہ نکل جاتا۔ یہ درحقیقت ع

ایک سازش تھی فقط مذہب وملت کے خلاف

بظاہر اسباب سلطنت مضبوط کرنے کا اچھا طریقہ ہاتھ آیا تھا لیکن سرمایۂ ملت کو برباد کر کے سلطنت کو مضبوط کیا جارہا تھا۔ اور ''بابر کا پوتا'' اپنے ہاتھوں اس شجر بارآور کو کاٹ رہا تھا، جس کے سائے میں دین و دنیا دونوں کی کامیابیاں پرورش پاتی ہیں۔ الحادوزندقہ کی انتہا ہو چکی تھی سب مذہبوں کا ''عرق مرکب'' نکالنے کا خیال تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ سب سے زیادہ مخالفانہ زد اسلام پر پڑی، اس دین الٰہی کا ذکر جدید وقدیم مورخین نے کیا ہے لیکن اس کے زہریلے نتائج پر بدایونیؒ سے زیادہ کسی کی نظر نہ تھی۔ بدایونیؒ کے بعد گیلانیؒ نے اس تفصیل کے ساتھ ان نتائج کو پیش کیا کہ بدایونیؒ بھی ہوتے تو ان کو داد دیتے۔

(۲) ابوالفضل اور فیضی یہ دونوں بھائی دربار اکبری پر چھائے ہوئے تھے، ان میں اول الذکر میر منشی اور اعلیٰ منصب دار تھا۔ دوسرا ملک الشعراء اور معلم شاہزادگان۔ علوم عقلیہ کا دونوں پر پورا پورا اثر تھا۔ نقلی علوم سے بہرہ وری نہ تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے عقائد بھی تباہ کرنے کی کوشش کی اور ایسی اسکیم دربار اکبری میں تیار کی جس سے اسلام کا نام ونشان ہی مٹ جائے۔ سچ پوچھیے تو دین الٰہی کے کنوینر یہ دونوں بھائی ہی تھے۔ ناخواندہ اکبر پران دونوں نے اپنا سکہ جمالیا تھا۔

مورخینِ حال، ابوالفضل کے قتل کی وجہ لکھتے تو ہیں لیکن ایک وہ خاص وجہ، جس کو خود ''جہانگیر'' نے اپنے قلم سے ''تزک'' میں لکھا ہے، چھوڑ جاتے ہیں۔ اور تماشے کی بات ہے کہ طبع کراتے وقت ''تزک جہانگیری'' کے ایڈٹ کرنے والے ایک ریفارمر قسم کے بزرگ نے نہ معلوم کس مصلحت سے اس حصہ کو حذف کر دیا ہے، وہ تو یہ کہیے کہ مجھے ''مدرسہ اشاعت العلوم بریلی'' کے کتب خانہ سے مستعار آیا ہوا ایک قدیم قلمی ''تزک'' کا نسخہ دفتر الفرقان میں مطالعہ کرنے کے لیے مل گیا تھا اور یہ بات میں نے اسی وقت اپنے دل میں

نوٹ کر لی تھی۔ اس وقت قلمی ''تزک'' تو میرے سامنے نہیں ہے۔ ''تذکرہ فاتحانِ[۱] ملک ہند'' قلمی سے ''تزک'' کا مضمون نقل کرتا ہوں۔ ممکن ہے الفاظ میں کچھ تفاوت ہو لیکن مفہوم بالکل وہی ہے۔

''در کتابے کہ بر واقعات خود برنگاشتہ وتزک جہانگیری نام داشتہ می نگارد کہ از ابوالفضل روگرداں بودم از انکہ در پیرانِ سالی پدرم را از راہ مستقیم باز داشتہ۔ ترجمہ: جہانگیر نے اپنی خودنوشت تزک میں لکھا ہے کہ میں ابوالفضل سے اس وجہ سے ناراض تھا کہ اس نے میرے باپ (اکبر) کو بڑھاپے میں راہ مستقیم سے ہٹا دیا تھا۔''

اسی تذکرہ فاتحانِ ہند سے تفصیل سنیے جو اکثر وبیشتر تزک ہی سے ماخوذ ہے:

''زمانیکہ شہریار چراغ پگاہی بود از شہزادہ مرزا سلیم شکررنجی کشید۔ ترجمہ: جس زمانہ میں اکبر بادشاہ چراغِ سحری تھا شہزادہ سلیم (جہانگیر) سے اس کی ناچاقی ہو گئی۔''

ناچاقی زیادہ بڑھی تو اکبر نے ابوالفضل کو ''دکن'' سے مشورہ کے لیے بلایا وہ وہاں مع اہل وعیال اقامت گزیں تھا۔ ابوالفضل نے جلدی میں اپنے اہالی موالی وہیں چھوڑے اور خود یکہ وتنہا چل پڑا۔

جہانگیر کو- جو بچند وجوہ اس سے رنجیدہ تھا- اچھا موقع ہاتھ آیا: قتل کرانے کا منصوبہ گانٹھ لیا، وہ وجوہ کیا تھیں؟ سنیے:

''یکے آنکہ بدکیش بود۔ ترجمہ: اول یہ کہ ابوالفضل بدمذہب تھا''

''دوم آنکہ خسرو رادریں پیرانہ سالی بہ آئینے آورد کہ می گفت قرآن نہ

---

[۱] اس قلمی نسخہ میں مولف کا نام درج نہیں ہے۔ مجھے مولوی محمود احمد عباسی مورخ امروہہ نے یہ نسخہ عنایت فرمایا ہے۔ (فریدی) جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو عباسی صاحب بقید حیات تھے۔ ۱۴ / مارچ ۱۹۷۴ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ (محب الحق)

کلام ربانی است از زبان رسول ایزدیست۔ ترجمہ: دوسری وجہ یہ تھی
کہ ابوالفضل نے اکبر کو بڑھاپے میں یہ پٹی پڑھا دی تھی کہ قرآن
عظیم کلام ربانی نہیں ہے بلکہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام
ہے (نعوذ باللہ)

پھر کیا ہوا۔ ابوالفضل ''گوالیار'' کے راستے سے آرہا تھا ''رانا مالدیو'' سے جو جہانگیر کا خسر تھا، سازش کر کے قتل کروادیا۔ خود جہانگیر نے تاریخ قتل ابوالفضل یہ نکالی:

''تیغ اعجاز جناب آں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سر باغی برید۔
ترجمہ: تیغ اعجاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر باغی کاٹ دیا۔''
باغی کا سر یعنی پہلا حرف (ب) کاٹ کر اچھی خاصی تاریخ نکل آتی ہے۔

یہ خدا کی طرف سے بات تھی کہ وہ جہانگیر جو ایام شہزادگی میں کیا اپنی سلطنت کے کئی برسوں میں بھی مذہبی حیثیت سے کمزور تھا، اس جہانگیر کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اتنی صلاحیت موجود تھی کہ وہ اس روح فرسا الحاد و زندقہ کو برداشت نہ کر سکا۔ اگر چہ حصول سلطنت کی خواہش بھی ملی ہوئی ہو لیکن قتل ابوالفضل کی نمایاں وجہ اس کا الحاد ہے۔ یہ بھی اعجاز رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا صدقہ ہے کہ اس بڑے سبب کو بر بنائے مصلحت مٹانے اور چھپانے کے باوجود تاریخ نے اس حقیقت کو اپنے اندر محفوظ رکھا۔ آج بھی بعض ''نگارخانوں'' میں نام نہاد ''زریں نگار'' ادیب اس قسم کے راگ الاپتے رہتے ہیں۔ مولانا گیلانیؒ کی زندگی میں ان کو یہ لکھ دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے کہ حضرت یہ زریں نگاری جو آج بعض الحاد پسندوں کے قلم سے ادا ہو رہی ہے نئی اُپج نہیں ہے یہ بھی ابوالفضل کی چھوڑی ہوئی ہڈی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات (مرتبہ عبیداللہ) کے مکتوب ۳۱ میں لکھا ہے کہ ابوالفضل یا فیضی دونوں بھائیوں میں سے ایک یہ بات کہا کرتا تھا:

''دنیا نقد است وآخرت نسیہ ہیچ کس نقد را بنسیہ نفروختہ است۔

ترجمہ: دنیا نقد ہے اور آخرت اُدھار۔کوئی بھی نقد کو ادھار کی امید میں ہاتھ سے نہیں دیتا ہے (نعوذ باللہ)۔''

(۳) مُلا عبدالقادر بدایونی، عہد اکبری کا مشہور مورخ ہے ''منتخب التواریخ'' اس کی معرکتہ الآرا تاریخ ہے جس سے دورِ اکبری کا پورا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ملا بدایونی گھر کے بھیدی ہیں۔اکبر کے دور صلاحیت میں اس کے امام رہ چکے ہیں۔صوفی مزاج اور راست باز ہیں۔علما سے تحصیل کے لیے چکر لگاتے ہیں، خانقاہوں میں اہل اللہ سے جا جا کر ملتے ہیں۔سید محمد میر عدل امروہیؒ سے بھی ان کا ربط ہے، وہی میر عدل جنھوں نے دربار اکبری کے علماءِ سوء پر ایک غلط بات سے غصہ ہو کر اپنا عصا اُٹھایا تھا۔میرا مقصد یہ ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی ایک ثقہ مورخ ہے۔آج تک اس کی کوئی تاریخی بددیانتی ثابت نہیں کی جاسکی ہے۔اس کے بیانات میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں ہے۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی معتبر تحریر میں یہ بات تھی کہ جہانگیری دور تک منتخب التواریخ اپنی صاف گوئی کی وجہ سے ممنوع الاشاعت رہی۔بعد کو جب اثرات مجدّد الف ثانیؒ آشکارا ہوئے تو یہ کتاب بھی عام طور پر سامنے آئی۔مولانا گیلانیؒ نے اپنے مجدّد نمبر والے مضمون میں اس تاریخ سے بہت کام لیا ہے اور بڑی عجیب ترتیب سے تمام واقعات کو یکجا کر دیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گیلانیؒ کی روح، ملا عبدالقادر بدایونی کی روح سے ہم آہنگ ہو کر یہ مقالہ مرتب کر رہی ہے۔مولانا گیلانیؒ نے جس خاص ترتیب کے ساتھ واقعات جمع کر دیے ہیں، بدایونی اس ترتیب کے ساتھ کسی وقتی مصلحت سے مجبور ہو کر پیش نہ کر سکے تھے۔چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو اس طرح منظم کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔مولانا گیلانیؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''خود ملا عبدالقادر جن کی کتاب سے میں نے ان واقعات کا انتخاب کیا ہے بندۂ خدا نے نہ جانے کس مصلحت سے ان کو تقریباً چار سو

صفحات میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ پراگندہ صورت میں قلم بند کیا ہے۔ ترتیب میں مجھے کافی دقت اُٹھانی پڑی تاہم ایک کام ہو گیا۔''

ملا عبدالقادر کی مصلحت کو، ان کی دل کی آواز کو اور ان کے پیش کردہ نقشۂ حال کو اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ: بعد کے مورخین و محققین نے شاید اتنا نہ سمجھا ہوگا جتنا حضرت گیلانیؒ نے سمجھ لیا ہے۔ نتائج جو ملا عبدالقادر بدایونی بر بنائے مصلحت نہ نکال سکتے تھے مولانا گیلانیؒ نے ان نتائج کو اس طرح برآمد کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے علمی حلقوں میں اس مقالے کی بڑی دھوم مچ گئی تھی اور جوں جوں زمانہ گزر رہا ہے اس کے مندرجہ حقائق اور زیادہ دعوت غور و فکر دے رہے ہیں۔

(۴) اکبر کے متعلق اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ ایک ناخواندہ مگر منتظم، بہادر اور عقل دنیاوی کا مالک تھا۔ پچاس سال اس نے سلطنت کی اس کے حدود سلطنت بھی کافی وسیع تھے۔ داخلی و خارجی اثرات سے متاثر ہو کر اور متعدد اسباب کی بنا پر اس کو ''دینِ الٰہی'' کے قیام کی سوجھی تھی۔ دین الٰہی قائم کر کے اس نے جو کچھ کیا وہ مولانا گیلانیؒ کے قلم نے خوب ہی واضح کر دیا ہے۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اکبر نے انتقال کے وقت توبہ کر لی تھی مگر اس کا مکمل ثبوت درکار ہے۔ دل ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ کاش کسی طرح یہ بات صحیح ہو جائے کہ اکبر بادشاہ دنیا سے بسلامتیٔ ایمان رُخصت ہوا، مگر واقعات و حقائق کا کیا جائے؟ یوں تو وہ بعد مرگ عرش آشیانی کے لقب سے ملقب ہو ہی گئے تھے۔ خود عالمگیرؒ نے جن کا دیندار ہونا اظہر من الشّمس ہے اپنے ''رقعات'' میں دو ایک جگہ اس لقب سے اکبر کو یاد کیا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ پہلے کیا تھا پھر کیا بنا اور آخر تک کیا رہا۔ اسلام کو اس کے ہاتھوں کیا کیا صدمات پہنچے اور کیا کیا پہنچ سکتے تھے اگر بفضل ایزدی حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی حمایت آڑے نہ آتی۔

(۵) حضرت مجدّد الف ثانیؒ مشہور عالم شخصیت ہے ہزارۂ دوم میں جو فتنہ بڑے

طمطراق اور جاہ وجلال کے ساتھ شاہی نگرانی میں بڑے بڑے فلسفیوں کو حمایتی بنا کر نمودار ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹانے کے لیے ایک زبردست روحانی طاقت دے کر مجدّد کی حیثیت سے آپ کو کھڑا کر دیا۔ بقول محقق گیلانیؒ: اس دور کی خصوصیت کے پیش نظر ہی آپ کو مجدّد الف ثانیؒ کہا جاتا ہے۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں ☆ اللہ نے بر وقت کیا اس کو خبردار

چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اکبری دور کی تاریخ، ملا عبدالقادر کی مدد اور مولانا گیلانیؒ کی ترتیب سے مرتب ہو تو مجدّد صاحبؒ کے کارنامے روشن ہوں۔ ایک فقیر بے نوا ''سرہند'' کی خانقاہ کے ایک گوشے میں بوریہ پر بیٹھ کر جو انقلاب عظیم ''اکبر اعظم'' کی تحریک کے مقابلہ میں برپا کرتا ہے اس کی اہمیت معلوم نہیں ہو سکتی جب تک کہ مولانا گیلانیؒ کا الہام خیز اور معارف ریز قلم ایک کامیاب مقالہ نہ لکھے۔

چلتے چلتے ایک بات اور بتادوں کہ مولانا گیلانیؒ کے نزدیک فتنہ دین الٰہی کے یہ اسباب تھے: (۱) حکومت (۲) علماء سوء (۳) دربار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باریافتوں اور شرف صحبت کے سعادتمندوں کی تحقیر کرنے والی جماعت (۴) صوفیاء خام

ان میں سے دو اول الذکر اسباب پر اس مقالہ میں بحث کی ہے اور ربیع الآخر ۱۳۵۸ھ کے الفرقان میں تیسرے سبب کے متعلق یہ لکھ کر کہ ہمارے دوست مولانا نعمانی غالباً الفرقان میں سبب ثالث کے متعلق کافی بحث فرما چکے ہیں کچھ نہیں لکھا۔ البتہ چوتھے سبب پر خوب دل کھول کر لکھا ہے۔ میں عدم گنجائش کے باعث اس دوسری قسط کا خلاصہ اور اس سے متعلق تبصرہ نہ کروں گا۔ صرف مجدّد الف ثانیؒ نمبر والے مقالہ پر جو ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ چند صفحات لکھے ہیں۔ اور یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ناظرین کے دل و دماغ میں وہ بات بطور خلاصہ جاگزیں ہو جائے جس کو مولانا گیلانیؒ چاہتے ہیں کہ دل و دماغ میں جاگزیں ہو۔ خاص ترتیب کے ساتھ ان کی عنبرین تحریر کے خاص خاص نمونے بھی پیش کروں گا۔

اب میں کیوں زیادہ حائل رہوں، آیئے مولانا گیلانیؒ کے افادات سے براہ راست مستفیض ہوجیے۔

بعد حمد وصلوٰۃ مقالہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''وحدت وجود اور وحدت شہود کی فنی نکتہ نوازیوں یا شریعت وطریقت کی ملایانہ وصوفیانہ معرکہ آرائیوں کے ہنگاموں میں حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ کے واقعی اور حقیقی کارنامے کچھ اس طرح رل مل گئے کہ حضرت شیخ قدس سرہ العزیز کو مجدّد الف ثانی کہنا بجز ایک روایتی خوش اعتقادی کے بظاہر اور کسی امر مہم پر مبنی نہیں معلوم ہوتا۔ مشہور کردیا گیا ہے کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ نے حضرتؒ کو اس خطاب سے کسی خاص وقت میں مخاطب کیا تھا اور اسی خطاب خاص نے رفتہ رفتہ عام صورت اختیار کر لی لیکن کیا حضرت کا مجدّد الف ثانیؒ ہونا محض ملا عبدالحکیم کے ایک خاص خطاب وتلقیب ہی کا نتیجہ ہے؟''

آگے چل کر فرماتے ہیں:

''شاید غور نہیں کیا گیا خصوصاً ہمارے علما اور صوفیا نے حضرت مجدّد صاحبؒ کو جب دیکھنا چاہا تو اس ماحول سے جدا کر کے دیکھا جس میں آپ کا وجود مسعود قدرت کی جانب سے سرزمین ہند کو عطا کیا گیا تھا۔''

بعدہٗ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے کہ ''انھوں نے اپنی تقریر میں یہ سوال اُٹھایا تھا کہ کیا وجہ تھی کہ مغل حکومت کے تخت پر چار بادشاہ مسلسل ایسے بیٹھے کہ ان میں دو پچھلوں کو دو پہلوں سے کوئی تعلق نہ تھا؟ شاہجہاں اور عالمگیر کا، جہانگیر اور اکبر سے مقابلہ کر کے دیکھیے دونوں میں کوئی مناسبت ہے؟''

پھر لکھتے ہیں کہ:

''نواب علامہ کا یہ سوال جو فلسفۂ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے یقیناً ایک عجیب سوال تھا اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ سب سے پہلے اس اہم سوال کے جواب کا علم مجھے آپ ہی کی زبان سے ہوا اور دراصل اسی مجمل جواب کی آج کچھ تفصیل اس حد تک چاہتا ہوں جس حد تک کسی مجلاتی مقالہ میں گنجائش ہوسکتی ہے۔''

اس کے بعد ''سیر المتاخرین'' کی ایک فارسی عبارت پیش کر کے جس میں دین الٰہی کا ذکر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اسائش خلق اس دین میں تھی۔ عہد شاہجہاں میں تعصب شروع ہوا اور عہد عالمگیر میں تعصب شدت پذیر ہوگیا۔ یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''آج اسی مشاغبہ (پروپیگنڈا) کا نتیجہ ہے 'عالمگیر اور مذہبی تعصب تقریباً دو مترادف الفاظ بن گئے ہیں۔ مشکل ہی سے اب کوئی تعصب کے لفظ کا تخیل اس طرح کرسکتا ہے کہ بے ساختہ اس کے ساتھ عالمگیر کی صورت بھی دماغ میں نہ کھچ جائے۔ یہ سب کچھ کیا گیا اور اس اجمال کی تفصیل میں معلومات کے دریا بہا دیے گئے۔ مجلدات شائع کیے گئے اور کیے جا رہے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے باایں ہمہ ذوق، بسط و تفصیل دعوی کے دو پہلوؤں سے ایسی لاپرواہی برتی گئی کہ آج جب 'ہسٹری کے شگوفوں' میں رگ گل پر بھی نشتر زنی سے نہیں چوکا جاتا۔ یہ دونوں پہلو غنچۂ دہن بستہ کی شکل میں چھوٹ گئے یا قصداً چھوڑ دیے گئے..... آج جب چیونٹی کی آنکھوں کے پردے گنے جاتے ہیں اور مکڑی کے جال کے تانوں کی بھی رپورٹ مرتب کی جاتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایک ہی دعویٰ کے ایک پہلو

کو اتنا روشن کیا جاتا ہے اور اس زور سے اس کا نرسنگھا پھونکا جاتا ہے کہ آنکھیں چیخ اُٹھتی ہیں اور کان انگلیوں کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں لیکن اسی دعوے کے دوسرے اجزاء کو اتنی کس مپرسی میں ڈال دیا جاتا ہے کہ گویا علم و تحقیق کے وہ سزاوار ہی نہ تھے.... پوری تفصیل کے ساتھ بتانا چاہیے تھا کہ الٰہی مذہب کی حقیقت کیا تھی۔ ''خلق'' جو اسائش میں تھی تاریخی حیثیت سے اس کی تحقیق کرنی چاہیے کہ ''خلق'' کے تحت میں کون کون سی جماعتیں داخل تھیں، ان کی اسائش کی نوعیت کیا تھی اور آخر میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے عہد سے اس میں کیوں تبدیلی ہوئی اور کن موثرات کے زیراثر عالمگیر تک پہنچ کر اس نے شدت کی شکل اختیار کی۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ مورخین نے بالکلیہ ان اجزا سے بحث نہیں کی ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان میں بعض جز تو ایسے ہیں مثلاً آخری سوال اس کو تو آج تک کسی کتاب میں اُٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ اسی طرح ''خلق در اسائش بود'' کو بھی مجمل ہی رکھا گیا۔ کسی نے نہیں بتایا کہ اس سے مراد خدا کی کون سی مخلوق ہے؟ البتہ الٰہی مذہب کا تھوڑا بہت ذکر ان کتابوں میں ضرور کیا جاتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ جس رنگ میں کیا جاتا ہے اس سے بجائے علم کے شاید جہالت ہی میں زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ آخر دین اکبری کے متعلق جو مشہور کیا گیا ہے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک صلح کن مسلک تھا اس میں تمام ادیان و مذاہب کو ایک نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کسی مذہب والے کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں دی جاتی تھی لیکن کیا یہ واقعہ ہے؟ جب

واقعہ کا ذکر کیا جائے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ واقعہ کیا تھا؟ اور اس کو
کس رنگ میں پیش کیا گیا۔ اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ ''الف ثانی''
کے کلمہ (لفظ) کی حقیقت بھی معلوم ہوگی۔''

پھر دین الٰہی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عہد کمپنی سے پیشتر کی کتابوں میں بھی اگر ڈھونڈا جائے تو اس
مسلک کے مختلف عناصر اور اجزا کا سراغ مل سکتا ہے لیکن بنظر احتیاط
میں نے صرف یہ ارادہ کیا ہے کہ اکبری دربار کے سب سے زیادہ ثقہ
راوی ملا عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب منتخب التواریخ پر ہی کفایت
کروں کیونکہ یہی ایک ایسا بیان ہمارے سامنے ہے جو حلفی شہادت
کے بعد ادا کیا گیا ہے... کلی طور پر ان کے جزئی بیانات کی تصدیق
میں خود حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شہادت بھی ان شاء اللہ تعالیٰ پیش
کی جائے گی۔ کیا اس کے بعد بھی شک کے لیے کوئی راہ ہو سکتی
ہے؟''

اب مولانا گیلانیؒ واقعات کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے وہ محضر نامہ
پیش کرتے ہیں جس میں بادشاہ کو مجتہد قرار دیا گیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

''یہ تھی وہ پہلی منزل جہاں تقلید سے کنارہ کش ہو کر اکبر کو اجتہاد کے درجے پر
پہنچایا گیا۔ لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ وہی جو ہمیشہ اس کے بعد ہوا ہے۔ تھوڑے دنوں
کے بعد اعلانیہ، ائمہ و مجتہدین کی توہین و تحقیر ہونے لگی۔ دین کا بھرم اُٹھ گیا۔ ملا صاحب
اپنے کانوں سنی بیان فرماتے ہیں کہ ابوالفضل کی جرأت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ:

''اگر کسی بحث مباحثہ کے درمیان ائمہ و مجتہدین کی بات پیش کی جاتی
تو ابوالفضل اس کے جواب میں کہتا فلاں حلوائی اور فلاح کفش دوز

اور فلاں چمڑے والے کے قول سے تم مجھ پر حجت قائم کرتے ہو۔"

ملا صاحب کے بیانات سے یہ دکھا کر کہ اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی توہین تک نوبت پہنچی اور آخرکار براہ راست اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں ہونے لگیں۔ لکھتے ہیں:

"آج یورپ کے کمان سے جن تیروں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اب برس رہے ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ آج سے تین سو برس پیشتر بھی ہو چکا تھا۔ آخری کیفیت اکبر کے نفس کی یہ ہوئی کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ملا صاحب کا بیان ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ. ابتدا میں بات کتنی ہوتی ہے اور آخر کہاں تک جا کر ختم ہوتی ہے۔ (کہ): "احمد، محمد، مصطفیٰ وغیرہ نام....." کی خاطر اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے اس شخص (اکبر) پر گراں گزرنے لگے آخر کچھ دن کے بعد اپنے چند خاص لوگوں کے نام اس نے بدل بھی ڈالے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے کہ اکبری عہد کے مصنفین خطبۂ کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت لکھنے سے گریز کرنے لگے.... یہاں تک کہ خود ملا صاحب کو جب مہابھارت کے ترجمہ کے شروع میں خطبہ لکھنے کی فرمائش بادشاہ نے کی تو محض اس وجہ سے انھوں نے اعراض کیا کہ بغیر نعت وہ خطبہ لکھنا نہیں چاہتے تھے۔"

بدایونی کی زبانی عیسائی مشنری وفد کی آمد کا ذکر کر کے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ان کی گستاخی و یاوہ گوئی کا تذکرہ کر کے مولانا گیلانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ اکبر اتنی بدبختانہ بیہودگی کو سن کر بھی اکبر کی پیشانی پر بل تو کیا

پڑتا نہایت خندہ جبینی سے ان کا استقبال کرتا ہے اور خاص اپنے شہزادے مراد کو حکم دیتا ہے۔(کہ) چند اسباق ان پادریوں سے پڑھ لو۔ عقائد میں جس کا حال یہ ہو چکا ہو اس کے اعمال کے متعلق سوال ہی فضول ہے...دیوان خانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اعلانیہ نماز ادا کر سکے...دینی شعار کی ہجو میں اشعار بنائے گئے اور کوچہ و بازار میں وہی گائے جاتے تھے۔''

اس کے بعد دکھایا ہے کہ اس تخریب کے بعد ہزارۂ دوم کے نظریے اور دین الٰہی کی تعمیر کس طرح ہوئی؟ بادشاہ نے یہ خیال پکا لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدت کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہوگئی۔ سکّوں تک میں الف (ہزار) کی تاریخ لکھوائی اور بقول ملا صاحب اشارہ اس طرف تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین مبین کی عمر جو ہزار سال تھی وہ پوری ہوگئی۔ مولانا گیلانیؒ ان سب باتوں کو لکھ کر فرماتے ہیں:

''بہر حال آخر یہ طے کر لیا گیا کہ جدید ملت کی بنیاد رکھ دی جائے''

کچھ دور چل کر فرماتے ہیں:

''القصہ اس سلسلے میں دوسروں کے بیان سے نہیں بلکہ خود ملا صاحب کی ہی دوسری عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الف ثانی، تحریف اسلام، مساوات ادیان، ان تینوں نظریات کو طے کرنے کے بعد نماز روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا نبوت سے تعلق ہے ان کا نام تقلیدات رکھا گیا یعنی سب بدعقلی کی باتیں ٹھہرائی گئیں اور مذہب کی بنیاد عقل پر رکھی گئی نہ نقل پر۔''

اس زمانہ میں بقول مولانا گیلانیؒ یہ ہو رہا تھا کہ:

''مختلف مذاہب کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے دھمکنے لگیں، ہر ایک

اپنے اپنے مذہب کو دربار میں پیش کرتا تھا۔ ملک فرنگ کے پادری آئے انھوں نے انجیل پیش کی اور ثالث ثلثہ کے متعلق دلائل پیش کیے اور نصرانیت کو حق ثابت کیا۔ ابوالفضل کو حکم دیا گیا کہ انجیل کا ترجمہ ان پادریوں سے پوچھ پوچھ کر کریں۔ گجرات کے شہر 'نوساری' سے آتش پرست بھی آئے انھوں نے ''زردشت'' کی حقیت ثابت کی۔ یہ لوگ آگ کی بڑی تعظیم کرتے ہیں ان لوگوں نے بادشاہ کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی اور کیانی بادشاہوں کے رسم و رواج سے واقف کیا۔ ان کے متعلق بھی ابوالفضل ہی کو حکم دیا گیا کہ ہمیشہ رات دن شاہی محل میں آگ روشن رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ ''

''....ابتدأ سب سے پوچھا جاتا تھا اور ہر مذہب والے کی رائے دریافت کی جاتی تھی جیسا کہ ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ساری تعمیر جو ہو رہی تھی ظاہر ہے کہ ایک مستقل مذہبی نظام کی تخریب و تکذیب کے بعد ہو رہی تھی۔ ممکن ہے کہ ابتدأ اس عمارت منہدمہ کی چیزوں سے بھی اس جدید عمارت کی تیاری میں کام لیا جاتا ہو لیکن حالات نے بتدریج کروٹ لینا شروع کیا اور نوبت آخر میں یہاں تک پہنچی کہ:

''اسلام کی ضد اور توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا اس کو بادشاہ نص قاطع اور قطعی دلیل خیال کرتے تھے۔ بخلاف اسلامی ملت کہ اس کی ساری باتیں مہمل اور نا معقول، نو پیدا عرب کے مفلسوں کی گھڑی ہوئی چیزیں خیال کی جاتیں۔''

اس لیے اب سلسلۂ تحقیقات میں اسلام کا نام تختے سے کاٹ دیا گیا

اور آخری طریقۂ کار یہ رہ گیا کہ مسلمانوں کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آجاتی تھی اس کا انتخاب کرلیا جاتا تھا۔اس معاملہ میں اکبر کی رفتار جس نقطے پر پہنچ کر رہی ملا صاحب ہی اس کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں: پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا اور بات بالکل اُلٹ گئی۔اور یوں مساوات مذاہب، ترجیح بلا مرجح[۱] رواداری وانصاف کا سارا دعویٰ انتہائی تعصب کی شکل میں بدل گیا اور جب کبھی جس ملک اور قوم میں اس قسم کے دعاوی کا اعلان کیا گیا ہے اس کا آخری انجام یہی ہوا ہے....ہمیشہ ارتداد و الحاد کی بنیاد رواداری کے نرم و دلکش دعوے پر قائم کی جاتی ہے لیکن اس مسلک کے سلوک کی آخری منزل وہی ہے جہاں بالآخر اکبر پہنچ گیا تھا....اور وہی کمیٹی وانجمن جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ کے عہد تجدید کا نتیجہ ہے لیکن ملا صاحب فرماتے ہیں کہ اکبر مذہب کو بھی ریزولیوشن کے ''خراد پر چڑھا کر رہا'' چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی....چہل تن کی اس مجلس میں مسائل پیش ہوتے تھے اور پھر عقل سے اس کا فیصلہ کیا جاتا تھا البتہ اس کمیٹی کی یہ ایک خصوصیت بھی تھی کہ اسلامی عقائد واعمال کے متعلق طرح طرح کے شبہے ہنسی مذاق کی شکل میں کیے جاتے اور اگر کوئی بیچارہ جواب دینے کا ارادہ کرتا تو جواب سے روک دیا جاتا۔آزاد کمیٹیوں کا یہ عارضہ گویا نیا عارضہ نہیں ہے سب کچھ بول سکتے ہو اور کچھ نہیں بول سکتے، اس تناقض کا کتنا اچھا ثبوت آج بھی قومی اور حکومتی مجلسوں میں ملتا رہتا

---

۱ مولاناؒ کے مقالہ میں یہ لفظ اسی طرح ہے مگر سیاق وسباق سے گمان ہوتا ہے کہ زلّت قلم ہے شاید بالمرجح لکھنا چاہتے ہوں۔ع،س

ہے۔ یہ تھی اکبر دی گریٹ کی مسلمہ رواداری اور بے چارے اکبر کو کیا کہا جائے آج بھی مسلک "صلح کل" رواداری کے مدعیوں کا جو تجربہ ہو رہا ہے کیا اس سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن سب کچھ سننے اور دیکھنے کے بعد جو سننا نہ چاہتے ہوں اور دیکھنے سے آنکھیں میچتے ہوں ان سے کیا کہیے۔"

اس کے بعد دین الٰہی کے عناصر کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ باتوں کو حوالوں کے ساتھ بالتفصیل پیش کیا:

(۱)　اکبر آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت یعنی صبح و شام، دوپہر، آدھی رات میں لازمی طور پر کرتا تھا۔

(۲)　اسی طرح آگ، پانی، درخت اور تمام مظاہر فطرت حتیٰ کہ گائے اور گائے کے گوبر تک کو پوجتا تھا اور قشقہ، جنیو سے اپنے بدن کو آراستہ کرتا تھا۔

(۳)　کواکب پرستی میں غلو ہو گیا تھا۔

(۴)　تناسخ کا قائل ہو گیا تھا۔

(۵)　سوال منکر نکیر، حشر و نشر، حساب و میزان کا قائل نہ تھا۔

(۶)　کلمہ میں لا الہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ پڑھا جاتا تھا۔

(۷)　اس دین میں داخل ہونے کے لیے اس کلمہ کے ساتھ ساتھ ایک تحریری معاہدہ بھی ہوتا تھا جس کی رو سے اسلام سے علیحدگی اختیار کر لی جاتی تھی۔

(۸)　اللہ اکبر خطوط کے سرناموں پر ہوتا تھا۔

(۹)　بجائے سلام کے مریدوں میں سے ایک اللہ اکبر کہتا، دوسرا جل جلالہ۔

(۱۰)　جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو چیلہ کہا جاتا تھا۔

(۱۱)　بارہ بارہ آدمیوں کی ٹولی نوبت بہ نوبت بادشاہ سے مرید ہوا کرتی تھی۔

(۱۲) ان کو بجائے شجرے کے بادشاہ کی تصویر دی جاتی تھی جو مرصع جواہر نگار غلاف میں رکھ کر یہ لوگ اپنی دستاروں پر لگاتے تھے۔

(۱۳) علاوہ ان معبودوں کے جن کو پیر پوجتا تھا مریدوں کے لیے خود بادشاہ کی عبادت بھی دین کے اہم ارکان میں شمار کی جاتی تھی۔

(۱۴) سود، جوئے اور شراب کو حلال قرار دیا گیا۔

(۱۵) داڑھی کے منڈانے کا رواج ہوا۔

(۱۶) غسل جنابت کو منسوخ کر دیا گیا۔

(۱۷) چچا اور خالہ کی لڑکی سے نکاح ناجائز قرار پایا۔

(۱۸) سولہ سال سے کم لڑکے کا اور چودہ سال سے کم لڑکی کا نکاح نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۱۹) ایک سے زائد نکاح نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۲۰) پردہ اُٹھا دیا گیا تھا۔

(۲۱) بغیر نکاح کے حق مجامعت دے دیا گیا تھا۔

(۲۲) بارہ سال سے پیشتر ختنہ کرانا منع تھا۔

(۲۳) میت کو پانی میں ڈالا جائے یا جلا دیا جائے یا کسی درخت سے باندھ دیا جائے اگر دفن کیا جائے تو سر مشرق کی جانب اور پاؤں مغرب کی جانب ہوں۔

(۲۴) ریشم، سونا مردوں کے لیے حلال قرار دیا گیا۔

(۲۵) گائے کا گوشت حرام لیکن شیر اور بھیڑیے کا گوشت حلال تھا۔

(۲۶) عربی پڑھنا، عربی جاننا عیب قرار دیا گیا اور فقہ، تفسیر اور حدیث کے پڑھنے والے مطعون ہوئے۔

(۲۷) ان علوم کی جگہ نجوم، حکمت، طب، حساب، شعر، تاریخ اور افسانہ رائج کیے گئے۔

(۲۸) ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً ث، ح، ع وغیرہ ان کو

بادشاہ نے بول چال سے باہر کر دیا اور اس پر عمل کی یہ صورت نکالی کہ اگر کوئی مثلاً عبداللہ کو ابداللہ بولتا تو بادشاہ خوش ہوتا۔

یہ اور ان کے علاوہ بھی دشمنیٔ دین اسلام کے تمام پہلو دکھا کر اور ان پر مفصل گفتگو کرنے کے بعد مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں اور کتنے پتے کی بات لکھتے ہیں:

''بہر حال بات بہت طویل ہوگئی اور حرف مدعا سے پھر بھی میں اب تک دور ہوں لیکن کیا کیا جائے روشنی کو وہی پہچان سکتا ہے جس نے اندھیرے کو دیکھا ہو...... آج جس خطرے سے ایمانیوں کے دل تھرّا رہے ہیں ان کو دیکھنا چاہیے کہ کل کا خطرہ کیا اس سے کم تھا؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت جو کچھ ہوسکتا تھا اب تو عقلی راہوں سے بھی اس کا ہونا بہت بعید ہے یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کا درِ تابندہ پروردۂ آغوشِ موج ہے، نہ طوفانوں سے کبھی وہ گھبرایا اور نہ سیلاب اس کی رفتار کو دھیما کر سکے۔ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ۔''

اس کے بعد مولانا گیلانیؒ نے تصویر کا دوسرا رُخ بھی دکھانا ضروری سمجھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے علماء سوء نے بھی اقتدار کی ہوس میں باہمی مخالفت وعناد کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے بادشاہ کو اسلام سے تنفر پیدا ہوگیا۔ اس کی تفصیل لکھتے لکھتے مولانا گیلانیؒ چیخ اُٹھتے ہیں اور آہ سرد بھر کر یوں لکھتے ہیں:

''کیسا دردناک نظارہ ہے کہ خود دین کے معماروں کے ہاتھوں دین کی بنیاد کھدر رہی تھی اور کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا، علماء ومشائخ کی عام حالت تو یہی تھی لیکن اللہ کے بندوں سے زمانہ کا کوئی حصہ خالی نہیں ہوتا ہے۔ اُسی ہنگامہ میں کبھی

کبھی ایسے نفوس بھی نظر آجاتے ہیں جن کے سامنے دنیا سے زیادہ آخرت اور نقد سے زیادہ نسیہ عزیز ہوتا ہے۔ حضرت سلیم چشتیؒ کے صاحبزادے مولانا بدرالدینؒ کا کارنامہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز ہے.... درباری امراء میں ایک صاحب قطب الدین خاں تھے اکبر دین جدید کی ان کو بھی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ خاں صاحب نے ایک دن فرمایا دوسرے ممالک کے سلاطین مثلاً روم کے اخوند کار (سلطان ترکی) وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ اکبر اس فقرے پر بگڑ گیا.... اور خوب خوب برسا.... لیکن بدتمیزی کے اس طوفان کا مقابلہ بھلا ان تنکوں سے کیا ہوسکتا تھا؟ قدرت ہمیشہ ایسے موقع پر ایسی عظیم ہستی کو برسرکار لاتی ہے جو وہبی کمالات اور قوتوں سے سرفراز ہوتا ہے اور دراصل یہ ساری تمہید اسی بزرگ ہستی اور اس کے محیر العقول کارنامے، آہنی عزائم وارادے کی تفصیل ہی کے لیے تھی۔ لیکن تمہید بھی اتنی طویل ہو چکی ہے کہ اب اس کے لیے کسی دوسرے مستقل باب یا مقالہ کی ضرورت ہے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا واقعات ہائلہ دیکھنے کے بعد اب اندازہ ہوسکتا ہے کہ مغلی تخت پر اکبر کے نام سے جو بادشاہ پچاس سال بیٹھا رہا وہ کیا تھا؟ اور پھر اچانک عہد جہانگیری میں دریا کا رُخ بدلتا ہے تا آنکہ شاہجہاں کے عہد تک پورا بدل جاتا ہے اور عالمگیری دور میں تو وہ اسی سمت عزّاٹے بھرنے لگتا ہے۔ صرف اتنی سی بات حضرت مجددؒ کے پہچاننے کے لیے اس وقت کافی ہوسکتی ہے۔ جب یہ بتا دیا جائے کہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ نے اس کا ذریعہ حضرت مجددؒ کی ہستی گرامی کو

بنایا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ واقعہ کے اس رُخ کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھوں۔ میں جانتا تھا کہ اکبری فتنہ سے، جس کا دوسرا نام ''الف ثانی'' کا فتنہ ہے عوام تو عوام خواص بھی بجز چند مشہور باتوں کے واقف نہیں ہیں یا ان کو ناواقف رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضرورت تھی کہ اس پہلو کو خوب اچھی طرح واضح کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے اس پر ایک سیر حاصل بحث کرنے کا مجھے موقع مل گیا۔ اگرچہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو واقع ہوا تھا اور جس کا مواد تاریخ کے منتشر اوراق میں بکھرا ہوا ہے.....

اکبر کی تخت نشینی کے آٹھویں سال ۹۷۱ھ میں حضرت مجددؒ کی ولادت باسعادت بمقام ''سرہند'' ہوئی۔ کم وبیش چالیس سال کا زمانہ آپ نے دورِ اکبری میں گزارا۔ حضرتؒ کی عمر کا یہ حصہ زیادہ تر علوم ظاہری وباطنی اور کمالاتِ باطنی کے حصول میں صرف ہوا۔ جوانی کے ایام میں آپ اکبرآباد (آگرہ) بھی تشریف لائے تھے جہاں دربار کے ان دونوں عالموں ابوالفضل وفیضی سے آپ کی خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس ارادہ کا ظہور بعد کو ہوا اس کا تخم ان ہی ملاقاتوں کے سلسلے میں پیدا ہوا۔ ابوالفضل وفیضی آپ کی غیر معمولی قابلیت ذہن وذکاوت سے بہت متاثر تھے۔ حج کے ارادے سے آپ ایک دفعہ (سرہند سے) دہلی آئے۔ یہاں حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ بعض غیبی اشاروں کے ماتحت ''ماوراالنہر'' سے دہلی پہنچ کر ''کسی'' کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

دونوں میں ملاقات ہوئی پھر کیا طے ہوا خدا ہی جانتا ہے۔اس کے بعد دیکھا گیا کہ حضرت مجددؒ.....سرہند کی طرف لوٹ گئے اور وہیں اپنے مرشد کی زیر نگرانی سلوک کے مقامات طے کرتے رہے۔ ابوالفضل و فیضی کی صحبت آگرہ میں آپ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ان لوگوں سے آپ کو فتنہ کے اسباب اور ان کے موثرات کے سمجھنے کا موقع ملا جس نے بادشاہ اور اس کی حکومت کو اس نقطے تک پہنچادیا تھا.....

خلاصہ یہ کہ اکبر کا زمانہ حضرت مجددؒ کے لیے تیاری کا زمانہ تھا۔اِدھر اس کا انتقال ہوا اور جہانگیر تخت پر بیٹھا کہ آپ میدان میں اُتر پڑے..مکاتیب اُٹھا کر دیکھو جہانگیر کے دربار کا شاید ہی کوئی ممتاز رُکن ہوگا جس کے نام آپ کے خطوط نہیں۔خانِ اعظم خان جہاں، خان خاناں، میرزا داراب، قلیج خاں، خواجہ جہاں اور سب سے زیادہ نواب سید فرید[1] صاحب وغیرہم کے نام خطوط ہیں ان تمام خطوں کا قدر مشترک صرف ایک مقصد ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس نقصان کی تلافی ہونی چاہیے جو اسلام کو اکبری عہد میں پہنچ گیا ہے.....

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت مجددؒ نے دربار کے ان امرا پر آخر

---

1. یہ حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں کی اولاد میں سے تھے۔عہد اکبری میں ڈیڑھ ہزاری اور عہد جہانگیری میں چھ ہزاری منصب دار ہوئے۔مرتضیٰ خاں ان کا خطاب تھا۔کتب تاریخ وتذکرہ میں ''شیخ فرید'' اور ''شیخ فرید دہلوی'' اور ''فرید بخاری دہلوی'' تینوں طرح سے مشہور ہیں۔اکبرنامہ جلد ۳ ص ۷۱۴ میں شیخ فرید بخشی بیگی یہی ہیں۔شیخ فرید دہلویؒ کا تعلق حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ سے حضرت مجددؒ سے بھی پہلے لاہور میں ہو گیا تھا۔ ''جامع السلاسل'' (قلمی) سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کا ظاہری تکفل انہی شیخ فریدؒ نے کیا تھا۔گویا کہ حضرت خواجہؒ کے زمانہ قیام لاہور میں ان کے میزبان تھے اور ان کے اخراجات کی کفالت اپنے لیے سعادت دارین سمجھتے تھے۔اتنا بڑا شرف تھا جو اس سید الاصل بزرگ زادہ رئیس کو حاصل ہوا تھا۔(فریدی)

کس طرح قابو حاصل کیا حالانکہ کوئی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا یہ جتنے تھے اکبر ہی کی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ ابوالفضل وفیضی کے فیض یافتہ تھے۔ ان اسباب کا احاطہ اور استقصا اور وہ بھی اس مقالے میں مشکل ہے لیکن سرسری طور پر اس عہد کے علما اتنا تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مجددؒ نے اپنے لکھنے لکھانے میں کیا وہ رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو اُس عہد کے بڑے بڑے انشا پردازوں کا تھا؟ ایک طرف ابوالفضل کی سحر نگاری کو رکھیے اور دوسری طرف حضرت مجددؒ کے زور قلم کو دیکھیے پھر اندازہ کیجیے کہ انشا کا زور کس میں ہے؟ اسی کے ساتھ آپ نے دینی حقائق کی تعبیر میں بھی اپنے زمانہ کا ساتھ دیا۔ کہتے وہی تھے جو تیرہ سو سال پیشتر سے کہا جاتا تھا لیکن کہنے کا ڈھب وہ اختیار کیا کہ سننے والے کو محسوس ہوتا تھا کہ شاید کوئی نئی باتیں سن رہا ہے........جن منشیانہ اور فلسفیانہ تعبیروں سے الحاد پیدا کیا گیا تھا شیخ فاروقیؒ کے خطوط میں دیکھو ٹھیک انہی تعبیروں سے وہ براہ راست قرآنی تعلیمات اور پیغمبرانہ سُنن کی عظمت قلوب میں اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ کیا اس زمانہ کے علما کے لیے اس میں کوئی عبرت ہے؟

....علما صرف ان لوگوں پر قناعت کیے ہوئے ہیں جو ابھی حکومت سے دور ہیں یا دوسرے لفظوں میں جن پر جدید تعلیم کا اثر نہیں پڑا ہے لیکن ''بکری کی ماں'' کب تک خیر منائے گی خصوصاً لازمی تعلیم کے بعد کیا آپ امید کرتے ہیں کہ آپ کی قوم میں پھر کوئی ایسی جماعت بھی رہ جائے گی جس کو موجودہ تعلیم کی ہوا نہ لگی ہو۔ اگرچہ قیمتی اوقات کا

بہت بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کامل مایوسی کی حد تک بات نہیں پہنچی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ چیزیں بھی اسی وقت کارگر ہو سکتی ہیں جب ان سے بھی پہلے کام کرنے والا اپنے اندر اس یقین کو پیدا کر چکا ہو جو بے چین کر کے اس کو کام کرنے کے لیے مضطرب اور بے کل کر دے، وہ کام کو نہ اُٹھائے بلکہ کام ہی اُس کو اُٹھائے، ورنہ مذبذب ٹھنڈے دلوں سے آپ اس گرمی کو کہاں سے پیدا کر سکتے ہیں جس کے شعلے حضرت مجددؒ کے لفظ لفظ سے پھوٹے پڑتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی علماء کے چند افراد میں یقین کا ذخیرہ باقی ہے وہ اس کو دوسرون تک منتقل کر سکتے ہیں لیکن صرف اس کی ضرورت ہے کہ جن کو یہ یقین سپرد کیا جائے ان کو عصری اسلحہ اور آلات سے بھی تھوڑا بہت مسلح ہو جانے کا سامان کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اُسی ''گرد'' سے کوئی سوار آج نہیں تو کل نکل پڑے۔''

اس کے بعد مقالہ کو اختتام کی طرف مائل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''درباری امراء کو قابو میں لانے کے بعد حضرت مجددؒ کو ابتداء میں بعض دشواریاں بھی اُٹھانی پڑیں....آپ پر بعضوں نے کفر کا اور بعضوں نے فسق کا فتویٰ صادر کیا۔ بادشاہ کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کی گئی....آپ کو ''گوالیار'' کے قلعہ میں بند کیا گیا۔ زنداں کہ یہ دن حضرت مجددؒ کے بڑے پُرلطف گزرے۔ مکتوبات میں اس کی طرف مختلف مقامات میں اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ **کما لا یخفی علی من طالعھا** ۔ لیکن ''اُفق'' کا آفتاب کب تک چھپا رہتا صبح ہوئی اور اس کا دمکتا ہوا ''چہرہ'' لوگوں کے سامنے تھا۔''

اس کے بعد وہ مکتوب مجددؒ مع ترجمہ درج کیا ہے جو زنداں سے رہائی کے بعد خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصومؒ (صاحبزادگان) کے نام ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دربار میں آپ کا بڑا اعجاز و اکرام ہونے لگا۔ فتنۂ اکبری کے ردِعمل کے لیے آپ جن مضامین پر دربارِ جہانگیری میں گفتگو فرماتے تھے ان کی اجمالی فہرست بھی اس میں (آگئی ہے) یہ مکتوب جلد سوم کا مکتوب ۱۳ ہے۔

آخر کار ان الفاظ پر اپنے دلچسپ اور مفید اور پُر از معلومات محققانہ مقالہ کو ختم کر دیتے ہیں۔

> ''بہر حال حضرت مجددؒ کے ساتھ اس کے بعد جہانگیر کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ برابر اپنے ساتھ آپ کو شاہی کیمپ میں رکھتا تھا اور آخر میں اپنے ولی عہد شہزادہ خرم (شاہجہاں) کو آپ کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کا حکم دیا اور یوں ''مغل امپائر'' کو خدا کے ایک فقیر نے بے داموں خرید لیا۔ چاہتا تو اس سے وہ اپنی بادشاہی کا کام لے سکتا تھا لیکن وہ اس کے بعد بھی فقیر ہی رہا بلکہ سچ یہ ہے کہ کتنے بادشاہوں کو بادشاہی کے ساتھ بھی فقیر ہی بنائے رکھا۔''

مقالہ (۲)

تذکرۂ خلفائے مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ[1]

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار آنند ☆ کہ برنداز رہ پنہاں بحرم قافلہ را
ہمہ شیران جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند ☆ روبہ از حیلہ چسان بگسلد این سلسلہ را

مولانا جامی

ادارۂ ''الفرقان'' نے جس وقت ''مجدّد الف ثانیؒ نمبر'' نکالنے کی تجویز طے کی اور یہ ارادہ عزم کے درجے میں آیا، اس وقت حسن اتفاق سے[2] میں بریلی آچکا تھا اور اس نمبر کی تیاری تک میرا قیام دفتر ''الفرقان'' ہی میں رہا۔ مدیر ''الفرقان''[3] مدظلہ عالی نے مجھ کو بھی اس ''بزم مسعود'' میں شرکت کی دعوت دی۔ اہل اللہ اور خاص کر حضرت امام ربانی عارف باللہؒ کا تذکرہ یقیناً بڑی سعادت ہے، میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بسلسلہ تعمیل حکم غور کرنے لگا کہ حضرت ممدوح کے کس شعبۂ حیات پر لکھوں، دل میں یہ آیا کہ براہ راست حضرت مجددؒ کے متعلق تو دیگر حضرات اہل قلم روشنی ڈالیں گے ہی، میں آپ کے خلفائے باصفا کا کچھ تذکرہ سپرد قلم کروں کہ بالواسطہ وہ بھی حضرتؒ ہی کا تذکرہ ہے۔

جس طرح پھل سے درخت پہچانا جاتا ہے اسی طرح شاگرد سے اُستاذ اور مرید سے شیخ کے حالات وکمالات کا صحیح صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔ بالفاظ دیگر شاگرد و مرید اپنے استاد و پیر کے آئینے ہوتے ہیں جن میں ان کے خدوخال صاف صاف نظر آجاتے ہیں۔

---

[1] یہ مقالہ ماہنامہ الفرقان کے مجدّد الف ثانیؒ نمبر سے لیا گیا ہے۔ یہ ماہنامہ اس وقت بریلی سے نکلتا تھا۔
[2] مولانا فریدیؒ کا فراغت کے بعد دیوبند میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ اسی درمیان مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا خط آپ کو ملا جس میں مدرسہ اشفاقیہ بریلی کی تدریس کے لیے آپ کو بلایا گیا تھا۔ [3] مدیر الفرقان سے مراد مولانا محمد منظور نعمانیؒ ہیں۔ (محب الحق)

اسی اصول پر قرآن مجید میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وصداقت کے ثبوت میں آپ کے تلامذہ ومسترشدین یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے احوال واعمال کو بھی بطور شاہد کے پیش کیا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَّبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَاناً سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ (الآیۃ)

بہر حال دل نے یہی فیصلہ کیا کہ حضرت شیخ سرہندیؒ کے خلفاء کے متعلق کچھ لکھوں تاکہ تعلیم وتربیت اور قوت تاثیر کی راہ سے بھی حضرت شیخ مجددؒ کے کمال کا کچھ اندازہ ہو سکے اور یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جس انسان کے ذریعہ اتنے نفوس کے اندر ایمان وعمل کی اتنی جگمگاہٹ اور نور عرفان کی ایسی چمک پیدا ہوگئی وہ خود کس قدر پُر نور وباکمال ہوگا۔

چونکہ مجھے صرف ایک ''مجلاتی'' مضمون لکھنا تھا اور صفحات محدود دیے گئے تھے اور پھر حضرت کے تمام خلفاء مشہورین کے متعلق کچھ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ اس لیے اختصار میرے لیے ناگزیر تھا ورنہ خلفاء مجددیہ میں سے ہر ایک کے متعلق ایک مستقل کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

میرے مضمون کا زیادہ حصہ ''زبدۃ المقامات'' سے ماخوذ ہے کہیں کہیں دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور وہاں حوالہ دے دیا گیا ہے۔

خواجہ محمد صادقؒ: آپ حضرت امام ربانیؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں ۱۰۰۰ھ میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی، بچپن ہی سے آپ کی پیشانی سے صدق وصفا کے آثار نمایاں تھے۔

بالائے سرش ز ہوش مندی ☆ می تافت ستارۂ بلندی

آپ کے جدّ امجد حضرت شیخ عبدالاحدؒ نے آپ کو اپنی تعلیم وتربیت میں رکھا۔

حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد (شیخ عبدالاحدؒ) فرمایا کرتے تھے: کہ تمہارا یہ لڑکا مجھ سے حقائق و معارف کی ایسی ایسی عجیب باتیں دریافت کرتا ہے کہ ان کا جواب مشکل سے بن پڑتا ہے۔ جب حضرت مجددؒ ۱۰۰۸ھ میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کی خدمت میں پہنچے تو یہ صاحبزادے بھی ہمراہ تھے اور یہ بھی حضرت خواجہؒ کی نظر قبولیت میں آکر ذکر، مراقبہ اور جذبہ و نسبت سے مشرف ہوگئے۔ آپ کو باوجود صغر سنی کے وہ کمالات نصیب ہوئے کہ حضرت خواجہؒ آپ کو دیرینہ سال سالکوں کے مقابلے میں پیش فرماتے تھے اور اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہفت سالہ بچہ جس نے تھوڑے ہی عرصے سے راہ سلوک میں قدم رکھا ہے، بہت آگے نکل چکا ہے۔ اتنی سی عمر میں استغراق کا حد درجہ غلبہ تھا حتی کہ حضرت خواجہؒ نے تخفیف کی غرض سے آپ کو بازار کا کھانا کھلایا تا کہ اس کے اثر سے یہ زیادتی رفع ہو چنانچہ حضرت مجدد صاحبؒ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''(خواجہ محمد صادقؒ) آٹھ سال کی عمر میں اس قدر مغلوب حال ہوگئے تھے کہ ہمارے حضرت خواجہ صاحبؒ یہ کیفیت زائل کرنے کے لیے بازار کا کھانا جو کہ مشکوک و مشتبہ ہوتا ہے دیا کرتے تھے۔''

حضرت خواجہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے: ''کہ جس قدر مجھ کو محمد صادق سے محبت ہے اور کسی سے نہیں اور انھیں بھی جتنی مجھ سے محبت ہے کسی سے نہیں۔''

اسی عمر میں کشف قبور کا یہ عالم تھا کہ حضرت خواجہ صاحبؒ ان کے کشف پر اعتماد فرماتے تھے اور ان کو مقبروں میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ نے جس جماعت کو تربیت باطنی کے لیے حضرت مجددؒ کے سپرد فرمایا تھا اس میں یہ مخدوم زادہ بھی تھے اور تمام جماعت میں بہتر تھے۔ بعدہٗ اپنے والد ماجد کے فیض تربیت سے مرتبۂ کمال و اکمال کو پہنچے اور ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ'' کے پورے پورے مصداق ثابت ہوئے۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز یہ چیز ہے کہ صغر سنی سے ہی اس

غلبہ کے باوجود دینی تعلیم سے بھی فراغت حاصل کی اور علوم نقلیہ وعقلیہ میں ماہر ہوئے۔ بعد حصولِ علم تعلیم وتدریس میں بھی مشغول رہے۔

افسوس کہ عمر بہت کم پائی ۲۴ رسال کی عمر میں عالم فانی سے رحلت فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مجددؒ ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:

''فرزند مرحوم (خواجہ محمد صادق) اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور رحمت تھے ۲۴ رسال کی عمر میں وہ کچھ پایا کہ بہت کم لوگوں نے پایا ہوگا۔ علوم نقلیہ وعقلیہ کے درس وتدریس کو بحد کمال پہنچا دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے شاگرد بیضاوی وشرح مواقف اور اسی قسم کی انتہائی انتہائی کتابیں پڑھاتے ہیں۔''

عقلی ونقلی مسائل علمیہ میں آپ کی ''قوۃ مدرکہ'' کا یہ حال تھا کہ ''شیراز'' کے ایک زبردست معقولی فاضل سے اپنے ذہن خداداد کا لوہا منوالیا تھا، فنا کے آثار اور عیش دنیا سے عدم تعلق کا اظہار آپ کے چہرے سے ہوتا تھا بلکہ اس کیفیت کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا تھا۔ چنانچہ بعض رو۔ آپ کی مجلس میں پہنچنے کے بعد کہا کرتے تھے کہ جیسے ہی ہم اس جوان کو دیکھتے ہیں ہمارا دل دنیا سے سرد ہو جاتا ہے۔ ایک درویش کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن اپنے ایک ہمسایہ کے متعلق صاحبزادہ مذکور کے سامنے زبان شکایت کھولی اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو تنبیہ فرمادیں تو اچھا ہو۔ مخدوم زادہ نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا کہ اے شخص! اگر ہم بھی دشمنی کا راستہ اختیار کریں تو ہم میں اور اہل رسم میں کیا فرق رہے گا۔ ان درویش کا بیان ہے کہ یہ بات زبان مبارک سے کچھ اس تاثیر کے ساتھ ادا فرمائی کہ میں اس گزارش وشکایت پر پشیمان ونادم ہوا اور ہمسایوں کی طرف سے دل میں جو کینہ تھا وہ جاتا رہا۔

حضرت مجددؒ نے بھی مکتوبات شریفہ میں آپ کی مدح میں بہت سے کلمات تحریر فرمائے ہیں۔ ایک جگہ اپنے ''معارف کا مجموعہ'' تحریر فرمایا ہے، ایک مقام پر

''نسخۂ مقامات جذبہ وسلوک'' قرار دیا ہے۔ مکتوب ۳۱۱ دفتر اول میں آپ کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''اس فقیر (خود حضرت مجددؒ) نے ولایت موسوی سے جو کچھ استفادہ کیا ہے وہ اجمالی ہے اور میرے بڑے لڑکے (خواجہ محمد صادقؒ) کا استفادہ تفصیلی ہے۔ یوں سمجھو کہ فقیر ولایت موسوی سے مومن آل فرعون (جس کا قرآن شریف میں ذکر ہے) کی طرح مستفید ہے اور فرزند علیہ الرحمہ ولایت موسوی سے ساحرین فرعون کی مانند مستفید ہے جو ایمان لے آئے تھے'' (اور جن کا مشاہدہ مومن آل فرعون کے مقابلہ میں تفصیلی تھا)

حضرت مخدوم زادہ کا وصال سرہند شریف ہی میں بعارضۂ طاعون بتاریخ ۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ بروز دوشنبہ واقع ہوا۔ ''دوشنبہ نہم ربیع الاول ۱۰۲۵ھ'' ان الفاظ سے بھی تاریخ وفات نکل آتی ہے۔

خواجہ محمد سعیدؒ: آپ ماہ شعبان ۱۰۰۵ھ میں پیدا ہوئے آپ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح بچپن ہی سے صلاح وتقویٰ کا پیکر تھے۔ خود حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ محمد سعید چار پانچ سال کے تھے کہ بیمار ہوئے غلبۂ ضعف کے عالم میں ان سے دریافت کیا کہ بیٹا! کیا چاہتے ہو؟ بے اختیار جواب دیا حضرت خواجہ (محمد باقی باللہ) کو چاہتا ہوں۔ میں نے ان کے یہ کلمات حضرت خواجہ صاحبؒ کو لکھ بھیجے۔ حضرت قدس سرہ نے جواب دیا کہ تمہارے محمد سعید نے ہماری نسبت غائبانہ طور پر اُچک لی۔ حضرت خواجہؒ نے حضرت مجددؒ کے صاحبزادوں کے متعلق اپنے ایک مرید کو یہ کلمات تحریر فرمائے ہیں:

''فرزندان ایشاں کہ اطفال اند اسرار الٰہی اند استعداد ہائے عجب دارند بالجملہ شجرۂ طیبہ اند انبتہا اللہ نباتاً حسنا۔ ترجمہ: ان کہ (حضرت

مجدّ دالف ثانیؒ) کے تمام فرزند اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں اور عجب استعداد رکھتے ہیں مختصر یہ کہ شجرۂ طیبہ ہیں اللہ تعالیٰ پروان چڑھائے۔‘‘

آپ جب سن شعور کو پہنچے علوم ظاہریہ کی تحصیل میں مشغول ہو گئے، کچھ تعلیم اپنے والد بزرگوار سے، کچھ اپنے بڑے بھائی سے اور کچھ شیخ طاہر لاہوریؒ سے حاصل کی۔ حتیٰ کہ تمام علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت تامہ حاصل کر لی اور تحصیل علم کے زمانہ ہی میں حضرت مجدّ دؒ کی توجہ سے طائفہ علیہ نقشبندیہ کی نسبت سے مشرف ہوئے۔ ۱۷،۱۸ سال کی عمر سے درس دینا شروع کیا اور معقول ومنقول کی مشکل مشکل کتابیں پوری قابلیت سے پڑھائیں اور بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے انھیں میں سے ’’تعلیقات مشکوٰۃ المصابیح‘‘ بھی ہے۔ فقہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور مشکل سے مشکل مسائل کو معمولی توجہ سے حل فرماتے تھے۔ ایک موقع پر سجدۂ تحیہ کے جواز وعدم جواز پر مناظرہ ہوا، اس مناظرہ میں ایک طرف اس زمانہ کے بہت سے مولوی صاحبان تھے اور دوسری طرف آپ اور آپ کے چھوٹے بھائی خواجہ محمد معصومؒ۔ دونوں بھائیوں نے اپنی قوت علمیہ کے وہ جوہر دکھلائے کہ اہل علم متحیر اور حاضرین مجلس ششدر رہ گئے۔ ’’صاحب زبدۃ المقامات‘‘ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت مجدّ دؒ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: کہ جب محمد صادق علیہ الرحمہ کا انتقال ہو گیا تو مجھے رنج تھا کہ ایسا جامع ظاہر و باطن فرزند جدا ہو گیا۔

الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے یہ دونوں بھائی اپنے بڑے بھائی کے قائم مقام کر دیے۔ ان دونوں بھائیوں پر حضرت مجدّ دؒ کی خاص نظر عنایت تھی اور حق تعالیٰ نے ان کو نسبتہائے بلند اور احوال ارجمند سے نوازا تھا اور یہ دونوں حضرتؒ کے علوم ومعارف کے حامل اور اسرار ورموز کے وارث تھے۔ ’’صاحب زبدۃ المقامات‘‘ لکھتے ہیں کہ ایک سفر میں یہ دونوں مخدوم زادے حضرتؒ کے ساتھ نہیں تھے اور کسی ضرورت سے ’’سرہند‘‘ میں رہ گئے تھے۔ میں حضرت مجدّ دؒ کے ساتھ تھا میں دیکھتا تھا کہ جب کوئی ’’معرفت‘‘ حضرت کے قلب

پرورش ہوتی تھی اس وقت حضرتؒ دونوں فرزندوں کو بشوق تمام یاد فرماتے تھے۔ آپ کی وفات ۲۷ ربیع جمادی الاخری ۱۰۷۰ھ میں ہوئی۔ مزار مبارک سرہند میں ہے۔

عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصومؒ [۱]: آپ حضرتؒ کے فرزند ثالث ہیں آپ کی ولادت باسعادت ۱۱ رشوال ۱۰۰۷ھ میں ہوئی۔ اسی سال حضرت مجددؒ کو حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کی خدمت میں پہنچنے کا شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ محمد معصوم کی ولادت ہمارے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی کہ اس کی ولادت کے چند مہینے بعد حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا اور وہاں جو کچھ دیکھا وہ دیکھا۔ حضرت مجددؒ نے ایک مقام پر آپ کو "محمدی المشرب" تحریر فرمایا ہے اور ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:

> "از فرزندے محمد معصوم چہ نویسد کہ وے بالذات قابل ایں دولت است یعنی ولایت خاصہ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ۔ ترجمہ: اپنے فرزند محمد معصوم کے متعلق کیا لکھوں۔ وہ تو بالذات اس دولت یعنی ولایت خاصہ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی استعداد رکھتے ہیں۔"

استعداد کی بلندی بچپن ہی سے آشکارا ہو چلی تھی۔

خود حضرت مجددؒ نے بچپن میں ان کی اس استعداد کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا کہ:

> "اس راستہ میں فیضان الٰہی کے لحاظ سے بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے مساوی ہیں ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ۔"

اسی استعداد کی وجہ سے حضرتؒ کی نظر عنایت خاص طور پر ان کی شامل حال رہتی

---

۱ ان تین صاحبزادوں کے علاوہ حضرتؒ کے چار صاحبزادے شیخ محمد فرخ، شیخ محمد عیسیٰ، شیخ محمد اشرف اور شاہ محمد یحییٰ اور تھے۔ جن میں اول الذکر دو بچپن میں اور محمد اشرف حالت شیر خوارگی میں فوت ہو گئے آخر الذکر (شاہ محمد یحییٰ) حضرتؒ کی وفات کے وقت کمسن تھے۔ اس لیے خلفاء کے تذکرے میں تین ہی صاحبزادوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ صاحبزادوں کے علاوہ حضرتؒ کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ (فریدی)

تھی اور آپ ظہور کمالات کے منتظر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ چونکہ علم مبدأ حال ہے؛ اس لیے اس کے حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔ اسی وجہ سے علم معقول و منقول کو حاصل کرنے کی تاکید اور کتب دقیقہ علمیہ کا صفحہ صفحہ اور ورق ورق پڑھنے کا حکم فرما کر ارشاد فرمایا کرتے تھے:

''بابا! زود از تحصیل ایں علوم فارغ شوید کہ مارا با شما کارہائے عظیم است۔ ترجمہ: بیٹا! ان علوم کی تحصیل سے جلد فارغ ہو جاؤ ہم کو تم سے بڑے بڑے کام لینے ہیں۔''

چنانچہ توجہ مبارک کے اثر سے آپ بھی اپنے بڑے بھائیوں کی طرح سولہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے۔ اگرچہ تعلیم کے زمانہ میں بھی باطن کی طرف توجہ رکھتے تھے لیکن فراغت تعلیم کے بعد ہمہ تن ادھر ہی متوجہ ہو گئے۔ ایک دفعہ حضرت مجددؒ نے آپ کو ایک خواب کی تعبیر کے سلسلے میں یہ بشارت دی:

''تو قطب وقت می شوی و ایں سخن را از من یاددار۔ ترجمہ: تم اپنے وقت کے قطب ہو گے اور یہ میری بات یاد رکھو۔''

صاحب ''زبدۃ المقامات'' فرماتے ہیں کہ میں نے خود حضرت مجددؒ کو زبان مبارک سے یہ فرماتے سنا ہے:

''اقتباس محمد معصوم نسبتہائے مارا یوماً فیوماً بصاحب شرح وقایہ می ماند در حفظ تعلیم وقایہ از جد بزرگوارش۔ ترجمہ: محمد معصوم کا ہماری نسبتوں کو یوماً فیوماً اقتباس کرنا ایسا ہے جیسا کہ صاحب شرح وقایہ کا اپنے دادا سے تعلیم وقایہ کا حفظ کرنا (جیسا کہ کتاب مذکور کے دیباچہ سے واضح ہے۔)''

آپ کو اپنے پدر بزرگوار کے اسرار و معارف سے بہت زیادہ آگاہی حاصل تھی۔ آپ کے ان مکاتیب کے مطالعہ سے جو آپ نے وقتاً فوقتاً حضرت کی خدمت میں ارسال کیے ہیں آپ کے کمالات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ مزار مبارک سرہند ہی میں ہے۔
حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا سلسلہ دو واسطوں سے آپ تک پہنچتا ہے اور آج کرۂ ارضی پر بسنے والے لاکھوں نفوس فقط آپ کے واسطے سے حضرت مجدّد الف ثانیؒ سے فیض باطن حاصل کر رہے ہیں۔ دیگر خلفاء کے مستفیضین کا تو شمار ہی کون کر سکتا ہے۔

میر محمد نعمان کشمیؒ: آپ کے والد کا اسم مبارک سید شمس الدین یحییٰ تھا۔ میر بزرگ کے نام سے مشہور تھے اور مشاہیر "بدخشاں و ماوراء النہر" میں شمار کیے جاتے تھے۔ جفر و تکسیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولد مسکن اور مدفن کشم ہے (جو کہ بدخشاں کے مضافات میں سے ہے) ۹۹۴ھ میں وفات پائی۔

میر بزرگ کے والد ماجد امیر جلال الدینؒ اور ان کے والد سید حمید الدینؒ بھی صاحب صلاح و تقویٰ بزرگ اور مشہور و معروف عالم تھے۔ میر محمد نعمانؒ کی ولادت با سعادت "سمرقند" کے اندر ۹۷۷ھ میں ہوئی۔ آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے والد نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان ابن ثابتؒ کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ تمہارے ایک فرزند سعادتمند پیدا ہوگا۔ اس کا نام ہمارے نام پر (نعمان) رکھنا۔ چنانچہ آپ کا یہی نام رکھا گیا آپ میں بچپن سے ہی درویشی کے آثار نمایاں تھے۔ فقراء و مشائخ کی خدمت میں جا کر ان کے مراقبات سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔ آغاز شباب میں عارف آگاہ امیر عبید اللہ بلخی عشقیؒ کے پاس "بلخ" پہنچے۔ بعدہٗ ہندوستان تشریف لائے اور یہاں پر بھی وفور شوق میں بعض درویشوں سے اذکار کی تعلیم حاصل کی۔ حتیٰ کہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندیؒ کی خدمت میں دہلی آئے اور ان کے الطاف بے پایاں کو دیکھ کر طریقۂ نقشبندیہ میں منسلک اور اس نعمت سے مشرف ہوئے۔ آپ کے ہمراہ فرزندوں اور رشتہ داروں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ اور ان کے ساتھ فقر و فاقہ میں بسر کرتے تھے اور بایں ہمہ حصول دولت سرمدی کی امید میں خوش دل اور مسرور رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مخلص امیر نے حضرت

خواجہ محمد باقی باللہؒ سے عرض کیا کہ حضور کی خانقاہ کے فقراء تنگی سے بسر کرتے ہیں اگر حکم ہو تو ہر ایک درویش کا یومیہ مقرر کر کے سعادت اندوز ہونے کا شرف حاصل کروں۔ حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ نے اپنے چند مریدوں کے نام اس کارِ خیر کے لیے تجویز فرمائے، ایک شخص نے عرض کیا کہ میر محمد نعمان بھی مفلس اور کثیر العیال ہیں ان کا بھی یومیہ مقرر ہو جائے، حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ ان کے لیے راضی نہ ہوئے اور فرمایا: کہ ''یہ لوگ ہمارے جزوِ بدن ہیں ہم اپنے جزوِ بدن کو اس چیز سے مستثنیٰ کرتے ہیں'' میر صاحب نے یہ بات سنی تو باوجود فاقوں میں مبتلا ہونے کے ان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور بہت سی امیدیں زندہ ہو گئیں۔

میر صاحبؒ کو جب حضرت خواجہ صاحبؒ کے مرض الموت میں ایک رات خدمتگاری کا پورا موقع ملا، اس رات حضرت خواجہ صاحبؒ نے ان پر ایک نظر ڈالی، اس نگاہ خاص کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد جو کام بھی آپ کرتے تھے اس کے متعلق یہ سوچتے تھے کہ آیا اس میں رضائے خداوندی ہے یا نہیں؟ حتیٰ کہ قدم بھی اُٹھاتے تو دل میں کہتے تھے کہ یہ قدم حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق تھا یا نہیں؟

حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ نے جب حضرت مجددِ الف ثانیؒ کو بیعت و ارشاد کی اجازت دی اور اپنی حیات ہی میں اپنے تمام اصحاب کو آپ کے سپرد کیا اور ان سب کی تربیت کا آپ کو متکفل بنایا اس وقت اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے کہ ان کے سامنے ہماری تعظیم نہ کیا کرو بلکہ توجہ بھی ہماری جانب نہ کرو، چنانچہ میر محمد نعمانؒ سے بھی فرمایا کہ ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھنا۔ انھوں نے ادب سے عرض کیا کہ ہمارا قبلۂ توجہ تو حضور کی ہی درگاہ ہے۔ بزرگ وہ بھی ہوں گے اس سے انکار نہیں...... حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ نے یہ سنا تو غصہ ہو کر فرمایا:

> ''میاں شیخ احمد آفتابے اند کہ مثل ما ہزاراں ستارگاں در ضمن ایشاں گم است و از کبارِ اولیاء متقدمین خال خال مثل ایشاں گذشتہ باشند۔

ترجمہ: میاں شیخ احمد ایک ایسے آفتاب ہیں کہ ہم جیسے
ہزاروں ستاریں ان کے اندر گم ہیں۔ اولیاء متقدمین و کاملین میں
سے بہت کم ان جیسے گزرے ہوں گے۔"

اس کے بعد میر صاحبؒ نے اپنا اعتقاد درست کیا اور نیازمندی کے ساتھ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی خدمت میں پہنچے اور عنایت کے طالب ہوئے۔ حضرت مجدّدؒ نے فرمایا کہ تم ہمارے ہی ہو لیکن کچھ دنوں ہمارے پیر و مرشد کی خدمت میں اور رہو۔ حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کے انتقال کے بعد جب حضرت مجدّد الف ثانیؒ دہلی تشریف لائے تو میر صاحب نے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا جس میں اپنی شکستہ دلی، بے نصیبی اور بے استعدادی کا ذکر تھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے پاس آپ کے حضور میں بجز اس کے اور کوئی وسیلہ نہیں ہے کہ میں حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہوں۔ حضرت مجدّدؒ پر اس عریضہ کے مطالعہ سے رقت طاری ہوئی اور فرمایا کہ میر! گھبراؤ نہیں۔ الغرض میر صاحب موصوف کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرکے "سرہند" لے گئے اور یہ سالہا سال حضرت مجدّدؒ کے آستانے پر مقیم رہے اور مقامات عالیہ سے سرفراز ہوئے۔ ایک دفعہ حضرت مجدّدؒ کو ضعف عارض ہوا اس خیال سے کہ شاید مرض مرض الموت ہو آپ نے امانت "خواجگان نقشبندیہ" کسی اہل کے سپرد کرنی چاہی اور قصد کیا کہ اس نسبت عالیہ کو کسی مخلص کے قلب میں القاء فرمائیں اس وقت اس بار کا متحمل سوائے اپنے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صادقؒ اور میر محمد نعمانؒ کے کسی کو نہیں پایا تھا۔

حضرت مجدّدؒ نے میر صاحبؒ کو اجازت نامہ مرحمت فرما کر طلبائے معرفت کی ہدایت کے لیے "برہان پور" روانہ فرمایا۔ میر صاحبؒ دو دفعہ شہر "برہان پور" سے بعض وجوہ کی بنا پر چلے چلے گئے۔ حضرت مجدّدؒ نے تیسری مرتبہ پھر برہان پور ہی کے لیے مامور فرمایا۔ اس دفعہ جب آپ برہان پور تشریف لائے تو رنگ ہی دوسرا نظر آیا۔ آپ کی مجلس میں عجیب

کیفیات کا ظہور ہوا، اگر کسی جماعت نے دور سے بھی آپ کی مجالس کا نظارہ کرلیا تو اس پر جذب و کیف طاری ہوگیا اور ہر ہر فرد مرغ بسمل کی طرح خاک پر تڑپنے لگا۔ المختصر ع

درمیان شہر در ہر گوشہ غوغائے اوست

کا سماں بندھ گیا۔ بہت سے لوگ داخل سلسلۂ عالیہ ہوئے اور کتنے ہی بدکار اشخاص صلاح و تقویٰ کے لباس سے آراستہ ہوگئے۔ صاحب ''زبدۃ المقامات'' مولانا محمد ہاشم کشمیؒ نے آپ ہی کی ہدایت سے حضرت مجددؒ سے شرف بیعت حاصل کیا۔

آپ نے اگر چہ علوم ظاہر کی تحصیل کم کی تھی لیکن ادراک حقائق صوفیہ؛ خصوصاً حضرت مجددؒ کے علوم و معارف سمجھنے کی اپنے اندر خاص اہلیت رکھتے تھے۔ خود حضرت مجددؒ نے آپ کے فہم خداداد کی تعریف فرمائی ہے۔ ''مکتوبات شریف'' میں بہت سے مکاتیب آپ کے نام ہیں ایک مکتوب کا خلاصہ (جس میں سلسلۂ نقشبندیہ کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں) یہ ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ اس نے ہم کو صحیح العقیدہ، بموافقِ مسلکِ اہلِ سنت و جماعت بنا کر طریقہ نقشبندیہ میں منسلک فرمایا۔
>
> کمالات نبوت بطریق تبعیت و وراثت اس طریقہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ کے منتہی کمالات خاصہ حاصل کرتے ہیں اور مبتدیوں و متوسطوں کے متعلق بھی منتہیوں کی محبت کے باعث ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' کی بشارت کے موافق ایسی ہی امیدیں ہیں۔
>
> بدنصیب و نامراد وہ شخص ہے جو اس سلسلہ میں داخل ہو کر اس کی رعایت نہ کرے اور بدعات کو اس طریقہ میں ایجاد کرے اور اپنے خوابوں اور احوال پر اعتماد کرکے اس طریقے کے خلاف قدم اُٹھائے

اس صورت میں (اگر وہ فیضیاب نہ ہوتو) طریقہ عالیہ نقشبندیہ کا کیا قصور ہے۔'' آپ کی وفات ۱۸ر صفر ۱۰۵۸ھ[1] میں ہوئی۔

مولانا محمد ہاشم کشمیؒ: آپ ''کشم'' کے رہنے والے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد چونکہ سلسلہ ''کبرویہ'' سے منسلک تھے اس لیے ایام طفولیت میں آپ کو اس خانوادے کے خلفاء کی خدمت میں پہنچنے کا اتفاق ہوا لیکن فطری مناسبت کی وجہ سے غیر معلوم طور پر سلسلۂ نقشبندیہ سے دلی لگاؤ تھا مگر اس سلسلہ کے کسی مرشد و رہبر کی تعیین نہیں کر سکے تھے۔ اسی کشاکش کے زمانہ میں ہندوستان آئے، یہاں پر مشائخِ قدیم کے حالات عجیبہ و تصرفاتِ غریبہ کا ایک محفل میں تذکرہ سن کر دل میں کہنے لگے (اور شاید زبان سے بھی فرمایا) کہ یہ حقیقت شناس گروہ ایام گزشتہ ہی میں ہوتا ہوگا۔ موجودہ صورت حال کے لحاظ سے خزانۂ ایام یا تو ان جواہر سے خالی ہے یا ایسا ہو کہ حقیقت میں ایسے بزرگ موجود ہیں لیکن ہمارے دیدۂ ادراک کی کوتاہی کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہیں۔

خاطر خوباں بصید اہل دل مائل نماند ☆ یا بشہر عشق بازاں مرد صاحبدل نماند

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد ایک رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک صاحب دل تشریف لائے اور آپ کو اپنے ہمراہ لے جا کر ایک بزرگ کے سامنے پیش کر دیا وہ بزرگ مکان کے چبوترے پر عالم مراقبہ میں سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پیش ہوتے ہی اپنا سر اُٹھایا اور ہاتھ پکڑ کر فرمایا: پڑھ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ... (آخر سورہ تک) آپ اس سورۃ کو پڑھتے جاتے اور زار و قطار روتے جاتے تھے۔ آنکھ کھلی تو سورۃ کے مضمون پر غور کر کے یقین کی دنیا جگمگا اُٹھی اور منزل مقصود قریب نظر آنے لگی۔ اس خواب کو ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ آپ شہر ''برہان پور'' آئے اور حضرت میر محمد نعمانؒ خلیفۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے ذکر و مراقبہ کی تعلیم حاصل

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۱۲۳، مؤلفہ حاجی محمد نذیر احمد دیوبندی۔ (فریدی)

کی۔ دربار نعمانیؒ میں ان صاحب دل بزرگ کی بھی زیارت ہوئی جن کی وساطت سے خواب میں یہاں رسائی ہوئی تھی۔ غرضیکہ اس رویائے صادقہ کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ۱۰۳۱ھ تک برہان پور رہے اور اس وقت سے لے کر حضرت کے وصال (۱۰۳۴ھ) تک تقریباً دو سال سفر و حضر میں حضرت مجددؒ ہی کے ساتھ رہے۔ اسرار و معارف سنے اور الطاف و عنایات کا مورد بنے رہے۔ حضرت مجددؒ کی زندگی ہی میں صاحبزادوں کی فرمائش پر ان فوائد و معارف کو لکھنا شروع کیا جن کو خلوت و جلوت میں زبان گوہر فشاں سے سنا تھا۔ نیز حضرت مجددؒ اور ان کے مرشد کامل کے اطوار، انوار، برکات اور خوارق عادات لکھنے کا قصد کیا۔ چند ورق سے زیادہ نہ لکھ پائے تھے کہ حضرت رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گئے۔

وصال مرشد کے بعد آپ کی توجہ اس کام کی طرف زیادہ ہوئی کیونکہ دل مہجور کو تسلی دینے کے لیے اس سے بہتر اور مشغلہ ہی کیا ہو سکتا تھا کہ اپنے پیر باکمال کے اقوال و احوال کو لکھیں اور گزری ہوئی صحبتوں کو یاد کر کے قلب و روح کو یک گونہ تسکین دیتے رہیں ؎

ماہی کاں گشت محروم از فرات! ☆ از کف آبے ہے جوید حیات!

چنانچہ آپ نے حضرت مجددؒ کے حالات کے علاوہ حضرت مجددؒ کے پیر و مرشد، خلفاء اور صاحبزادگان وغیرہم کے حالات کا نہایت جامع اور مستند مجموعہ لکھا جس کا نام ''برکات الاحمدیۃ الباقیہ'' رکھا۔ اس کا تاریخی نام ''ھو زبدۃ المقامات''[۱] قرار پایا۔ چنانچہ یہ کتاب زبدۃ المقامات ہی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں ''نشاط روح'' کا نہایت کافی سامان موجود ہے۔ حضرتؒ کے حالات میں اس سے زیادہ مستند اور قدیم کتاب غالباً اور کوئی نہ ہو گی۔ حضرتؒ کے احوال و اقوال کو نہایت عمدگی و خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ بیجا مبالغہ سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے اور مجالس مجددیہ کی ایسی مکمل تصاویر کھینچی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ناظر کتاب دربار فیض آثار میں بیٹھا ہوا حضرتؒ کو دیکھ رہا ہے۔ حضرت

۱؎ اس سے ۱۰۳۷ھ برآمد ہوتی ہے۔ (فریدی)

مجددؒ کے ملفوظات سن رہا ہے اور دریائے معارف کو اپنے دامن میں بھر رہا ہے۔ مکتوبات شریف کی آخری جلد کو بھی آپ ہی نے ترتیب دیا ہے۔

خواجہ سیّد آدم حسینی بنّوریؒ: آپ کا اصلی وطن قصبہ ''مودہ'' تھا، مگر سکونت ''بنّور'' میں اختیار کر لی تھی۔ ابتدائی تعلیم سلوک حاجی خضرؒ سے پائی بعد از اں باجازت حاجی صاحبؒ حضرت مجددؒ کی خدمت میں آ گئے اور درجات عالیہ پر فائز ہوئے۔ آپ محض اُمّی تھے۔ فیض روح القدس کی مدد سے قرآن شریف حفظ کیا اور علوم ظاہریہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اتباع سنت و دفع بدعت آپ کا خاص شیوہ تھا۔ ہزاروں طالبان خدا کو خدا رسیدہ کیا، آپ کی خانقاہ میں ہزار سے زائد طلبائے معرفت روزانہ جمع رہتے تھے اور ان کو لنگر سے کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ آپ کے خلفاء[۲] کی تعداد ایک سو اور مریدین کی تعداد ایک لاکھ بتلائی جاتی ہے۔ حج کے لیے ''مکہ معظمہ'' گئے ہوئے تھے، وہاں سے فارغ ہو کر ''مدینہ منورہ'' پہنچے اور ۱۳ر شوال ۱۰۵۳ھ کو اسی مقدس سرزمین میں انتقال فرمایا۔ مزار مبارک ''جنت البقیع'' میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے مزار پاک کے قریب ہے۔

شیخ طاہر لاہوریؒ: حضرت مجددؒ کے ارادت مندوں میں آپ کا پایہ بھی نہایت بلند ہے۔ صاحب ریاضات و کرامات بزرگ تھے، علوم ظاہری میں کمال حاصل تھا اور حافظ قرآن بھی تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سلوک کا شوق غالب ہوا اور حضرت مجددؒ کے آستانِ مبارک پر پہنچے۔ آپ کو ایسے مرشد کی تلاش تھی جو علم وعمل میں

۱　ان کا تذکرہ ''تذکرۃ العابدین'' ص ۱۲۴ سے ماخوذ ہے۔

۲　آپ کے خلیفۂ اعظم حافظ سید عبداللہ اکبرآبادیؒ تھے۔ جن کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ اور ان کے بعد ان کے خلیفہ ان کے صاحبزادے مجدد وقت حضرت شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلویؒ ہوئے جن کے ظاہری و باطنی فیوض نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالم اسلامی پر محیط ہیں اور اس واسطے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے جو فیوض آج عالم میں نظر آ رہے ہیں وہ بالواسطہ حضرت مجددؒ ہی کے ہیں۔

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں ☆ ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند (فریدی)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا متبع ہو اور یہ بات سب پر ہویدا تھی کہ اس زمانہ میں ایسی جامع شخصیت حضرت مجددؒ ہی کی تھی۔ چنانچہ آپ نے سالہا سال اس شیخ کامل کی خدمت کی اور انکسار اور افتقار کے ساتھ حضرت مجددؒ کے فیض کدہ پر مقیم رہے۔ آپ حضرتؒ کے صاحبزادوں کی تعلیم و تدریس کا کام بھی نہایت کوشش و سعیٔ بلیغ سے انجام دیتے تھے۔ چنانچہ صاحبزادے فرمایا کرتے تھے: کہ ''ہم پر حضرت شیخ طاہرؒ کے احسانات اس سے بہت زیادہ ہیں کہ شکریہ سے عہدہ برآ ہو سکیں۔''

حضرت مجددؒ نے ایک دفعہ اپنے چھوٹے صاحبزادہ شاہ محمد یحیٰؒ کے متعلق فرمایا کہ ''اس کو شیخ طاہر کے سپرد کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ بھی ان کی برکت سے اپنے بڑے بھائیوں کی طرح عالم باعمل ہو جائے'' لیکن چونکہ اس وقت درویشی کا رنگ غالب اور ظاہری علم مغلوب ہو چلا ہوگا اس لیے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ''اب شیخ طاہر کا وہ دماغ کہاں رہا'' (جو پہلے تھا) باوجود جید عالم ہونے کے آداب شیخ کا انتہائی لحاظ تھا اور حضرت مجددؒ کی اس قدر ہیبت غالب تھی کہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ایک دن حضرت مجددؒ نے آپ کو امامت کا حکم فرمایا فوراً رنگ زرد پڑ گیا اور لرزہ براندام ہو گئے اور رعب کی وجہ سے حافظ قرآن اور عالم کامل ہوتے ہوئے قرأت گلے میں رُک رُک جاتی تھی اسی ادب و انکسار اور شیخ کی نظر کیمیا اثر نے آپ کو انتہائی نقطۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ بالآخر حضرت مجددؒ نے خلافت سے سرفراز فرما کر ''بلدۂ لاہور'' کے طالبان معرفت کی رہنمائی کے لیے لاہور روانہ فرمایا اور طریقۂ قادریہ میں بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ نے وہاں پہنچ کر طالبان حق کی تربیت فرمائی اور اپنے برکات و افاضات سے مخلوق خدا کو بہرہ ور کیا۔ خود ایک مکتوب میں حضرت مجددؒ کو لکھتے ہیں:

> ''میں چلتے وقت سخت متردد تھا کہ شیخ کامل کو چھوڑ کر کہاں جا رہا ہوں لیکن غیب سے کوئی شخص کہتا تھا کہ چلا چل حتیٰ کہ کشاں کشاں لاہور

آ گیا اور ایک مسجد کے گوشے میں حیران و پریشان بیٹھ گیا۔ ناگاہ حضرت خواجہ بزرگؒ کی روحانیت جلوہ گر ہوئی اور اس نے اس کام پر ثابت قدم رکھا۔ اسی درمیان میں ایک جوان بلند استعداد آیا۔ اس کو تعلیم باطن دیتے ہی یہ اثر ظاہر ہوا کہ اس کے تمام بدن میں نسبت سرایت کر گئی اور وہ سراپا آگاہ و عارف ہو گیا۔ اسی طرح دوسرے طالبوں کو بھی جمعیت نصیب ہوئی۔

حضور نے مقامات کے بارے میں خصوصاً مقام سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں اپنے مکتوب میں جو کچھ لکھا ہے اس کو بعض حاسدوں نے درمیان میں لانا شروع کر دیا اور اس میں اپنی طرف سے جھوٹی سچی باتیں ملا کر مکروہ پروپیگنڈا کیا اور طعنہ زنی کرنے لگے اور مولانا حامد اس مکتوب کو علامۃ الانام مولانا عبدالسلام کے پاس لے گئے انھوں نے اس کا مطالعہ کیا اور فرمایا کہ اس کے مضمون میں تو کوئی شبہ وارد نہیں ہوتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ حسن ظن کا بھی اظہار کیا۔ تب کہیں حاسدوں کی زبانیں بند ہوئیں۔''

آپ برابر اپنے پیر و مرشد کو اپنے احوال و مکاشفات سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ حلقۂ ارشاد وسیع تر ہوتا چلا جاتا تھا اور خلق خدا کثرت سے متوجہ ہو رہی تھی کہ ناگاہ اسی گرمیِ ہدایت کے زمانہ میں شیخ نے بر بنائے انکساری و آزاد مزاجی ایسا شیوہ اختیار کر لیا جس سے رجوع خلق میں فرق آئے۔ جب حضرت مجددؒ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ کے نام ایک مکتوب لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

''خداوند کریم نے تم کو منصب جلیل عطا فرمایا ہے لہٰذا اس کا شکریہ ادا کرو اور اس بات کا خیال رکھو کہ تم سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جو

باعث نفرت خلق ہو، خلق کو متنفر کرنا فرقہ ملامتیہ کا شیوہ ہے، دعوت و ارشاد سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ مشیخت کے رتبہ پر پہنچ کر ملامت کی آرزو کرتے ہو یہ صریح ظلم ہے۔ مریدوں کے ساتھ زیادہ خلط ملط نہ رکھا کرو کہ اس میں ہلکا پن پایا جاتا ہے اور یہ چیز بھی افادہ و استفادہ کے منافی ہے۔ حدود شرعیہ کی محافظت کرو جہاں تک ہو سکے رخصت پر عمل کرنے کی تجویز نہ کرو کہ یہ اس سلسلہ کے اصول کے منافی نیز اتباع سنت کے دعوے کے خلاف ہے۔''

یہی ہدایت نامہ آپ کے لیے کافی ہوا اور اس کے جواب میں آپ نے لکھا ''اب میرے سامنے سوائے شریعت سنت کے اور کچھ نہیں ہے۔''

پھر تو آپ نے تشرع واتباع، اور فقر وقناعت میں اپنی نظیر قائم کر دی تھی۔ اہل دنیا کی داد و دہش کو قبول نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنے قوت بازو سے حلال روزی بہم پہنچاتے تھے البتہ کوئی دیندار شخص اگر ہدیۃً کوئی چیز پیش کرتا تھا تو اسے قبول فرمالیا کرتے تھے۔

ہر سال چند بار پیادہ پا درویشوں کی جماعت کے ساتھ بے زاد و توشہ لاہور سے سرہند آیا کرتے اور چند روز کوچۂ معرفت میں رہ کر رخصت ہو جاتے تھے۔ آپ نے ۸؍محرم ۱۰۴۰ھ کو بروز پنجشنبہ وفات پائی۔ مزار مبارک لاہور میں[1] ہے۔

شیخ بدیع الدین سہارنپوریؒ: آپ شروع میں حضرت مجددؒ کے پاس ''توضیح تلویح'' پڑھتے تھے لیکن درویشوں سے عقیدت نہ تھی بلکہ حالت یہ تھی کہ نماز تک کے بھی پابند نہ تھے۔ جس زمانہ میں آپ حضرت مجددؒ کے پاس پڑھتے تھے اسی زمانہ میں آپ کو ایک حسین وخوش رو جوان سے عشق ہو گیا تھا۔ نوبت باینجا رسید کہ درمیان سبق میں بھی آپ کو بے چینی رہتی تھی کہ کب سبق ختم ہو اور کب میں کوچۂ محبوب میں جا کر اس کے نظارہ سے

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۱۲۳ (فریدی)

آنکھیں ٹھنڈی کروں۔

ایک دن حضرت مجددؒ نے آپ سے فرمایا کہ تم نماز پڑھا کرو اور شرعی محرمات سے بچو کیونکہ معاصی کے ارتکاب سے علم ظاہر میں بھی بے برکتی ہوتی ہے۔انھوں نے عرض کیا کہ اس قسم کی نصیحتیں تو میں نے بہت سے لوگوں سے سنی ہیں۔حضرت اگر کوئی خاص توجہ فرمائیں تو شاید میری حالت کچھ سدھر سکے۔حضرت مجددؒ نے تھوڑے تامل کے بعد فرمایا اچھا کل اسی ارادہ سے میرے پاس آؤ اور دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔اتفاقاً اگلے دن ان کا محبوب نوجوان ان کے گھر آ گیا، ان کا دل نہ چاہا کہ ہم نشینئ محبوب ترک کر کے حضرت مجددؒ کی خدمت میں حاضر ہوں۔دو تین دن کے بعد جب حاضر ہوئے تو حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ تم نے خلاف وعدہ کیا، اچھا نہیں کیا، خیر اس وقت کا آنا بھی مبارک ہے، جاؤ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرو اور میرے پاس آؤ۔انھوں نے ارشاد کی تعمیل کی، اس کے بعد آپ ان کو خلوت میں لے گئے اور ذکر قلب کی تعلیم دی اور توجہ فرمائی۔اس توجہ کا پڑنا تھا کہ فوراً کایا پلٹ گئی، مست و بے خود ہو گئے اور اسی عالم بے خودی میں زمین پر گر پڑے اور دوسروں نے اُٹھا کر آپ کو مکان تک پہنچایا۔ایک دن کے بعد افاقہ ہوا، اس دن کے بعد سے تعلقات دنیا سے دل سرد ہو گیا اور اپنے آپ کو اپنے سے دور اور عالم غیب سے نزدیک دیکھنے لگے۔

نخستین بادہ کاندر جام کردند ☆ زچشم "مست ساقی" وام کردند (عراقی)

اس کے بعد مدتوں تک آستانہ عالیہ پر رہے اور فیوض و برکات سے بہرہ مند ہوتے رہے، یہاں تک کہ حضرت مجددؒ کو ان پر کامل اعتماد ہو گیا اور تعلیم طریقت کی اجازت مرحمت فرمائی۔بعد حصول اجازت آپ اپنے وطن مالوف "سہارنپور" تشریف لے آئے اور طالبان معرفت کی اصلاح و تربیت میں مشغول ہو گئے۔کچھ عرصہ بعد حضرت مجددؒ نے آپ کو "آگرہ" جانے کا حکم دیا۔یہ شہر دارالسلطنت ہونے کی حیثیت سے خاص مرکزیت رکھتا تھا لیکن ابھی تک اس سلسلے کے خلفاء سے خالی تھا۔

حضرت مجددؒ نے ان کو تاکید فرمادی تھی کہ آگرہ میں پوری استقامت کے ساتھ رہنا اور ہمارے حکم کے بغیر وہاں سے نہ جانا۔ یہ وہاں پہنچے حق تعالیٰ نے مقبولیت عامہ عطا فرمائی، امراوغربا؛ غرض ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ آپ کے فیوض و برکات سے متمتع ہوئے لیکن آپ سے ایک لغزش یہ ہوگئی کہ حضرت مرشد کے اذن کے بغیر آپ وہاں سے اپنے وطن چلے آئے۔ یہ چیز حضرت مجددؒ کو سخت ناگوار گزری۔ جب آپ کو اس ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو دوبارہ آگرہ کا قصد کیا اور حضرت کو اس ارادہ سے اطلاع دی۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ وہاں کا صحیح وقت وہی تھا اب اگر تم جاتے ہو تو تم جانو تمہیں اختیار ہے۔ شیخ بحالت اضطراب اس امید میں کہ شاید حضرتؒ کی ناراضگی دور ہو جائے دوبارہ آگرہ چلے گئے۔ اس دفعہ بھی شروع شروع میں خلق خدا کو بہت فیض پہنچا لیکن سوءِ اتفاق کہ ایک دن وہاں کی چھاؤنی کے چند اُجڈ فوجیوں کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی، آپ نے ان کی ذہنیت وصلاحیت کا لحاظ کیے بغیر ان کو سختی کے ساتھ بعض منکرات پر تنبیہ ونصیحت فرمائی جس کی وجہ سے ان میں کے بعض بدطینت آپ کے دشمن ہو گئے۔ اس کے علاوہ عام طور پر اپنے بلند احوال وانکشافات لوگوں کے سامنے بیان کئے جو منکرین ومعاندین کے کانوں میں پہنچ کر فتنہ کا سبب بن گئے۔ چنانچہ اہل عناد نے اپنی رنگ آمیزیوں اور حاشیہ آرائیوں سے کام لے کر ایک زبردست فتنہ آپ کے خلاف برپا کر دیا۔ اس فتنہ کا اثر حضرت مجددؒ تک بھی متعدی ہوا اور اس ابتدا کی انتہا یہ ہوئی کہ سلطان وقت (جہانگیر بادشاہ) نے جو اس وقت تک طائفہ فقراء سے کوئی انس ومناسبت نہ رکھتا تھا حضرت مجددؒ کو طلب کر کے ایذا پہنچائی اور قید خانہ میں محبوس کر دیا (اگرچہ بعد کو بادشاہ اپنے اس فعل پر نادم وپشیمان ہوا اور اس نے معافی بھی چاہی)۔

اس المناک واقعہ کے بعد شیخ بدیع الدینؒ آگرہ سے اپنے وطن سہارنپور واپس چلے آئے اور وہیں پر گوشہ گزیں ہو کر ذکر ومراقبہ اور انس والفت میں بسر کی۔ پچاس سال کی

عمر میں قرآن شریف حفظ کیا اور تمام عمر طالبان علوم دینی ویقینی کے افادہ میں مشغول رہے۔[1]

شیخ نور محمد پٹنیؒ: آپ علوم رسمیہ کی تحصیل کے بعد سلوک کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہندوستان کے بہت سے درویشوں کے پاس گئے، کہیں تسکین روح کا سامان بہم نہ پہنچا۔ آخر کار حضرت مجددؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے مقامات طے کئے اور حیرت انگیز ترقی کی؛ چنانچہ اس زمانہ میں حضرت مجددؒ نے اپنے پیر بزرگوار حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کو جو خط لکھا ہے اس میں شیخ نور محمدؒ کی ترقیات کا بھی مفصل ذکر فرمایا ہے۔

آپ عرصہ تک حضرت مجددؒ کی خانقاہ میں رہے اور حالات میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ تکمیل کے بعد حضرت مجددؒ نے اجازت مرحمت فرما کر ''شہر پٹنہ'' روانہ فرمایا۔ آپ حسب الامر وہاں پہنچے لیکن خلوت پسندی کے غلبہ کی بنا پر اکثر آبادی سے باہر رہتے تھے اور لوگوں سے اجتناب کرتے تھے۔ جب حضرت مجددؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو ایک مکتوب شریف کے ذریعہ آپ کو اس عادت کے ترک کرنے کی تلقین فرمائی اور تحریر فرمایا:

> ''جس طرح انسان کو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی تعمیل لازمی ہے اسی طرح خلق خدا کے حقوق کی رعایت اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی ضروری ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کر کے دوسرے کو نظر انداز کر دینا نادرست ہے۔ خلق خدا کی اذیتوں کا تحمل اور ان سے حسن معاشرت سلوک کے لوازمات میں سے ہے، تلقین کے ضمن میں یہ شعر بھی تحریر فرمایا ؎

ہر کہ عاشق شد گرچہ نازنین عالم است ☆ نازکی کے راست آید بار می باید کشید''

آپ نے حضرت مجددؒ کے ارشاد کی تعمیل کی اور شہر پٹنہ کے ایک طرف دریائے

---

[1] آپؒ کی وفات ۱۰۴۲ھ میں ہوئی۔ بحوالہ تذکرہ دانشورانِ سہارنپور، مؤلفہ مولانا سید محمد شاہد (محب الحق)

گنگا کے کنارے ایک جھونپڑا بنایا اور وہیں ایک چھوٹی سی خام مسجد تیار کی اور مع اہل وعیال اسی جھونپڑے میں رہنے لگے۔ اکثر وقت مسجد ہی میں گزرتا تھا، نماز کے علاوہ ارشاد و ہدایت اور افادہ علوم دینیہ کا مرکز بھی اسی مسجد کو بنا رکھا تھا۔

شیخ حمیدؒ بنگالی: آپ تحصیل علوم دینی کے لیے ''لاہور'' تشریف لائے تھے، بعد فراغت وطن مالوف جاتے ہوئے ''آگرہ'' میں بھی قیام کیا اور خواجہ عبدالرحمٰن صاحب مفتی کابلیؒ کے قریب اقامت گزین ہوئے۔ مفتی صاحب نے آپ کو علوم میں ماہر و متبحر پا کر آپ سے عہد لیا کہ جب تک آگرہ میں قیام رہے میرے ہی پاس رہیں۔ اثنائے قیام میں ایک دن تصوف اور مشائخ تصوف کا ذکر آ گیا تو مفتی صاحب کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ مولانا حمید صوفیائے کرام کے عموماً اور حضرت مجددؒ کے خصوصاً منکر ہیں۔ اس صحبت کو دو ہی تین دن گزرے تھے کہ اتفاق سے حضرت مجددؒ ''سرہند'' سے آگرہ تشریف لائے اور مولانا حمید سے مفتی صاحب کے مکان ہی پر ملاقات ہوگئی۔ حضرت مجددؒ نے ان کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا ''ہائے شیخ حمید اینجا بودہ اند'' ایک دو دفعہ خاص انداز سے ان پر نظر ڈالی اور فوراً مراقبہ میں مستغرق ہوگئے۔ اس کے بعد یکا یک وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے، ہر چند عرض کیا گیا کہ حضرت تھوڑی دیر اور تشریف رکھیں اور یہیں ماحضر تناول فرمائیں، قبول نہیں فرمایا گیا۔ مفتی صاحب پہنچانے کے لیے دروازہ تک آئے۔

ان کا خیال تھا کہ مولانا حمید ''بداعتقادی'' کی وجہ سے جگہ سے بھی نہ ہلیں گے مگر دیکھا گیا کہ پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ مفتی صاحب تو دروازہ تک آ کر واپس چلے گئے لیکن مولانا حمید بس حضرت مجددؒ کے پیچھے ہو لیے۔ اس وقت حضرت مجددؒ ان کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوئے یہاں تک کہ قیام گاہ پہنچ گئے۔ مولانا حمید دروازہ پر گریاں و حیراں کھڑے رہے، بعدازاں حاضری کی اجازت دی گئی اور بیعت سے مشرف کرنے کے ساتھ تعلیم طریقت و جذبہ نسبت سے نوازا گیا۔ اب تو ''مولانا حمید''، ''شیخ حمید'' ہو گئے اور یہ

کیفیت ہوگئی کہ اپنی کتابوں اور دوستوں کی بھی خبر نہ رہی۔

چند روز کے بعد حضرت مجددؒ آگرہ سے سرہند روانہ ہوئے تو یہ بھی پیادہ پا حضرتؒ کی خدمت میں چلے۔ شیخ حمیدؒ کا یہ واقعہ دیکھ کر مفتی صاحب خود بھی حضرت مجددؒ کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ مفتی صاحب کے ایک دولت مند دوست نے پوچھا کہ آپ لوگ تو عالم و عاقل ہیں ''شیخ احمدؒ'' میں کیا کرامت دیکھی جو ان کے مرید ہو گئے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ ہم اہل علم کوئی کرامت اس سے بہتر نہیں سمجھتے کہ شیخ عالم باعمل اور متبع سنت ہو، علم کے ساتھ ساتھ اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ و اہتمام جیسا حضرت شیخ سرہندیؒ میں دیکھا اپنے زمانہ میں کسی دوسری جگہ دیکھا نہ سنا۔ بس یہی ہمارے نزدیک سب سے بڑی کرامت اور حاصل ولایت ہے۔

شیخ حمیدؒ نے تقریباً دو سال آستانہ عالیہ پر رہ کر منازل سلوک طے کئے اور احوال عجیبہ و مقامات غریبہ سے نوازے گئے۔ اس کے بعد حضرت مجددؒ نے تعلیم طریقت کی اجازت دے کر ان کو وطن روانہ فرمایا۔ اجازت نامہ ''زبدۃ المقامات'' میں درج ہے تبرکاً و تیمناً ہم بھی اس مبارک تحریر کو اس جگہ نقل کرتے ہیں:

''أَمَّا بَعْدَ الحَمْدِ والصَّلاةِ، فَيَقُوْلُ الْعَبْدُ الْمُفْتَقِرُ اِلٰى رَحْمَةِ اللهِ الْمَلِكِ الْوَلِيِّ، اَحْمَدُ ابْنُ الشَّيْخِ عَبْدِالْاَحَدِ الْفَارُوْقِيُّ النَّقْشَبَنْدِيُّ رَحِمَهُمَا اللهُ سُبْحَانَهٗ رَحْمَةً وَاسِعَةً: اَنَّ الْاَخَ الْعالِمَ وَالصَّدِيْقَ الصَّالِحَ جَامِعَ عُلُوْمِ الشَرِيعَةِ والطَّرِيقَةِ الشَّيخ حَمِيْدًا الْبَنْگَالِيَّ- وَفَّقَهُ اللهُ سُبْحَانَهٗ لِمَا يُحِبُّهٗ وَيَرْضَاهُ- لَمَّا قَطَعَ مَنَازِلَ السُّلُوكِ وَعَرَجَ مَعَارِجَ الْجَذْبَةِ وَ وَصَلَ اِلٰى دَرَجَةِ الْوَلَايَةِ بَعْدَ اَنْ حَصَلَ لَهٗ اِنْدِرَاجُ النِّهَايَةِ فِى الْبِدَايَةِ

اَجَزْتُ لَهٗ لِتَعْلِیْمِ طَرِیْقَةِ الْمَشَائِخِ النَّقْشَبَنْدِیَةِ- قَدَّسَ اللّٰهُ اَسْرَارَهُمْ- لِلطَّالِبِیْنَ الْمُسْتَرْشِدِیْنَ وَالْمُرِیْدِیْنَ الْمُخْلِصِیْنَ بَعْدَ اسْتِخَارَةٍ وَّحُصُوْلِ الْاِذْنِ مِنَ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ؛ وَالْمَسْؤُوْلُ مِنَ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ اَنْ یَّعْصِمَهٗ عَمَّا لَایَلِیْقُ وَ یَحْفَظَهٗ عَمَّا لَایَنْبَغِیْ وَ اَنْ یُّثَبِّتَهٗ عَلٰی مُتَابَعَةِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْهِ وَ عَلَیْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِیْمَاتُ.‘‘

مشائخ طریقت کا طریقہ تھا کہ خلافت کے وقت خرقہ بھی دیا جاتا تھا۔ شیخ حمیدؒ نے عرض کیا کہ مجھ کو بجائے خرقہ کے حضرت کے پاؤں کا جوتا کافی ہے۔ حضرت مجددؒ نے ان کی اس درخواست کو بھی قبول فرمایا اور ایک پاؤں کی جوتی عنایت فرمادی۔ شیخ نے اس ’’کفش مبارک‘‘ میں جو کچھ دولت پائی وہ قیصر و کسریٰ کو کہاں نصیب ہوئی۔

اگر خاکے ازیں کو بر سر آید ☆ مرا بہتر ز چندیں افسر آید

چونکہ آپ کا وطن ’’صوبہ بنگال‘‘ میں تھا اس لیے بوجہ بُعد مسافت دوبارہ آستان مجددیؒ پر حاضری کا موقع نہ مل سکا۔ اس نواح کی مخلوق نے آپ ہی سے مجددی فیوض و برکات کے خزانے حاصل کیے اور طالبین حق نے آپ ہی کی رہنمائی میں معرفت و یقین کی شاہراہ پر چل کر منزل مقصود کا پتہ لگایا۔ ’’منگل کوٹ‘‘ ضلع بردوان میں آپ کا مزار مبارک ہے۔

ز بنگالہ چہ بر گویند کہ مولانا حمید او! ☆ بپاپوش جنابش آمدہ مقبول ربانی
زہے پاپوش پاک او کہ چوں خاکشفا کردہ ☆ شفائے ظاہر و باطن بخلق اللہ ارزانی
بہ منگل کوٹ او بنگر کہ گلزارِ ارم بودہ ☆ در و دیوار او اکنوں نہادہ سر بو یرانی
بلے کس گنج زر پنہاں نیابد جز بو یرانی ☆ بلے کس آب حیواں راندیدہ جز بظلمانی

(رشیدی شہزاد پوری مینپوری)

شیخ مزملؒ: آپ حضرت مجددؒ کے قدیم اور مقبول ترین مریدوں میں سے ہیں۔ سفر و حضر

میں اکثر حضرت مجددؒ کے ساتھ رہتے۔ حسن اخلاق و مکارم اوصاف میں یگانہ اور انکسار و ایثار میں منفرد تھے۔ حضرتؒ کی تربیت سے ان کو جو کمالات حاصل ہوئے ان کا تذکرہ حضرت مجددؒ نے اپنے بعض ان مکاتیب میں کیا ہے جو اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ کیے ہیں۔ سالہا سال فیض صحبت سے مستفیض ہونے کے بعد تعلیم طریقت کے مجاز ہوئے۔ آپ کی رفعت مرتبہ کا اندازہ حضرت مجددؒ کے اس مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو ایک مخلص کے نام بھیجا گیا ہے اور جس میں تحریر فرمایا گیا ہے:

"صحبت میاں مزمل شمارا مغتنم است و امثال ایں عزیز الوجود اعز من کبریت الاحمر۔ ترجمہ: میاں مزمل کی صحبت کو غنیمت سمجھو اس قسم کے لوگ کبریت احمر سے بھی زیادہ نادر و نایاب ہیں۔"

آپ نے ۱۰۲۶ھ میں اپنے مرشد کی حیات ہی میں سفر آخرت اختیار کیا۔ حضرتؒ کو آپ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا اور ان کی روح کو دعائے مغفرت و ایصال ثواب سے شادکام فرمایا۔

شیخ طاہر بدخشیؒ: آپ شروع میں فوج میں ملازم تھے، ایک دفعہ فوج کسی قلعہ کو فتح کرنے کے لیے گئی، آپ بھی اس میں موجود تھے، اثنائے سفر میں ایک رات آپ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت منامی سے مشرف ہوئے اور دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر و دیگر خلفاء و اصحاب رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں۔ اور آپؐ شیخ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اس سفر کے ختم ہونے کے بعد تو ان لوگوں (فوجیوں) سے الگ ہو جا اور فقر و تجرید کی زندگی اختیا کر۔ اسی عالم خواب میں آپ نے دیکھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرتؐ کے ایماء سے ان کو خرقہ پہنایا، جب اس مبارک خواب سے بیدار ہوئے تو اس ارشاد نبویؐ کی تعمیل کے لیے اپنے آپ کو بے قرار پایا۔ چنانچہ بعد مراجعت فوج اثنائے راہ ہی میں ایک مقام پر اپنی سواری سے اُتر پڑے اور ایسے غائب ہوئے کہ ساتھیوں نے ہر چند

تلاش کیا مگر نہ ملے وہاں سے غائب ہو کر آپ ایک دہقان سے ملے اور اس سے اپنے لباس کے عوض میں ایک ٹاٹ لے کر پہن لیا اور اطراف و جوانب کے مشائخ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ چونکہ آپ نے اپنے گھر والوں کو اپنے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی تھی اور کسی کو خبر نہ تھی کہ آپ کس حال میں ہیں؛ اس لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ ایک بار گھر ہو آئیں اور متعلقین کو صورت حال کی اطلاع دیں تا کہ ان کو تشویش نہ رہے۔ چنانچہ آپ گھر آئے اور اپنے عزائم کا صاف اظہار کر دیا۔ بیوی سے بھی کہہ دیا کہ میں فقر کی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا ہے کہ تمھیں کوئی تکلیف پہنچے میں اس کے لیے بالکل تیار ہوں کہ تم مجھ سے آزادی حاصل کرلو۔ نیک بخت بیوی نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی آپ سے وابستہ کر چکی ہوں جو زندگی کا طریقہ آپ کو پسند ہے وہی مجھے پسند ہے۔ چنانچہ وہ بالکل بے سروسامانی کی حالت میں شوہر کے ساتھ ہولیں۔

اس کے بعد آپ مرشد کامل کی تلاش میں گھومتے رہے ایک شیخ وقت کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے فرمایا کہ تم نقشبندی معلوم ہوتے ہو اور دہلی ولاہور کی طرف اشارہ کیا۔

چنانچہ آپ ہندوستان کے لیے چل کھڑے ہوئے، اس زمانہ میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کا عام شہرہ تھا۔ اس لیے دہلی کا قصد کر لیا لیکن سوء اتفاق کہ ان کے دہلی پہنچنے کے چند دن پہلے حضرت خواجہ صاحبؒ وصال فرما چکے تھے۔ ہادیٔ توفیق نے آپ کو حضرت خواجہ صاحبؒ کے جانشین حقیقی (حضرت مجددؒ) کی خدمت میں پہنچا دیا۔ چنانچہ آپ حضرت مجددؒ سے بیعت ہوئے اور کافی عرصہ خانقاہ سرہند میں قیام کر کے فیوض و برکات حاصل کیے۔

آپ کے خصائص عظمٰی میں سے یہ ہے کہ ایک مدت تک خلوت وجلوت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت و مشاہدہ سے مشرف ہوتے رہے۔ گویا کہ آپ کو یک گونہ حضوری کا درجہ حاصل تھا۔ مولانا طاہرؒ چونکہ ترک اور سادہ مزاج بزرگ تھے اس لیے اپنے احوال و مکاشفات کو اس انداز میں بیان فرماتے تھے کہ حضرت کے ہونٹوں پر بے اختیار

مسکراہٹ آجاتی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ حضرت مجددؒ معارف بیان فرمارہے ہیں اور یہ ان کو سن کر "آرے" اور "بلے" کہتے جاتے ہیں اور سر ہلاتے جاتے ہیں۔ حضرت مجددؒ خوش طبعی کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اسرار و معارف مولانا طاہر پر وارد ہوئے ہیں اور میں ان کا ترجمان ہوں۔"

حضرت مجددؒ نے ان کو تعلیم طریقت کی اجازت دینے کے بعد "جون پور" روانہ کیا، وہاں پہنچ کر آپ نے خدا معلوم کن احوال کے ماتحت گفتگو اور نشست و برخاست میں ایسا طریقہ اختیار کیا جس کی وجہ سے لوگوں کی رجوعات کم ہوگئی۔ جس زمانہ میں حضرت مجددؒ اجمیر شریف تھے آپ نے ایک مکتوب حضرت کی خدمت میں تحریر کیا جس میں یہ بھی مرقوم تھا کہ طالبین میری طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ حضرت نے اس کو پڑھ کر فرمایا:

"عجب مردے سادہ دل است ملاک امر محافظۃ احوال و فکر کار و غم ایمان و مآل خود است دریں ضمن ہر کرا حق سبحانہ برساند و بتعلیم و تربیت او مامور گرداند حسب الامر خالصاً لوجہ اللہ بداں باید پرداخت و نیز برائے انجذاب دلہائے طلاب وضع کہ ملامت را آنجا راہ نبود اختیار باید نمود۔ ترجمہ: یہ عجیب سیدھے آدمی ہیں یہ خبر نہیں کہ اصل کام احوال کی محافظت، اپنے کام کی نگہداشت، ایمان کی فکر اور انجام کا خیال کرنا ہے اس ضمن میں جس کسی شخص کو بھی خداوند کریم پہنچادے اور اس کی تعلیم و تربیت پر مامور کردے، خالصاً لوجہ اللہ اس میں مشغول رہے نیز اہل طلب کے دلوں کی کشش کے لیے ایسی وضع جس میں ملامتیہ کے طرز کو کچھ بھی دخل ہو اختیار نہ کرنی چاہیے۔"

مولانا یوسف سمرقندیؒ: آپ بھی اولاً حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کے مریدین میں سے تھے اور ان سے بہرۂ وافر حاصل کیا تھا، خلیق اور بے تکلفانہ زندگی بسر کرنے والے بزرگ

تھے۔حضرت خواجہ صاحبؒ کے وصال کے بعد ’’سرہند‘‘ آ گئے اور حضرت مجددؒ کے آستانے پر رہنے لگے۔کچھ عرصہ وہاں رہ کر برکات نفوسِ مجددیہ سے مستفیض ہوئے اور روحانی ترقی حاصل کی لیکن بقضائے الٰہی درمیان سلوک ہی میں پیک اجل سے ہم آغوش ہو گئے، بوقت نزع حضرت مجددؒ ان کے سرہانے تشریف لائے۔آپ نے بہزار حسرت عرض کیا! ع

دم واپسیں بر سر راہ ہے

اب کوئی ایسی نظر و توجہ فرما دیجیے جس کی برکت سے ’’مقصد اعلیٰ‘‘ حاصل ہو جائے۔

دم اخیر ہے حضرت ذرا نگاہ ملے ☆ کچھ اس غریب مسافر کو زاد راہ ملے

حضرت مجددؒ ان کی طرف متوجہ ہوئے، کچھ دیر کے بعد اپنا سر اُٹھایا اور فرمایا ہاں مولانا یوسف کہو کیا حال ہے؟ عرض کیا الحمدللہ دل جس چیز کا طالب تھا وہ حضرت کی توجہ سے آشکار ہو گئی۔اس کے بعد آخری ہچکی لے کر جاں بحق تسلیم ہو گئے ع

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

مولانا احمد برکیؒ: آپ ’’برک‘‘ کے رہنے والے اور وہاں کے علماء میں سے تھے مولانا کا ایک ہم وطن دوست تاجر ہندوستان سے اپنے وطن واپس آیا وہ ہندوستان میں حضرت مجددؒ سے بھی شرف ملاقات حاصل کر چکا تھا اور آپؒ کے مکاتیب کا کچھ حصہ بھی اپنے ہمراہ لیتا گیا تھا۔مولانا نے جب ان مکتوبات کا مطالعہ کیا اور ان سے حضرت مجددؒ کے کمالات باطنی کا اندازہ لگایا تو جذبۂ دل نے سرہند چلنے پر آمادہ کیا۔وہاں پہنچ کر حضرت مجددؒ کی عنایات سے سرفراز ہوئے اور اخلاص و آداب کے ساتھ شیخ کی خدمت میں رہے۔عنایات خداوندی اور حضرت کی برکت سے ایک ہی ہفتہ میں درجہ کمال و اکمال پر پہنچ گئے اور تعلیم طریقت میں مجاز ہو کر وطن جانے کی اجازت حاصل کی۔وطن پہنچ کر حسب الحکم کار طریقت میں مشغول ہوئے۔اپنے مریدوں کے احوال بذریعہ مکاتیب خدمت عالی میں پہنچا کر جواب و خطاب سے سرفراز ہوتے رہتے تھے۔ایک مکتوب میں حضرتؒ نے آپ کو تحریر فرمایا:

''روزے توجہے بحال شما نمودہ آمد دید کہ مردم آں نواح بجانب شما می دویدند والتجا بشما می آرند معلوم شد کہ شمارا مدار آں زمین ساختہ اند و مردم آں حدود در ابشما مربوط داشتہ لِلّٰہِ الۡحَمۡدُ وَالۡمِنَّۃُ عَلٰی ذٰلِکَ.

ترجمہ: ایک دن تمہاری طرف توجہ کی دیکھا کہ اس طرف کے آدمی تمہاری طرف دوڑتے ہیں اور تمہارے سامنے التماس (فیض) کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تم کو اس علاقہ کا قطب بنایا گیا اور اس حدود کے لوگوں کو تم سے متعلق کیا گیا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

حضرت مجددؒ نے ایک مکتوب مولانا شیخ یوسفؒ برکی کو لکھا ہے اس میں بھی آپ کی تعریف فرمائی ہے۔ آپ نے ۱۰۲۶ھ میں وفات پائی۔ حضرتؒ نے دعائے مغفرت سے آپ کی روح کو شاد کام کیا، دیکھا گیا کہ جب کبھی آپ کا تذکرہ مجلس مبارک میں ہوتا تھا حضرت ان کی تعریف فرماتے تھے اور لطف وعنایت کے ساتھ یاد فرمایا کرتے تھے۔ نیز مولانا کے مریدین کو بھی تحریر فرماتے تھے کہ مولاناؒ کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ مولاناؒ کا وجود فی زماننا مسلمانوں کے لیے آیات حق میں سے ایک آیت (نشانی) اور رحمت ہائے خداوندی میں سے ایک رحمت تھا۔

مولانا محمد صالح کولابیؒ: آپ حضرت مجددؒ کے قدیم الایام مریدین میں سے تھے، منکسر المزاج اور خاموش طبیعت تھے، اپنی روحانی سرگزشت اپنی ہی زبانی اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''میرے اندر جب طلب معرفت کا جذبہ پیدا ہوا، میں اس زمانے کے اکثر مشائخ کی (جو قریب قریب مقامات پر رہتے تھے) خدمت میں رہا لیکن کسی سے کوئی کیفیت حاصل نہیں ہوئی۔ حسن اتفاق سے ایک جمعہ کو ''آگرہ'' کی جامع مسجد میں حضرتؒ کو دیکھا دیکھتے ہی میرا

دل حضرتؒ کی طرف کھنچنے لگا ۔

آں دل کہ رم نمودہ از خوب رو جواناں ☆ دیرینہ سال پیر بروش بیک نگاہے

جامع مسجد سے حضرتؒ کی قیام گاہ پر پہنچ کر تعلیم ذکر کی درخواست کی وہ قبول ہوئی اس کے بعد سالہا سال خدمت اقدس میں رہا لیکن پستی استعداد کے باعث کوئی کامیابی محسوس نہیں کرتا تھا۔اپنے پیر بھائیوں کو دیکھتا تھا کہ وہ منازل ترقی پر گامزن ہیں۔

اپنی اس بدنصیبی پر حیران وگریاں رہتا تھا یہاں تک کہ رمضان کا مبارک مہینہ اپنی مقدس ساعتیں لے کر آ گیا۔جب حضرتؒ معتکف ہوئے تو اس اعتکاف میں ''طشت وآفتابہ'' کی خدمت میرے سپرد ہوئی۔ایک رات حضرتؒ نے اپنے متبرک ہاتھ کو دھویا میں اس تمام دھوون کو پی گیا۔اس پانی کا پینا تھا اور حالات کا وارد ہونا۔''

مولانا کولابیؒ جب حضرت مجددؒ کی توجہ سے درجۂ کمال کو پہنچ گئے تو اجازت تعلیم سے ممتاز ہوئے اور طالبان معرفت کی ایک جماعت کو آپ کا روحانی فیض پہنچا۔حضرت مجددؒ کو بارہا آپ کی تعریف فرماتے سنا گیا ہے۔ایک دن حضرتؒ نے آپ کے متعلق فرمایا:

''مولانا صالح از سیر صفات وتجلیات صفاتیہ بہرہ تمام گرفتہ۔

ترجمہ: مولانا محمد صالح نے سیر صفات وتجلیات صفاتیہ سے پورا حصہ حاصل کر لیا ہے۔''

آپ نے مخدوم زادوں کی فرمائش پر ایک رسالہ لکھا تھا جس میں حضرت مجددؒ کے دن اور رات کے تمام معمولات کو جمع کیا،اس میں لکھتے ہیں کہ جب میں نے حضرتؒ سے معمولات کے جمع کرنے کی اجازت طلب کی تو ارشاد فرمایا کہ پیروی کے قابل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی عمل ہے۔کتب حدیث کی طرف رجوع کرو اور وہاں سے

معمولات مسنونہ اخذ کرو، عرض کیا گیا کہ حضرتؒ کا عمل بھی تو سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت کے مطابق ہے۔ اس پر یہ ارشاد فرمایا:

''چناں کنند اما نیک نیک ملاحظہ نمایند کہ ہر چہ موافق سنت باشد قولے وفعلے آنرا در عمل آرید و ہر چہ نہ چنانست موقوف دارید۔ ترجمہ: اچھا جمع کرو لیکن اس بات کا اچھی طرح لحاظ رکھنا کہ میرا جو قول وفعل موافق سنت ہو اس پر عمل کرنا اور جو ایسا نہ ہو اس کو موقوف رکھنا۔''

۱۰۳۸ھ میں مولانا کا وصال ہوا۔

مولانا محمد صدیق کشمیؒ: آپ کشم (علاقۂ بدخشاں) کے رہنے والے ہیں۔ ایام جوانی میں ہندوستان تشریف لائے چونکہ شعر و شاعری میں دستگاہ رکھتے تھے اس لیے محب الفقرا والشعرا عبدالرحیم خان خاناں کی صحبت اختیار کی۔ اسی عرصہ میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ سے بیعت ہو کر سلسلۂ نقشبندیہ میں منسلک ہو گئے لیکن جوش جوانی کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کے مشغلے نے آپ کو حضرت خواجہؒ کی زندگی میں ترقی روحانی کا موقع نہیں دیا۔ حضرت خواجہؒ کے وصال کے بعد آپ حضرت مجددؒ کی خدمت میں آئے اور کامیاب ہوئے۔ خود حضرت مجددؒ ایک مکتوب مبارک میں مولانا محمد صالح کولابیؒ کو آپ کے ترقی یافتہ احوال کی اطلاع دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

''مولانا محمد صدیق دریں ایام بعنایت اللہ سبحانہ بولایت خاصہ مشرف گشتند وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَاءُ۔ ترجمہ: مولانا محمد صدیق ان دنوں اللہ سبحانہ کی عنایت سے ولایت خاصہ سے مشرف ہو گئے، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے۔''

مولانا ۱۰۳۲ھ میں اپنے متعلقین کی ایک جماعت کے ساتھ ''زیارت حرمین شریفین'' سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں ''دہلی'' آئے۔ اس سفر میں چونکہ وابستگان کثیر

تعداد میں تھے اور زادراہ تھوڑا تھا اس لیے فقر و فاقہ کی بڑی بڑی مشقتیں جھیلیں۔ آپ ہی نے ''مبداء معاد'' کو حضرت مجددؒ کی بیاض خاص سے نقل فرما کر جمع کیا ہے۔ مکتوبات شریف آپ کے نام بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ آپ کو حضرت مجددؒ سے بہت کچھ اخلاص و عشق تھا۔

جس زمانہ میں آپ حجاز میں تھے حضرتؒ نے مولانا محمد ہاشم کشمیؒ سے فرمایا کہ:

> ''اس وقت میں بعض قدیم مریدین کے احوال کی طرف متوجہ تھا۔
> مولانا محمد صدیق نظر کشفی (میں) کامل محبت و اخلاص کے ساتھ
> ہماری طرف متوجہ معلوم ہوئے۔''

آپؒ کو حضرت مجددؒ کے علوم و معارف سے کافی مناسبت تھی۔ آپ نے ''مثنوی مولانا رومیؒ'' کے وزن پر ایک مثنوی لکھی ہے جس میں ''ماچین'' کے شیشہ گر کی حکایت نظم کی ہے اور وہ حق الیقین کی بہترین تعبیر ہے۔ ایک دوسری مثنوی بوزن ''خسرو شیریں'' لکھی ہے۔

شیخ عبدالحیؒ: آپ حصار شادماں (علاقہ اصفہان) کے باشندے مسکین طبع اور خموشی پسند بزرگ تھے۔ سالہا سال تک آستان مجددی پر دُرہائے فیوض سے دامن مراد کو بھرا اور توجہ مرشد کی برکت سے ترقیات سے ہم آغوش ہوئے۔ بہت سے اسرار و معارف کو زبان فیض ترجمان سے سنا تھا بلکہ ان احوال سے بھی کچھ وافر حصہ مبداء فیاض سے پایا تھا جن کی ترجمانی حضرت مجددؒ نے مکتوبات کی صورت میں فرمائی ہے۔

حضرت مخدوم زادہ خواجہ محمد معصوم نقشبندیؒ کی فرمائش پر مکتوبات کا ''دفتر ثانی'' آپ ہی نے جمع فرمایا ہے۔ حضرت مجددؒ کے بہت سے مکتوبات آپ کے نام بھی ہیں۔ حضرت مجددؒ نے آپ کو تعلیم طریقت کی اجازت دے کر شہر ''پٹنہ'' روانہ فرمایا۔ شہر کے کنارے شیخ نور محمد (جن کا ذکر کیا جا چکا ہے) طالبان حق کے افاضہ میں مشغول تھے اور شہر کے درمیان میں شیخ عبدالحیؒ تشنگانِ طریقت کی پیاس بجھا رہے تھے۔ حضرت مجددؒ ایک مخلص کو تحریر فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

''وجود ایں دو عزیز (یعنی مولانائے مذکور و شیخ نور محمد) درآں یک شہر چوں قِر ان السعدین است۔ ترجمہ: مولانا عبدالحیؒ اور شیخ نور محمد کے وجود ایک شہر (پٹنہ) میں قِر ان السعدین کی مانند ہیں۔''

حضرت مجددؒ نے براہ راست شیخ نور محمدؒ کو ایک مکتوب پٹنہ بھیجا اور اس میں شیخ عبدالحیؒ کے مقام و حال کی اطلاع ان الفاظ میں فرمائی ہے:

''شیخ عبدالحیؒ ہم شہری شما است و بجوار شما آمدہ است نسخۂ علوم و معارف غریبہ است و چیز ہائے ضروریہ ایں راہ نزد او مودع است ملاقات او یارانِ دور افتادہ را مغتنم است کہ نو آمدہ ست و چیز ہائے نو آوردہ است۔ ترجمہ: شیخ عبدالحیؒ تمہارے ہم شہری ہیں اور تمہارے پڑوس میں آئے ہیں یہ علوم و معارف کی ''کتاب ناطق'' ہیں۔ اور راہ سلوک کی ضروری چیزیں ان کو سونپی گئی ہیں۔ ان کی ملاقات دور افتادہ مخلصین کے لیے بسا غنیمت ہے کیونکہ یہ نئے نئے آئے ہیں اور تازہ تازہ معارف لائے ہیں۔''

آپ نے ۱۰۷۰ھ میں وفات پائی[1]۔

مولانا یار محمد[2] القدیم الطالقانیؒ: آپ حضرت مجددؒ کے قدیم خادم ہیں۔ قائم اللیل اور صائم النہار کثیر السکوت والمراقبہ تھے۔ بزرگان نقشبندؒ کی بعض خصوصیات آپ کی پیشانی سے ظاہر ہوتی تھیں۔ خوش سیرتی کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی تھے۔ صاحب ''زبدۃ المقامات'' تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ میں اپنی خوبصورتی اور اس داڑھی کا بہت ''شکر گزار'' ہوں کہ جب کبھی بازار وغیرہ سے گزرتا ہوں تو

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۱۲۳ [2] آپ کے بعد آپ کے ایک اور ہم نام (یار محمد) جامع مکاتیب دفتر اول حضرت مجددؒ کی خدمت میں آئے۔ اس لیے ثانی الذکر کو جدید اور آپ کو قدیم کہتے ہیں۔ (فریدی)

مجھ کو دیکھ کر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے لگتے ہیں۔

آپ نے فقر و فاقہ کی حالت میں ''بیت الحرام'' و ''روضۂ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام'' کی زیارت کے لیے حجاز کا سفر اختیار کیا اور اپنی روح کو جذب و کیف اور نشاط و انبساط کی دعوت دی۔

مولانا قاسم علیؒ: آپ بھی حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کے ان اصحاب میں سے ہیں جن کی تربیت حضرت مجددؒ کے حوالہ ہوئی تھی۔ آپ خانقاہ مجددی میں رہ کر دریائے معرفت سے گوہر مقصود حاصل کرتے رہے۔ خود حضرت مجددؒ نے حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کو آپ کی روحانی ترقیات کی اطلاع ایک مکتوب کے ذریعہ کی ہے اور مزید ترقی کی امید ظاہر فرمائی ہے۔ اس سے زیادہ حالات دریافت نہ ہو سکے۔

شیخ حسن برکیؒ: آپ مولانا احمد برکیؒ کے تلامذہ میں سے تھے حضرت مجددؒ کی بارگاہ میں پہنچ کر ذکر و مراقبہ سے مشرف ہوئے اور عنایت خاصہ سے بہرہ وافر حاصل کر کے وطن مالوف واپس ہو گئے۔ وہاں مولانا احمدؒ کی صحبت میں رہنے لگے۔ حضرت مجددؒ نے مولانا احمدؒ کے نام ایک مکتوب لکھا اس میں تحریر فرمایا:

> ''شیخ حسن از ارکان دولت شما است اگر فرضاً شما را میل سفرے شود نائب مناب شما اوست۔ ترجمہ: شیخ حسن تمہارے رکن اور ممد و معاون ہیں تم کو بالفرض اگر کسی سفر پر جانا ہو تو یہ تمہارے لیے صحیح قائم مقام ہیں۔''

اتفاق ایسا ہوا کہ مکتوب پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مولانا احمد نے سفر آخرت اختیار فرمایا جب یہ خبر حضرت کو پہنچی تو آپ نے مولانا کے مریدوں کو یہ ہدایت تحریر فرمائی:

> ''مرحوم کے طور و طریقہ کا خیال رکھا جائے اور ذکر و حلقہ کی مشغولیت میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ میں نے اس سے پہلے بر سبیل اتفاق لکھا

تھا کہ اگر مولانا کوئی سفر اختیار کریں تو شیخ حسن ان کے قائم مقام ہیں۔ قضارا وہ سفر سفرِ آخرت ہو گیا۔ اب مکرر توجہ دلاتا ہوں کہ شیخ حسن کی متابعت مولانا (احمدؒ) کے کسی مرید پر گراں نہ ہو..... (بہر حال) اطاعت لازمی ہے۔ ویسے بھی شیخ حسن کا طریقہ مولانا (احمدؒ) کے طریقہ سے بہت کچھ مناسبت رکھتا ہے۔ مولانا (احمدؒ) نے آخر میں جو نسبت اس طرف سے حاصل کی تھی شیخ حسن اس نسبت میں شریک ہیں۔ مولانا کے دوسرے مریدین کو (ہر چند کہ وہ صاحب کشف و شہود ہوں) اس نسبت سے بہت کم حصہ ملا ہے۔"

آخر کار مولانا احمدؒ کے مریدوں کی سرحلقگی شیخ حسنؒ کے لیے تجویز ہوگئی اور آپ افادہ و افاضہ میں مشغول ہوئے۔ آپ نے اپنے شیخ (حضرت مجددؒ) اور اپنے استاد (مولانا احمدؒ) کا شیوہ اختیار کیا اور مراقبہ، مجاہدہ اور رفع بدعت میں مضبوطی سے کام کیا، اور کامیاب و فلاحیاب ہوئے۔ حضرت مجددؒ کے پاس آپ کے جو خطوط آئے تھے ان سے آپ کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک عریضہ میں بعض اصطلاحات صوفیہ پر کچھ اعتراضات وارد کیے تھے اور آخر میں لکھا تھا کہ وہ معارف جو اس "بے بضاعت" کو تسکین دیتے ہیں معارف شرعیہ ہیں اور شریعت کا ہر حکم ایک ایسے دروازہ کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ہو کر "شہر مقصود" تک پہنچ سکتے ہیں۔ حضرت مجددؒ کو اس مکتوب کے اس حصہ پر جس میں اصطلاحات صوفیہ پر اعتراضات تھے سخت ناگواری ہوئی اور اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"خبردار! بے سمجھی سے ایسی باتیں آئندہ نہ کرنا اور غیرت خداوندی سے ڈرتے رہنا شاید تم کو نقلی و جعلی صوفیوں نے "برانگیختہ" کر دیا ہوگا۔ مگر بزرگوں کا خیال بھی تو رکھنا چاہیے۔ مدعیان طریقت کی بدعات پر نکتہ چینی کرو تو اس کی گنجائش ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن

جو چیزیں صوفیہ میں مقرر اور ضروری ہیں ان پر کلام کرنا سخت
نامناسب بات ہے۔"

آخر میں معارف شرعیہ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس کو مطالعہ فرما کر حضرت مجددؒ خوش ہوئے اور اس کے متعلق اسی مکتوب میں یہ تحریر فرمایا:

"ایں رابرفنا بسیار اصل است و بسیار عالی و امید داری بحسن مطالعہ
ایں معرفت محظوظ ساخت و نہ ملائمت اول مکتوب راز ائل گردانید حق
سبحانہ ازیں راہ بمقصود رسانند۔ ترجمہ: یہ چیز اصل اور عالی ہے اس
معرفت کے حسن مطالعہ کی امید نے بہت مسرور کیا اور مکتوب کے
ابتدائی حصہ کی نامناسب تحریر کے اثر کو زائل کر دیا۔ حق تعالیٰ اسی
راستہ سے مقصود تک پہنچائے۔"

مولانا شیخ عبدالہادی فاروقی بدایونیؒ: آپ بدایوں کے فاروقی النسب بزرگ تھے بعض کتب میں آپ کا اسم مبارک شیخ عبدالہادی منکن[۱] لکھا ہوا ملا۔

آپ بھی حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کے ان مریدین میں سے ہیں جن کی تربیت باطنی حضرت مجددؒ سے متعلق ہوئی تھی آپ نے بھی حضرتؒ کی خدمت کر کے نظرِ عنایت عالیہ سے بہرہ وافر حاصل کیا۔ انکسار و افتقار آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ حضرتؒ نے جو مکاتیب اپنے پیر بزرگوار کو تحریر فرمائے ہیں ان میں منجملہ دیگر مسترشدین کی ترقیات کے آپ کی ترقی کا بھی ذکر فرمایا ہے...... مدت تک خدمت بابرکت سے مستفیض ہونے اور ترقیات و کمالات کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد آپ تعلیم طریقت کی اجازت سے ممتاز و مشرف ہوئے۔ آپ کا مزار شریف "مدینۃ الاولیاء" بدایوں میں ہے۔ تذکرۃ الواصلین

---

[۱] بدایوں کے شیوخ فاروقی دو فرقوں میں منقسم تھے ایک منکن کے نام سے اور دوسرا برپتی کے نام سے موسوم تھا۔ شیخ عبدالہادیؒ فرقہ اول سے تعلق رکھتے تھے۔ تذکرۃ الواصلین ص ۱۷۸ مؤلفہ مولوی شیخ رضی الدین صاحب بسمل صدیقی فرشوری بدایونی۔ (فریدی)

کے مصنف نے بدایوں کے شہداء و اولیاء کے بہت کچھ حالات بہم پہنچائے ہیں۔ لیکن ان کے حالات کو اجمالی طریقہ سے لکھا ہے حتیٰ کہ تاریخ وفات بھی نہیں لکھی۔ انھوں نے آپ کے مختصر تذکرہ کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

مزار شریف آپ کا راقم کو معلوم نہیں کہ بدایوں میں کس مقام پر مدفون ہیں لیکن میاں اکرام اللہ محشر بدایونی ''روضۂ صفا'' میں لکھتے ہیں کہ قبر شریف بدایوں میں جانب مشرق ہے (تذکرۃ الواصلین ص ۱۷۸)

شیخ یوسف برکیؒ: اولاً آپ کو ایک درویش کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا اور مشرب ''توحید خیالی'' اختیار کیا۔ ایک رات عالم رویا میں آستان مجددیؒ کی طرف دلالت ہوئی۔ چنانچہ ایک شخص کے ہاتھ اپنے تمام حالات لکھ کر حضرت مجددؒ کی خدمت میں روانہ کیے۔ حضرتؒ نے ایک مکتوب میں جواباً تحریر فرمایا کہ:

> ''اس قسم کے احوال شروع شروع میں مبتدیوں پر طاری ہو جایا کرتے ہیں، ان کا کچھ اعتبار نہ کرو بلکہ ان کو دور کرنے کی کوشش کرو۔''

اس مکتوب میں وصل کی حقیقت اور دیگر حقائق بھی بیان فرمائے اور ہمت بلند کی ترغیب دی۔ اس کے بعد خوبیٔ تقدیر سے دربار فیض آثار میں حاضری کا موقع ملا اور بیعت ہوئے۔ کچھ عرصہ ''سرہند'' رہنے کے بعد اجازت تعلیم پا کر ''جالندھر'' میں سکونت اختیار فرمائی۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے وقفے سے سرہند تشریف لاتے رہتے تھے اور جدائی کے زمانہ میں زبان قلم سے عرض احوال کرتے رہتے اور جوابات سے سرفراز ہوتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ حضرتؒ کی خدمت میں حسب دستور پہنچے۔ وداع کے وقت دیکھا گیا کہ زار و قطار رو رہے ہیں اور زبان حال سے بتغیر قلیل عرفی کا یہ شعر پڑھ رہے ہیں ؎

---

[۱] بعد کو (آثار اولیاء شہر بدایوں ص ۴۶ مؤلفہ سید منظور علی منظور بدایونی کے مطالعہ سے) معلوم ہوا کہ تاریخ وصال ۹ر شعبان المعظم ۱۰۴۱ھ ہے اور مزار مبارک خرم شاہ کے تکیہ میں ہے۔ (فریدی)

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم ☆ ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ گریاں رفتم

حضرت مجددؒ نے ایک مکتوب میں آپ کو "مستعد" اور "صادق الاعتقاد" تحریر فرمایا ہے۔

سید محبّ اللہ مانک پوریؒ: آپؒ علوم دینیہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آغاز سلوک میں قدوۃ المشائخ شیخ محمد بن فضل برہانپوریؒ کی خدمت کی اور ایک مدت تک وہاں رہ کر اجازت وخلافت حاصل کی۔ اس کے بعد برہانپور ہی میں میر محمد نعمانؒ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے سلسلہ نقشبندیہ کا طریقۂ ذکر سیکھا۔ چونکہ میر صاحبؒ کی مجلس میں ہمیشہ حضرت مجددؒ کی تعریف وتوصیف ہوتی تھی اور مکتوبات شریفہ کا مذاکرہ ہوتا تھا اس لیے آپ کو حضرتؒ کی خدمت ورویت کا شوق غالب ہوا۔ چنانچہ بارگاہ مجددیؒ پر پہنچے اور وہاں مدتوں خوشہ چینیٔ فیوض کرتے رہے۔ بالآخر حضرت مجددؒ نے خلافت سے معزز فرما کر "مانک پور" روانہ فرمایا۔ حضرتؒ نے ان کے متعلق ایک مکتوب میں جو میر محمد نعمان صاحبؒ مذکور کے نام ہے یہ کلمات طیبات تحریر فرمائے ہیں:

> "سید محبّ اللہ بہ نسیاں ماسویٰ وبعض مقامات فنا رسید او را اجازت گونہ دادہ بہ مانک پور فرستادیم۔ ترجمہ: سید محبّ اللہ نسیاں ماسویٰ اور بعض درجات فنا پر پہنچ گئے ہیں اور ہم نے ان کو اجازت دے کر مانک پور روانہ کر دیا ہے۔"

مانک پور کچھ عرصہ رہنے کے بعد آپ نے اپنے اہل وطن کی شکایت لکھی کہ وہ اذیت پہنچاتے ہیں۔ حضرت مجددؒ نے ایک بار جواب میں صبر وتحمل کی تلقین فرمائی اور یہ شعر بھی تحریر فرمایا۔

ہر کہ عاشق شد اگر چہ نازنین عالم است ☆ نازنی کی کے راست آید بارمی باید کشید

لیکن جب آپ نے مانک پور سے منتقل ہونے کے لیے منت وسماجت کے

ساتھ اجازت چاہی تو حضرتؒ نے تحریر فرمایا کہ:

''آج کی رات ہم نے عالم کشف میں دیکھا کہ تمہارا سامان مانک پور سے الہ آباد منتقل کیا گیا ہے۔اب تم الہ آباد میں کوئی یکسوئی کی جگہ اختیار کرلو اور اپنے اوقات ذکر الٰہی جل سلطانہ میں بسر کرو۔''

کچھ طریقۂ ذکر کے متعلق تحریر فرما کر آخر میں یہ نصیحت فرمائی:

''تا توانید راہ تقلید را از دست ندہید کہ تقلید شیخ طریقت ثمرات دارد و درخلاف طریق او خطرہا است۔ترجمہ: جہاں تک ہو سکے تقلید کو ترک نہ کرنا کیونکہ شیخ طریقت کی تقلید ثمرات رکھتی ہے اور اس کے خلاف کرنے میں بہت سے خطرے درپیش ہوتے ہیں۔''

حاجی خضر افغانؒ: آپ حضرت مجددؒ کے مخصوص مرید وخلیفۂ مجاز تھے۔کثیر التعداد مخلوق نے آپ سے فیض سرمدی حاصل کیا۔آپ اکثر راتیں گریہ وزاری میں کاٹتے تھے۔ اور میر تقی میرؒ کے اس شعر کے مصداق تھے ؎

اک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے ایک درد سا دل میں ہوتا ہے
میں راتوں اُٹھ اُٹھ روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

آپ کے اوقات اذکار ونوافل اور اشغال سے معمور تھے۔''سرہند'' کے قریب ایک موضع میں سکونت اختیار کر لی تھی اور تھوڑے عرصے کے بعد سرہند آتے جاتے رہتے تھے۔

آپ کے مرتبے کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ حضرت مجددؒ نے ایک دفعہ اپنے بعض مریدین سے فرمایا کہ:

''میں نے ایک دن ابلیس لعین کو دیکھا اور اس سے دریافت کیا کہ میرے مریدین میں سے وہ کون شخص ہے جس پر تیری دسترس کمتر

ہے۔ ابلیس نے کہا حاجی خضر۔“

آپ نے حضرت مجددؒ سے ایک سال بعد غالباً ۱۰۳۵ھ میں دنیا کو خیر باد کہا۔

شیخ احمدؒ دیو بندیؒ: آپ ”دیو بند“ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ شروع شروع میں حضرت مجددؒ کے حلقۂ درس میں بھی ایک مدت تک رہ کر شرف تلمذ حاصل کر چکے تھے۔ اس کے بعد ”برہان پور“ چلے گئے اور وہاں پر شیخ محمد بن فضل اللہؒ سے بیعت ہوئے اور مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر خلافت حاصل کی اور ”آگرہ“ آئے۔ حضرت مجددؒ اس وقت آگرہ میں مقیم تھے۔ اس زریں موقع کو غنیمت جان کر صحبت اقدس سے سعادت اندوز ہوئے اور طریقہ عالیہ نقشبندیہ اختیار کیا اور حضرتؒ کی خدمت بابرکت میں رہے۔ جب حضرتؒ نے میر محمد نعمانؒ کو خلافت دے کر برہانپور رخصت کیا تو آپ کی روحانی تربیت بھی میر صاحبؒ کے سپرد فرمائی۔ میر صاحبؒ کی صحبت میں حضور و نسبت ”خواجگان نقشبندیہ“ کی دولت سے سرفراز ہوئے اور ایک خاص لذت محسوس کی۔ چنانچہ اسی طریقہ کے ذکر کا التزام کر لیا۔

ایک دفعہ مرشد سابق سے ملاقات ہوئی انھوں نے آپ سے دریافت فرمایا کہ ہم نے تم کو جو ذکر تعلیم کیا ہے اس میں اشتغال رکھتے ہو یا نہیں؟ آپ نے جواباً عرض کیا کہ میں نے میر محمد نعمان سے طریقہ خواجگان نقشبندیہ کا ذکر حاصل کر لیا ہے۔ اس میں لذت پاتا ہوں اور اسی میں مشغول ہوں۔ شیخ سابق چونکہ منصف مزاج اور حقانیت پسند تھے اس لیے تھوڑے سے تاثر کے بعد فرمایا:

---

[1] زبدۃ المقامات میں آپ کے تذکرہ کا عنوان ”شیخ احمد دیبنی“ ہے۔ اس کے بعد یہ عبارت ہے: ”دیبن موضعے است از مضافات سہارنپور میان دوآب۔“ زبدۃ المقامات کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مجددی نقشبندی دیو بندیؒ کے زیر مطالعہ رہ چکا ہے۔ اس میں منجملہ دیگر مفید حواشی کے لفظ دیبن پر یہ حاشیہ بھی مفتی صاحبؒ کے قلم سے تحریر ہے ”اکنوں نام آں قصبۂ دیو بند مشہور است کہ بہ برکات و توجہات حضرت ایشاں دار العلم گشتہ است و فخر ہندوستاں دریں صدی سیز دہم و چہار دہم مثل آں دار العلمے مسموع و مشہور نگشت۔ واللہ تعالیٰ اعلم (فریدی)

"کچھ مضائقہ نہیں مقصد تو فائدہ کا حاصل کرنا ہے۔حضوری کی دولت جس جگہ سے بھی بہم پہنچے اس کو لازم پکڑو۔"

میر صاحبؒ کے یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد حضرت مجددؒ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے۔الطاف بے پایاں سے نوازے گئے اور اجازت کی خلعت عنایت ہوئی۔آپ کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب بعد حصول اجازت دو طالبوں کو ذکر طریقت کی تعلیم دی وہ دونوں متاثر ہوئے اور ان سے احوال کا ظہور ہوا۔یہ کرشمہ دیکھ کر آپ خود محو حیرت ہو گئے اور حضرت مجددؒ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا اور اس میں لکھا کہ باوجودیکہ میں اپنے اندر کوئی حال محسوس نہیں کرتا لیکن یہ کیا بات کہ میں نے دو طالبوں کو تعلیم ذکر کی اور ان سے احوال ظاہر ہوئے؟ اسی کے ساتھ ذہول اور دوام آگاہی کے متعلق بھی دریافت کیا۔حضرت مجددؒ نے دونوں باتوں کا جواب عنایت فرمایا۔پہلے جز کے متعلق جواب دیتے ہوئے ان دونوں طالبوں کے احوال کو مولانا کے احوال کا عکس قرار دیا ہے جو کہ ان دونوں کے آئینہ استعداد میں ظاہر ہو گیا۔رہا اپنے احوال کا علم اس کے متعلق تحریر فرمایا کہ:

"مقصود حصول احوال ہے نہ کہ علم احوال،علم احوال ایک اور دولت ہے کسی جماعت کو علم احوال من جانب اللہ دیا جاتا ہے اور کسی کو نہیں بھی دیا جاتا۔"

دوسرے جز کے متعلق یہ ارقام فرمایا کہ:

"آگاہی سے مراد حضور باطنی ہے جو کہ علم حضوری سے مشابہ ہے،تم نے کبھی نہ سنا ہوگا کہ کوئی شخص کسی وقت اپنے نفس سے غافل ہو گیا ہو اور اسے اپنی نسبت ذہول رونما ہوا ہو۔غفلت و ذہول تو علم حصولی میں ممکن ہے۔"

آپ مدت تک آگرہ میں طالبین معرفت کے افادہ میں مشغول رہے۔

آپ کے ان دونوں مریدوں کے چہرے سے اکابر سلسلہ کی خصوصیات ہویدا اور جذبہ و بے خودی کی شان آشکارا تھی ۔ایک ''رئیس اعظم'' جو کہ آپ سے اخلاص مندی کا تعلق رکھتے تھے آپ کو ''بنگالہ[1]'' لے گئے ۔آپ نے اس علاقہ میں قبولیت عظیمہ حاصل کی اور طالبین معرفت کو خم خانہ توحید کے کیف آور و روح پرور جام پلائے اور ''سرمستان مے الست'' نے جھوم جھوم کر عرض کیا ؎

ساقیاں یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ ☆ جب تلک ساغر چلے ساغر چلے

شیخ کریم الدین باباحسن ابدالیؒ: آپ باباحسن ابدالی (جو کہ کابل کے علاقہ میں ایک مقام ہے) کے رہنے والے اور حضرت مجددؒ کے قدیم مرید تھے۔شروع شروع طلب حق میں سیاحی کی اور اسی سلسلے میں ''سرہند'' آئے۔حضرت مجددؒ کے پاس پہنچتے ہی آپ کا حال دگرگوں ہوگیا۔عنایت خاصہ سے مشرف اور تعلیم و ذکر و مراقبہ سے سرفراز کئے گئے ۔تھوڑے ہی عرصے میں کمال کو پہنچ کر اجازت تعلیم طریقت سے نوازے گئے اور اپنے وطن چلے گئے ۔اس علاقہ کے لوگ کثرت سے آپ کے دست حق پرست پر تائب ہو کر داخل سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ ہوئے ۔حضرت مجددؒ کے یہاں آپ کو بہت رسوخ حاصل تھا۔ جس زمانے میں حضرتؒ تنہائی اختیار فرماتے تھے کسی کی مجال نہیں تھی کہ ''خلوت گاہ'' میں پہنچے لیکن یہ آپ ہی کی خصوصیت تھی کہ حضرتؒ نے فرمادیا تھا کہ:

''شیخ اپنے مریدوں سمیت خلوت گاہ میں آئیں اور انھیں کوئی نہ روکے۔''

---

[1] آپ کی سنہ وفات اور مزید حالات نہ معلوم ہو سکے۔میں نے اپنے محترم جناب مولوی سید محبوب صاحب رضوی دیوبندی کو اس طرف توجہ دلائی ہے وہ ''مشاہیر دیوبند'' کے سلسلے میں جو تحقیق فرمارہے ہیں ان کے تذکرے کو بھی شاید مفصل لکھیں۔(فریدی)

سید محبوب رضوی دیوبندیؒ آپ دارالعلوم دیوبند کے محافظ خانہ کے ذمہ دار تھے۔اس کی تمام فائلوں کو قرینے سے رکھتے تھے۔آپ خود بھی صاحب قلم اور مصنف تھے۔تاریخ نگاری خاص موضوع تھا۔اس سلسلے کی تاریخ مشاہیر دیوبند، تاریخ دارالعلوم دیوبند اور مکتوبات نبویؐ معرکتہ الآرا ہیں۔ جو تاریخی تحقیق و کاوش کا اچھا نمونہ ہیں۔ ۲۵/مارچ ۱۹۷۹ء میں انتقال ہوا۔(محب الحق)

جس زمانہ میں حضرت مجددؒ لاہور میں تھے آپ اپنے مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے اور الطاف مرشد سے سرفراز ہو کر وطن واپس گئے۔ شیخ اسحاق نامی ایک فاضل نے جو کہ ''سندھ'' کے مقتداؤں میں سے تھے آپ سے بیعت کی اور اکیس روز متواتر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت منامی سے مشرف ہو کر رحمت للعالمین کے الطاف گونا گوں سے شاد کام ہوئے۔

مولانا عبدالواحد لاہوریؒ: آپ کو بھی حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ ہی نے تربیت باطنی کی غرض سے حضرت مجددؒ کے سپرد فرمایا تھا۔ آپ کثیر المراقبہ اور کثیر العبادۃ تھے۔ صاحب زبدۃ المقامات (مولانا محمد ہاشم کشمیؒ) تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن آپ مجھ سے دریافت فرمانے لگے: ''کیا جنت میں نماز ہوگی؟'' میں نے کہا نہیں، جنت میں نماز کہاں ہوگی، جنت تو جزائے اعمال کا محل ہے نہ کہ دارالعمل۔ آپ نے یہ جواب سن کر ایک ''آہ سرد بھری'' اور رونے لگے اور حسرت آمیز لہجے میں فرمایا: ''آہ! بے نماز کے جنت میں کیوں کر بسر ہوگی۔'' صاحب زبدۃ المقامات نے آپ کے تذکرہ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ایک دن آپ حضرت مجددؒ کو ایک عریضہ تحریر کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس پر میری نظر پڑی تو اس میں یہ لکھا ہوا پایا... کبھی کبھی نماز کے اندر حالت سجدہ میں ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ سجدے سے سر اُٹھانے کو دل نہیں چاہتا۔

مولانا امان اللہ لاہوریؒ: آپ بھی حضرت مجددؒ کے مریدان اجازت یافتہ میں سے ہیں۔ ۱۰۱۳ھ میں حج بیت اللہ کا شوق غالب ہوا۔ پیادہ پا، بغیر توشہ وزادراہ، سفر حجاز کو چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں حضرت مجددؒ کے اور خود آپ کے متوسلین واحباء نے چاہا کہ ان سے زاد وراحلہ قبول کر لیں لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ اور اسی بے سروسامانی کے ساتھ حجاز کو گئے۔

ان مذکورہ خلفاء کے علاوہ دیگر حضرات جو خلافت و اجازت یافتہ اور ارباب

ذوق واصحاب فضل تھے ان کے اسماء مبارکہ حسب ذیل ہیں:

مولانا امان اللہ فقیہ، شیخ محمد حری، شیخ داؤد ساکی، شیخ سلیم بنوری، شیخ نور محمد بہاری، شیخ حامد بہاری، صوفی قربان (قدیم)، مولانا صادق کابلی، مولانا محمد ہاشم خادم، شیخ زین العابدین تبریزی ثم المکی الشافعی، مولانا غازی گجراتی، صوفی قربان (جدید)، سید باقر سارنگ پوری، شیخ عبدالعزیز نجومی مغربی مالکی، شیخ احمد استنبولی حنفی، مولانا فرخ حسین، مولانا صفیر احمد، مولانا بدرالدین[1] سرہندی، مولانا حمید احمدی، حاجی حسین و شیخ عبدالرحیم برکی، مولانا عبدالمومن لاہوری، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی (التوفی ۱۰۶۸ھ) رحمھم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

حضرت کے مخلصین میں بعض وہ بھی تھے جو بظاہر اہل سپاہ لیکن بباطن اصحاب خانقاہ تھے اور ع

درویش صفت باش وکلاہ تتری دار

کے مصداق صحیح ۔ جیسے خواجہ محمد اشرف کابلی، مولانا حاجی خرکتی، مولانا عبدالغفور سمرقندی، حافظ محمود گجراتی، سلیم خاں لشکری۔ مکتوبات شریفہ کے مطالعہ سے ان حضرات کے بھی کمال ذوق وشوق کا حال معلوم ہوتا ہے۔ بعض تجار بھی حضرت سے مستفیض ہوئے اور وہ آیت " رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ[2]. " کے آئینہ دار تھے۔

یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ان چند خلفاء کا اجمالی تذکرہ ہے جن کے ناموں سے اہل سیر واقف ہیں۔ ان کے علاوہ بھی خدا معلوم کس قدر خلفاء ہوں گے جن کے حالات تو کیا اسماء بھی معلوم نہیں۔ جس مجسمۂ روحانیت و پیکر ہدایت اور "رگ فاروقیت" رکھنے والے بزرگ نے ہندوستان، افغانستان، بلخ و بخارا، غرض کہ عالم اسلامی کے

---

۱ آپ نے بھی اپنے پیرو مرشد کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "حضرات القدس" ہے۔

۲ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید وفروخت ذکر الٰہی سے غافل نہیں کرتی۔

بلا مبالغہ لاکھوں نفوس کو اپنی بے پناہ جد و جہد سے کلمۂ حق اور ذکر خدا کا سبق پڑھایا تھا۔ اس کے خلفاء کی فہرست اتنی مختصر نہیں ہو سکتی کہ ان کے اسماء و حالات چند اوراق میں سما سکیں۔ لا محالہ ان مذکورہ حضرات کے علاوہ دیگر ارباب جذب و کیف بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے ہوں گے۔ میرے اس قول کی تائید زبدۃ المقامات کے اس جملے سے بھی ہوتی ہے:

> ''و جمعے دیگر از اصحاب مقبل صاحبدل آنحضرت بفقر و انزو او خمولی چناں بودہ اند کہ اکثر خادمان آستان ہم از کاروبارے ایشاں آگاہ نیند۔ ترجمہ: ان خلفاء کے علاوہ بھی حضرتؒ کے بہت سے صاحبدل خلفاء ایسے ہیں جو زاویہ فقر اور گوشۂ گمنامی میں بسر کرتے ہیں اور ان سے اکثر خادمانِ آستانِ عالی بھی واقف و آگاہ نہیں ہیں۔''

میں نے سعادت اندوزی کا شرف حاصل کرنے کے لیے بزرگان دین کی اس محبت کے ساتھ جو بحمد اللہ میرے دل میں موجزن ہے۔ اس مختصر (لیکن ایک حد تک کافی) تذکرہ کو مرتب کیا ہے۔ مجھ سے اس میں بہت سی علمی و تحقیقی فروگذاشتیں ہوئی ہوں گی مگر ان سب کو ناظرین کے دامن عفو کے حوالے کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان بزرگوں نیز دیگر سلاسل کے اکابر کی محبت و متابعت نصیب کرے اور انھیں کے زمرے میں محشور فرمائے۔ (آمین)

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ ☆ لَعَلَّ اللهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحاً

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ.

مقالہ (۳)

آسمان علم وعرفاں کے دو درخشندہ ستارے[1]

(حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ اور حضرت شاہ محمد یعقوب محدث دہلوی مہاجر مکیؒ)

ابوسلیمان حضرت شاہ محمد اسحاقؒ اور حضرت شاہ محمد یعقوبؒ دونوں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے ہیں۔ اضافی عزت وعظمت کے ساتھ ساتھ ذاتی اوصاف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے اور بقول نواب صدیق حسن خاں مرحوم اُس پیشن گوئی کے مصداق تھے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کی تھی۔ اور جو ''قول الجلی'' (سوانح حضرت شاہ ولی اللہ مولفہ شاہ محمد عاشق پھلتیؒ) میں مندرج ہے، ان دونوں بھائیوں کے فیوض وبرکات آفاق گیر ہیں۔ خصوصاً اول الذکر نے جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی حیثیت سے ہند اور بیرون ہند میں اپنے لائق وفائق تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد چھوڑی جنھوں نے تدریس علم حدیث کی محفلیں مدتوں گرم رکھیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا تا آنکہ آج اسی سلسلے کی بدولت دیوبند، سہارنپور، مرادآباد اور امروہہ وغیرہ کی درسگاہیں علوم دینیہ خصوصاً علم حدیث کی صداؤں سے گونج رہی ہیں۔ آج کوئی مدرسہ اور تعلیمی ادارہ ایسا نہیں ہے جس میں علم حدیث پڑھایا جاتا ہو اور اس کا تعلق حضرت شاہ محمد اسحاق محدث

---

[1] یہ مقالہ ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

دہلویؒ کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے نہ ہو۔

۱۲۵۸ھ[1] میں ان دونوں بھائیوں نے ''مکہ معظمہ'' کو ہجرت فرمائی اور بالآخر ''جنت المعلیٰ'' میں یہ دونوں مدفون ہوئے۔

''احکام العیدین'' مؤلفہ نواب قطب الدین خاں دہلویؒ کے دیباچے میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی ہجرت کا نہایت موثر انداز میں ذکر ہے۔ اس کی زبان اگرچہ قدیم اُردو ہے مگر اس کے ہر ہر حرف سے بوئے محبت و اخلاص آ رہی ہے۔ یہ کتاب چونکہ کمیاب ہوگئی ہے اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی سنہ ہجرت میں بہت سے تذکرہ نویسوں نے غلطی کی ہے۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ اس دیباچہ کو تھوڑی سی تشریح کے ساتھ مضمون کی شکل میں شائع کرا دوں اس میں ہجرت کی صحیح تاریخ بھی دیگر تفاصیل کے ساتھ موجود ہے۔ بعد کو خیال ہوا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ اور ان کے بھائی شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ پر ایک مختصر مقالہ ہی چند معتبر تذکروں سے حالات اخذ کر کے مرتب کر دیا جائے۔

حکیم محمود احمد برکاتی مقیم لاہور نے ''شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان'' نامی کتاب میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کا ذکر کرتے ہوئے شروع میں جو چند جامع اور پُر مغز الفاظ تحریر فرمائے ہیں ان کو یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

> ''شاہ محمد اسحاق دہلویؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے بڑے نواسے خلیفہ اور جانشین تھے۔ خانوادۂ ولی اللہی کے آخری عظیم و جلیل رُکن، انیسویں صدی عیسوی کے بیشتر خدام حدیث نبویؐ کے شیخ تھے۔ شاہ ولی اللہ

---

[1] چنانچہ ترجمہ تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ پاکستان میں ص ۴۰۹ پر آپ کا سال ہجرت ۱۲۵۷ھ لکھا گیا ہے جو یقیناً غلط ہے اور تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرہ رحمانیہ مؤلفہ مولانا قاری محمد عبدالحلیم انصاری پانی پتیؒ میں ص ۴۴ پر ہے کہ ''۱۲۵۹ھ میں یکایک حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کا حج کا ارادہ ہوگیا۔'' حالانکہ شاہ صاحبؒ پہلی مرتبہ حج کو ۱۲۴۰ھ میں گئے تھے اور واپس آ گئے تھے اور ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کی ہے۔ (فریدی)

نے برسوں پہلے اپنے احفاد کے دائرۂ فیض کی وسعت کی جو پیش گوئی کی
تھی اس کے مصداق شاہ محمد اسحاق (اور ان کے چھوٹے بھائی) ہی تھے"

حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے مشہور تلامذہ کے تفصیلی حالات وسوانح ان شاء اللہ دوسری قسط میں پیش کروں گا۔

اب میں پہلے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کا تذکرہ کرتا ہوں۔ آپ کے متعلق نواب صدیق حسن خاں قنوجی "اتحاف النبلاء" ص ۴۳۰، ۴۳۱ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اولاد امجاد او (اے شاہ ولی اللہؒ) کہ ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت و فرید دہر و وحید عصر در علم و عمل و عقل و فہم و قوت تقریر و فصاحت تحریر و تقویٰ و دیانت و امانت و مراتب ولایت بود و ہمچنیں اولاد اولاد ے

ایں خانہ تمام آفتاب است ☆ ایں سلسلہ از طلائے ناب است

در "قول جلی" از کلام ایشاں آوردہ کہ فرمودند: "آگاہی آمد ایں فرزنداں کہ لطف الٰہی ایشاں را بما عطا کردہ است، ہمہ سعداء اند۔ نوعے از مَلکیت در یشاں ظہور خواہد کرد۔ لیکن تدبیر غیب تقاضا می کند کہ دو شخص دیگر پیدا شوند کہ در "مکہ و مدینہ" سالہا احیاء علوم دین نمایند و ہمہ جا وطن اختیار کنند۔ از طرف مادر نسب ایشاں بما متمکن باشد۔ زیرا کہ آدمی زادہ بوطن مادر میلان طبعی دارد۔ و انتقال جملۂ کہ بوطن والدۂ ایشاں متمکن باشند بسر زمینے بالطبع مستحیل است مگر بقسر قاسر۔ انتہی بلفظہٖ۔"

محرر سطور گوید مصداق ایں آگاہی بظاہر وجود ہر دو نواسۂ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ است مولوی محمد اسحاق و مولوی محمد یعقوب کہ ہجرت از طرف دہلی کردہ در "مکہ" اقامت نمودند و سالہا باحیائے روایت حدیث باہل عرب و عجم پرداختند واللہ اعلم۔"

''ترجمہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اولاد میں سے ہر ایک علم و عمل، عقل و فہم، قوت تقریر، فصاحت تحریر، تقویٰ و دیانت اور امانت اور مراتب ولایت میں بے نظیر وقت، فرید دہر، اور وحید عصر تھا اور ایسے ہی ان کی اولاد کی اولاد بھی کمال والی اور امتیازی شان رکھنے والی تھی۔

ایں خانہ تمام آفتاب است ☆ ایں سلسلہ از طلائے ناب است

قول جلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا مجھ کو (بطور الہام) آگاہی ہوئی ہے کہ میرے یہ سب لڑکے جن کو اللہ کے لطف و فضل نے مجھے عنایت کیا ہے سب سعادتمند ہیں۔ مَلکیت کی ایک نوع ان میں ظاہر ہوگی لیکن غیبی تدبیر تقاضا کرتی ہے کہ (ہمارے خاندان میں) دو شخص ایسے پیدا ہوں کہ ''مکہ و مدینہ'' میں سالہا سال احیاءِ علوم کریں اور وہیں پر اپنا وطن اختیار کریں۔ ان کا نسب ماں کی طرف سے ہم سے ملتا ہو، آدمی زادہ اپنے مادری وطن کی جانب طبعی میلان و رغبت رکھتا ہے اور کسی جماعت کا اپنی والدہ کے وطن سے کسی دوسری سرزمین کی طرف منتقل ہونا بالطبع مستحیل (محال) ہے۔ مگر قسر قاسر (کسی بھی محرک) سے ہو تو دوسری بات ہے۔''

(نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ اس آگاہی کا مصداق بظاہر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے دونوں نواسوں یعنی شاہ محمد اسحاق و شاہ محمد یعقوب کا وجود ہے کہ ''دہلی'' سے ہجرت کر کے ''مکہ معظمہ'' میں اقامت پذیر ہوئے اور سالہا سال

اہل عرب وعجم کے لیے احیائے روایت حدیث میں مشغول ومنہمک
رہے۔ واللہ اعلم۔''

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنیؒ نے ''نزہۃ الخواطر'' جلد ہفتم میں جو تحریر فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

''الشيخ الامام العالم المحدث المسند ابو سليمان اسحاق ابن محمد افضل بن احمد العمرى الدهلوى المهاجر الىٰ مكة المباركة و دفنها.''

''آپ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے تھے، آپ کی پیدائش بتاریخ ۸/ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ یا ۱۱۹۷ھ بمقام دہلی ہوئی۔ آپ نے اپنے نانا کی گود میں پرورش پائی اور صرف، نحو، کافیہ تک مولانا عبدالحیؒ بڈھانویؒ بن ہبۃ اللہ بن نوراللہ سے پڑھی اور تمام کتب درسیہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ سے پڑھیں اور ان سے تحصیل کی نیز ان سے حدیث بھی پڑھی پھر اپنے نانا شاہ عبدالعزیزؒ سے سند حاصل کی۔ آپ شاہ عبدالعزیزؒ کے نزدیک بیٹے کے مانند تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے آپ کو اپنا جانشین بنایا اور تمام کتابیں اور سکنائی جائیداد آپ کو ہبہ کر دی۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد آپ ان کے قائم مقام بنے اور آپ نے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ حرمین شریفین کا پہلا سفر ۱۲۴۰ھ میں کیا اور حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ نے ''مکہ معظمہ'' میں حدیث کی سند شیخ عمر بن عبدالکریم المکیؒ (م ۱۲۴۷ھ) سے حاصل کی۔ پھر آپ ہندوستان واپس آئے اور شہر دہلی میں درس حدیث کا سلسلہ سولہ سال تک جاری

رکھا۔ پھر ۱۲۵۸ھ میں اپنے بھائی شاہ محمد یعقوب اور تمام اہل وعیال کے ساتھ مستقل طور پر ''مکہ معظمہ'' ہجرت کی اور دوبارہ حج وزیارت کے بعد ''مکہ معظمہ'' میں اقامت گزیں ہوگئے۔ آپ نے شریف محمد بن ناصر حازمی نے ''مکہ معظمہ'' میں علم حدیث حاصل کیا۔
ہندوستان کے اندر آپ کے بڑے بڑے تلامذہ ہوئے: جیسے کہ شیخ عبدالغنی مجددی فاروقی مہاجر ''مدینہ'' محدث دارالہجرہؒ، میاں نذیر حسین محدثؒ، مولانا قاری عبدالرحمٰن انصاری پانی پتیؒ، مولانا سید عالم علی مرادآبادیؒ، مولانا مفتی عبدالقیوم صدیقی بڈھانوی ثم بھوپالیؒ، مولانا نواب قطب الدین خاںؒ دہلویؒ ''صاحب مظاہر حق''، مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، مولانا عبدالجلیل شہید علی گڑھیؒ، مفتی عنایت احمد کاکورویؒ، مولانا احمد اللہ بن دلیل اللہ اُناویؒ وغیرہم۔ ان میں اکثر وبیشتر علم حدیث میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔
حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگردوں سے بے شمار انسانوں نے اخذ حدیث کیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں ان کی مسند حدیث کے علاوہ اور کوئی سند باقی نہیں رہی۔ وذلک فضل اللہ یؤتیه من یشا.''
مولانا شمس الحق دیانوی اپنی کتاب ''تذکرۃ النبلاء'' میں شیخ عبداللہ سراج مکیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شاہ محمد اسحاق صاحب کی وفات کے بعد ان کے غسل کے وقت فرماتے تھے کہ:

''وَاللهِ اِنَّهُ لَوْ عَاشَ وَ قَرَأْتُ عَلَيْهِ الْحَدِيْثَ طُوْلَ عُمْرِیْ مَانِلْتُ مَا نَالَهُ[1].''

---

[1] خدا کی قسم اگر وہ یعنی شاہ محمد اسحاقؒ زندہ رہتے اور میں تمام عمر ان کے پاس رہ کر حدیث پڑھتا تو اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا جس مقام پر وہ فائز تھے۔ (فریدی)

شیخ عمر بن عبدالکریم محدث مکیؒ علم حدیث اور علم رجال میں آپ کے کمال اور مہارت کی گواہی دیتے تھے اور یوں فرمایا کرتے تھے "قَدْ حَلَّتْ فِيْهِ بَرَكَةُ جَدِّهِ الشيخ عبدالعزيز دهلوی" (ان کے اندر ان کے نانا شیخ عبدالعزیز کی برکات اُتری ہوئی ہیں۔

آپ کے نانا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اکثر یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمَاعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ..."[1]

میاں نذیر حسین دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی ایسے عالم سے نہیں ملا جو شاہ محمد اسحاق صاحب سے افضل ہو۔

آپ نے مکہ معظّمہ میں وبائے عام کے اندر روزہ کی حالت میں ۲۷/رجب ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔ اور جنت المعلٰی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مزار مبارک کے قریب دفن ہوئے۔

صاحب "مقالات طریقت" آپ کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

"آپ ۸/ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے.....رجب ۱۲۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ جب دوسری مرتبہ حج کو گئے تھے تو ہجرت کی نیت سے گئے تھے از بس کہ شعار اسلام میں ضعف اور رسوم کفر و بدعت میں قوت آتی جاتی تھی نیت ہجرت کو مصمم کر کے تمام قبائل کو ہمراہ لے کر راہی مکہ معظّمہ ہوئے، باوجودیکہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بسماجت تمام مانع آئے۔ چونکہ شوق "ما هو الحق" غالب تھا، آپ ممتنع نہ ہوئے اور "مکہ معظّمہ" جا کر وطن اختیار کیا اور بہ سبب کثرت کرم کے آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔"

---

[1] حمد و ستائش اس اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل و اسحاق عطا فرمائے (شاہ محمد اسماعیل شہید فی سبیل اللہ اور شاہ محمد اسحاق مہاجر۔ (فریدی)

آپ کے تلامذہ یہ ہیں:

(۱) ''مکہ معظمہ'' میں مولوی محمد صاحب وغیرہ (۲) جناب مولانا مولوی شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی مہاجر۔ ہندوستان میں تو بکثرت ہر ایک بلاد و امصار میں مرید و شاگرد بھرے ہوئے تھے۔ جن میں سے چند یہ ہیں: (۳) مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (۴) مولانا حافظ قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ (۵) فاضل یگانہ مولوی حافظ شیخ محمد صاحب ساکن تھانہ بھون (۶) مولانا عالم علی صاحب ساکن نگینہ نزیل رامپور۔ آپ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے خلیفۂ طریقت بھی ہیں اور سلسلہ علوم ظاہر و باطن کا آپ سے جاری ہوا۔ (۷) نواب معلّٰی القاب مولوی حاجی مہاجر متبع سنن سیدالاوائل والاواخر بحر مواج علوم وعرفاں نواب محمد قطب الدین خاں دہلویؒ، آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ماہ رجب ۱۲۸۹ھ میں ہوا۔ (۸) واقفِ اسرارِ خاندانِ شاہ ولی اللہ مولانا حافظ حاجی مولوی عبدالقیوم بڈھانویؒ نزیل شہر بھوپال۔''

نواب قطب الدین خاں دہلویؒ ''احکام العیدین'' کے دیباچہ میں شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی ہجرت کے بارے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

''بعد حمد وصلوٰۃ کے مسکین قطب الدین ابن محمد محی الدین خاں بیچ خدمت سب بھائی مسلمانوں کے التماس رکھتا ہے کہ میں ایک .....خادم جناب مکرم ومعظم سند المحدثین مفید الطالبین مجمع الفضائل منبع الفواضل جامع الاشفاق والاخلاق یعنی حضرت مولانا ومرشدنا مولوی محمد اسحاق سلمہ اللہ تعالیٰ علی رؤوس الحق والاحقاق- نواسۂ حضرت مولانا شیخ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز دہلویؒ- کا ہوں۔ وقت کہ جناب ممدوح یہاں تشریف رکھتے تھے تو اکثر خلق سوائے شہر اپنے کے راہ دور دراز سے بیچ خدمت آپ کے فیض اور

صحبت کثیر البرکت آپ کے سے طرح طرح کے فائدے اُٹھا کر شب و روز بہرہ یاب ہوتے تھے۔ چنانچہ اس عاجز نے بھی خدمت عالی جناب موصوف سے موافق فہم ناقص اپنے کے اور توجہ دلی اور شفقت قلبی حضرت کی سے کہ بدرجۂ اتم حال کمترین پر ختم تھی، بہت طرح کے فائدہ علوم دین کے حاصل کیے اور فیضیاب ہوا۔ اور حال فیض عام آپ کا اس طرح پر تھا جیسا اولیاء اللہ کی تعریف میں آیا ہے کہ اولیاء اللہ وہ ہیں جن کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آوے۔ یہ بات جناب موصوف میں صاف پائی جاتی تھی اور دل یہی چاہتا تھا کہ آپ کی زبان فیض بیان سے ہمیشہ ذکر خدا اور رسول کا سنا کیجیے۔ اور آپ کی صحبت میں شب و روز حاضر ہو کر فائدے دین کے حاصل کیا کیجیے۔ اور اکثر خیالات فاسدہ، حاضر ہونے خدمت عالی اور زیارت جمال باکمال حضرت کے سے دور ہوتے تھے۔ اب جس دن سے کہ جناب ممدوح نے یہاں سے ہجرت کی ہے اسی دن سے چرچہ درس و تدریس علوم دینیہ کا تمام ہندوستان سے بہت کم ہو گیا۔ اور جو لوگ کہ جناب فیض انتساب سے موافق حوصلہ اپنے کے فیضیاب ہوئے تھے ان کا یہ حال ہے کہ خیال صحبت بابرکت حضرت کی سی زندگی اپنی بسر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ آنکھیں ہماری دیکھنے جمال باکمال جناب ممدوح کو ترستی ہیں، بموجب کلام استاد کے ؎

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں ☆ اب دیکھنے کو جن کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اور بسبب درد جدائی آپ کی کہ عجب حالت رہتی ہے، اس واسطے شدت

شوق میں حسب حال اپنے چند اشعار نوک ریز خامہ ہوتے ہیں۔[1]

اب یہاں سب صاحب بنظر انصاف و دیدہ غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ جن کی طرف ایک عالم رجوع ہو اور وہ بھی بذاتہٖ صحت عالم ہو اور کسی طرح کی حاجت بھی بند نہ ہو پھر وہ شخص دنیا کے عیش و آرام کو پر پشہ کے برابر نہ جانے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر طالب رضائے مولا اور تابع مرضیات کے ہو۔ یہ کام مقبول اور مخصوص لوگوں کا ہے اور اس آیت کریمہ کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں: وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ط"

اور جب آپ کے دل میں ہجرت کا ارادہ مصمم ہوا تو ہم نے عرض کیا کہ ہم کو کچھ نصیحت کیجیے۔ اس کے جواب میں مختصر کلام اور جامع ارشاد فرمایا:

"اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالطَّاعَۃِ وَکَثْرَۃِ الذِّکْرِ وَالْاِسْتِغْفَارِ وَالصَّلٰوۃِ عَلَی النَّبِیِّ الْمُخْتَارِ. ترجمہ: یعنی میں نصیحت کرتا

---

[1] اس عبارت کے بعد تقریباً بیس اشعار اردو و فارسی کے ہیں جو پُر از سوز و گداز ہیں اور فراق و ہجر کے مضمون سے لبریز۔ ان میں سے چند اشعار منتخب کر کے یہاں پیش کئے جاتے ہیں: اشعار

درد ہو اس کی کچھ دوا کیجیے ☆ دل ہی بے چین ہو تو کیا کیجیے
سب گئے صبر و ہوش تاب و تواں ☆ میں رہا ہوں تو کیا رہا ہوں میں
ہوش و حواس اُڑ گئے جاتے ہی یار کے ☆ کیا کیا گھمنڈ تھے ہمیں صبر و قرار کے
دل سا رفیق جس کا جدا ہو گیا ہو آہ ☆ وہ اپنی بے کسی پہ نہ روئے تو کیا کرے
چشمِ گریاں، دلِ بریاں، غمِ ہجراں، لبِ خشک ☆ ایک الفت سے تری ہو گئے آزار کئی
ایں مصیبت را حد و پایاں کجاست ☆ ایں مصیبت نیست درد بے دواست
ہر طرف مستاں خراب اُفتادہ اند ☆ ز آتش ماتم کباب اُفتادہ اند
یاد آرند آن زمانِ بے غمی ☆ صحبتِ ساقی و عیش و خرمی
ہر یکے را دل ازیں ماتم کباب ☆ ہر یکے را دیدہ چوں ساغر پُر آب
ہر یکے چوں تشنۂ خستہ جگر ☆ از خود و از ہستیٔ خود بے خبر

ہوں تم کو کہ ڈرتے رہنا اللہ تعالیٰ سے، بچنا گناہوں سے اور اللہ تعالیٰ
کی بندگی کرتے رہنا اور اس کی بہت یاد کرنا اور بہت استغفار کرنا،
اور بہت درود بھیجا کرنا نبیِ مختار صلی اللہ علیہ وسلم پر۔''

پس جب آپ تشریف لے گئے تو بعض مخلصین کو یہ خیال ہوا کچھ ایسی چیز لکھیے کہ آپ کی یادگار رہو۔ چنانچہ میر ظہور علی صاحب نے کہ محبِ صادق ہیں یہ تاریخ لکھی۔

مولوی اسحاق صاحب با کمال ☆ ترک خانہ کردہ سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور ☆ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت

۱۲۵۸ھ

اور خواجہ احسن اللہ صاحب نے یہ تاریخ لکھی۔

مولوی اسحاق صاحب فخرِ دیں ☆ تھا منور شہر جن کے نام سے
درس فرماتے تھے ہفتہ میں دو بار ☆ فہم سے ادراک سے الہام سے
عالم و جاہل سبھی چھوٹے بڑے ☆ بہرہ ور تھے ان کے فیضِ عام سے
کر گئے ہجرت مع اہل و عیال ☆ سوئے کعبہ شوق کے احرام سے
سچ تو یوں ہے جو کہ احسن نے کہا ☆ شہر خالی ہو گیا اسلام سے

مصرعہ آخر سے سوائے لفظ اسلام کے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب گرامی جو عربی زبان میں ہے تبرکاً اس مقالہ میں شامل کر دوں، یہ مکتوب گرامی حضرت مولانا حاجی احمد علی محدث سہارنپوریؒ کی ایک قلمی بیاض سے لیا گیا ہے، جو احقر کے پاس موجود ہے۔ یہ مکتوب گرامی صاحب ''مظاہر حق'' نواب قطب الدین خاں دہلویؒ کے نام ہے، اس کو معہ ترجمہ اس مقالہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

شاہ محمد اسحاق صاحب کا ایک مکتوب گرامی: مِنْ محمد اسحاق اِلیٰ

النُّوَّابِ محمد قطب الدین سَلَّمَهُ اللهُ تَعَالیٰ، بَعْدَ السَّلامِ والتحیةِ، یُعَرِّفُکُمْ اَنَّا بِالْخَیرِ وَالسَّلَامَةِ، وَ صِحَّتُکُمْ وَ عَافِیَتُکُمْ مِن اللهِ مَسْؤُولٌ وَ مَامُولٌ، اِنَّ کِتَابَکُمُ الْکَرِیْمَ قَدْ وَصَلَ، وَالسُّرُوْرُبِهٖ قَدْ حَصَلَ، نَدْعُوْ لَکُمُ اللهَ بِالْخَیْرِ وَ صَالِحِ الْعَمَلِ، وَاللهُ یَغْفِرُ لَنَا وَلَکُمْ بِلا مَهْلٍ. وَاَیْضاً یُعَرِّفُکُمْ اَنَّ الْفُلُوْسَ الَّتِیْ أَرْسَلْتُمْ بِوَاسِطَةِ الْمولوی عبدِالحلیم قَدْ عُلِمَ اَنَّهَا اِلیٰ المنیٰ قد وَصَلَتْ، لٰکِنْ اِلیٰ الاٰن فِی مَکَّةَ مَا حَصَلَتْ. وَالْمَبَالِغُ الَّتِیْ کَانَتْ عِنْدَ عبدِاللهِ بَائِعِ الْکُتُبِ عِنْدَکُمْ وَصَلَتْ أَمْ لا؟ خَبِّرُوْنَا بِهٰذَاالْاَمْرِ،وَحَالُ بَیْعِ الْکُتُبِ وَالْاَمْتِعَةِ وَالْحَوَائِجِ قَدْ عَرَفْنَا مِنْ کِتَابِکُمُ الَّذِیْ وَصَلَ.والحافظ احمد علی السهارنفوری بَعْدَ السَّلَامِ یُعَرِّفُ أَنَّ رَجُلاً – اسمُهُ محمد ضامن الحاج ساکنُ غازی فور– قد جَاءَ مِنْ جِهَةِ کلکتة، لَقِیَنِیْ، فَقَالَ: اِنَّ رَجُلاً مِنَ الْبَنْگَالَةِ فِی الْکَلْکَتةِ قَالَ لِیْ، اَنْ تُبَلِّغُوْا مِنِّیْ اِلیٰ فُلانٍ یَعْنِیْ الحقیرَ أَنَّ الْکُتُبَ الَّتِیْ أَرْسَلْتُمُوهَا اِلیٰ الْکَلْکَتةِ قَدْ ضَاعَتْ، ثُمَّ وَصَلَ اِلَیْنَا کِتَابُ المولوی فرحت علی، کَتَبَ فِیهِ: أَنَّ الْمَرْکَبَ لَحِقَ الطوفانَ والطُّغیانَ، کُسِرَالْمَسْطُوْلُ وَکُسِرَتْ أَلْوَاحُ الْمَرْکَبِ مِنْ جَانِبِ الدَّبُوسَةِ وَ مَلَأَ الْمَاءُ فِی الْمَرْکَبِ بِقَدْرِ قَامَةِ الرَّجُلِ. قَدْ ضَاعَ الْاَسْبَابُ وَالْکُتُبُ. انتهیٰ. لٰکِنْ مَا عَرَفْنَا اَنَّ الْکُتُبَ الَّتِیْ اَرْسَلْنَا قد غَرِقَتْ فی الْبَحْرِ اَمْ وَصَلَ اِلَیْهَا ماءٌ، فَحا لُها حَقِّقُوْا بواسطةِ الکتابِ مِنَ الشَّیْخِ نَبِیْ بخش التاجرِ فی الکلکتةِ وَمِنَ المولوی فَرحَتْ علی بِوَطَنِهٖ. وَالسَّلَامُ عَلَیْکُم.

(ترجمہ مکتوب عربی)

مِنْ محمد اسحاق اِلیٰ النُّوَّابِ محمد قطب الدین سَلَّمَهُ اللهُ تَعَالیٰ

بَعْدَ السَّلَامِ والتحیه .

معلوم ہو کہ میں بخیر و عافیت ہوں اور آپ کی صحت و عافیت بدرگاہ الٰہی مطلوب ہے، آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا اور اس سے خوشی حاصل ہوئی، میں آپ کے لیے خیریت اور اعمالِ صالحہ کی دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی مغفرت جلد از جلد اول وہلہ میں فرمائے۔ اور یہ بات بھی لکھتا ہوں کہ وہ رقم جو آپ نے مولوی عبدالحلیم کے ہاتھ بھیجی تھی معلوم ہوا ہے کہ وہ ''منیٰ'' تک پہنچ گئی ہے لیکن اس وقت تک ''مکہ معظمہ'' نہیں پہنچی ہے۔ عبداللہ کتب فروش کے ذمہ جو روپیہ تھا وہ ملا یا نہیں؟ اس بات کی اطلاع دو، کتابوں اور چیزوں کی بیع اور حوائج کا حال ہمیں آپ کے اس خط سے معلوم ہوا جو مل گیا۔ اور حافظ احمد علی محدث سہارنپوری بعد السلام اطلاع کرتے ہیں کہ ایک شخص جن کا نام حاجی محمد ضامن ہے اور جو ''غازی پور'' کے رہنے والے ہیں وہ ''کلکتہ'' کی طرف سے یہاں آئے ہیں انھوں نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ ایک بنگالی نے مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ میری طرف سے فلاں شخص یعنی مجھ محمد اسحاق کو یہ بات پہنچا دینا کہ جو کتابیں تم نے کلکتہ بھیجی تھیں وہ ضائع ہوگئیں۔ پھر میرے پاس مولوی فرحت علی کا خط پہنچا اس میں لکھا تھا کہ جہاز طوفان اور طغیانی سے دوچار ہوگیا تھا، اس کا ''مستول'' ٹوٹ گیا تھا، جہاز کے تختے دبوسہ[1] کی طرف سے ٹوٹ گئے تھے اور جہاز میں آدمی کے قد کی برابر پانی بھر گیا تھا۔ تمام اسباب و کتب ضائع ہوگئے لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ کتابیں کہ جن کو ہم نے بھیجا تھا وہ پانی میں غرق ہو گئیں یا ان تک فقط پانی پہنچ گیا۔ اس کا حال خط کے ذریعہ سے نبی بخش تاجر کتب کو کلکتہ خط بھیج کر اور مولوی فرحت علی کو ان کے وطن خط بھیج کر تحقیق کریں۔ والسلام علیکم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے اپنی روانگی کے وقت اپنی کتابیں ''مکہ معظمہ'' کو بھیجنے کا انتظام براہِ کلکتہ کیا ہوگا۔ خود جس جہاز سے گئے تھے

---

[1] دبوس کے معنیٰ مصباح اللغات اور غیاث اللغات میں گرز آہنی کے بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں پر غالباً جہاز کے کسی حصہ کو مراد لیا گیا ہے۔ (فریدی)

اس میں کتابوں کے جانے کا انتظام نہ ہو سکا ہوگا۔ اس لیے اغلب یہ ہے کہ اس مکتوب میں ہندوستان سے روانہ کی ہوئی اپنی کتابوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی ہجرت کے وقت ان کی کتابوں کا ذکر تذکرہ رحمانیہ میں اس طرح کیا گیا ہے:

> ''صاحبِ سوانح (قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ) نے ایک مرتبہ صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے خود فرمایا کہ جو کتب خانہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بوقت ہجرت اپنے ساتھ لیا اس کا وزن نومن تھا۔ اس کے علاوہ جتنا ذخیرہ باقی تھا اس کے متعلق مجھے اور نواب قطب الدین خاں صاحب کو حکم دیا کہ یہ سب نیلام کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم دونوں نے یہ خدمت انجام دی۔ (ماخوذ: از تذکرہ رحمانیہ ص ۵۰، ۵۱، مؤلفہ قاری عبدالحلیم انصاری پانی پتیؒ)''

تصانیف: حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی تصانیف تعداد میں بہت کم ہیں، اب تک جن تصنیفات کا علم ہو سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح (۲) مختصر فارسی رسالہ شعب الایمان (۳) مسائل اربعین[۱] (۴) مأۃ مسائل[۲]۔

آخر الذکر دو کتابوں کے متعلق حکیم محمود احمد برکاتی کا خیال ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی نہیں ہیں لیکن داخلی اور خارجی متواتر شہادتوں سے یہ امر ثابت

---

۱ مسائل اربعین کے متعلق جمہور علی گڑھ کے حبیب الرحمٰن خاں شروانی نمبر میں محمد عبدالصبور خاں شروانی خان زماں خاں شروانی رئیس بھیکن پور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے بیعت تھے آپ نے ۳۶ مسائل شرعیہ کو سوالات کی صورت میں پیر و مرشد کے حضور میں پیش کیا۔ ممدوح نے انھیں شاہ محمد اسحاقؒ کے سپرد فرمایا۔ شاہ (محمد اسحاق صاحب) نے مذکورہ سوالات کا جواب لکھ کر اپنی طرف سے مزید چار مسائل کا اضافہ کر دیا۔ اور یہ مجموعہ شائع کر دیا گیا اور مسائل اربعین یعنی چہل مسائل کے نام سے آج تک مشہور و موجود ہے۔'' ۲ ''تراجم علمائے حدیث'' میں ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے آپ کی تالیفات میں رسالہ ''تذکرۃ الصیام'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم (فریدی)

اور واضح ہے کہ یہ دونوں کتابیں شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ کی ہی تالیف[1] ہیں۔

اولاد: شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے ایک صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادہ کا نام سلیمان تھا۔ وہ نوعمری میں وفات پا گئے تھے۔ ایک صاحبزادی امتہ الغفور مولانا مفتی عبدالقیوم بڈھانوی ثم بھوپالیؒ سے بیاہی گئیں تھیں۔ ان سے ایک دختر اور دو صاحبزادے ایک حافظ مولوی محمد یوسف اور دوسرے حافظ مولوی محمد ابراہیم تھے۔ حافظ محمد یوسف لاولدر ہے۔ حافظ محمد ابراہیم کے لڑکے حافظ محمد اسماعیل اور دولڑکیاں حبیبہ اور ام سلمیٰ ہوئیں۔ حافظ محمد اسماعیل کے ایک فرزند حافظ محمد احمد ہوئے۔ ان کے بھی ایک فرزند حافظ محمد مصطفیٰ ہوئے جو بھوپال میں مقیم ہیں اور صاحب اولاد ہیں۔ ام سلمیٰ مولوی قاضی محمد شعیب بن قاضی محمد یحییٰ بن قاضی محمد ایوب پھلتی کو بیاہی تھیں جن سے مولانا محمد زبیر صدیقی بھوپال میں ہیں اور صاحب اولاد ہیں۔ حبیبہ سید عباس علی کو بیاہی تھیں۔ ان سے سید جعفر علی لاہور میں مقیم ہیں۔

شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی دوسری صاحبزادی شاہ اہل اللہ کے پرپوتے شاہ محتشم اللہ کو بیاہی تھیں۔ شاہ محتشم اللہ کے صرف ایک فرزند مولوی عبدالرحمٰن کا علم ہے۔ یہ ''مکہ معظمہ'' میں مقیم تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ''المسوّیٰ'' کا نسخہ ان ہی مولوی عبدالرحمٰن کے ورثاء سے حاصل کیا تھا۔ شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی تیسری صاحبزادی شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے نواسے مولوی سید نصیر الدین مجاہد (شہید ۱۸۴۰ء در غزنی) کو بیاہی تھیں۔ ان کے دو صاحبزادے مولوی عبداللہ اور مولوی عبدالحکیم[2] تھے۔

اب حضرت شاہ محمد یعقوب محدث دہلوی مہاجر مکیؒ کے کچھ حالات درج کیے جاتے ہیں۔ نزہۃ الخواطر ص ۵۳۴، ۵۳۵ پر ان کے متعلق جو کچھ تحریر ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

''شاہ محمد یعقوب محدث بن محمد افضل عمری دہلوی مہاجر مکیؒ شاہ

۱۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان

۲۔ ماخوذ: از شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۱۵۵، ۱۵۶، مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی۔ (فریدی)

عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے چھوٹے نواسے تھے۔ آپ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے نانا کی گود میں ہی پرورش پائی اور نانا ہی سے ''شرح کافیہ الجامی'' کے تین سبق پڑھے اور ان سے ''جلالین شریف'' چہل قدمی کی حالت میں پڑھی۔ اس کے علاوہ تمام کتب درسیہ شاہ رفیع الدین محدث[1] دہلویؒ سے پڑھیں۔ آپ کو اپنے نانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے علم حدیث اور طریقت میں اجازت ملی۔ آپ نے مدتوں تک دہلی کے اندر درس حدیث اور افادۂ علوم کی محفل گرم رکھی۔ پھر اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحاق کے ساتھ ہجرت کی۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی اور خواجہ احمد بن یاسین نصیر آبادی اور بہت سے علماء نے آپ سے علم حدیث کو حاصل کیا[2]۔''

آپ کی وفات ۲۷/ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ کو جمعہ کے دن ''مکہ معظمہ'' میں ہوئی جیسا کہ ''مہر جہاں تاب[3]'' میں تحریر ہے۔

صاحب ''مقالات طریقت'' نے آپ کے حالات اس طرح تحریر کیے ہیں:

''آپ شاہ محمد اسحاق صاحب کے چھوٹے بھائی اور شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور خلیفۂ طریقت تھے۔ آپ ۲۸/ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ

---

۱ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کا اسم گرامی عبدالوہاب تھا مگر معروف رفیع الدین سے ہوئے۔ (محب الحق)

۲ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان میں مقالات طریقت، امیر الروایات اور ارشاد محمدی کے حوالے سے ان چند حضرات کو بھی اجازت یافتگان اور فیض یافتگان نے شاہ محمد یعقوب میں شمار کیا ہے یعنی مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، مولانا عبدالعزیز جعفریؒ، مولانا مفتی عبدالقیوم بڈھانویؒ، حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد زمان شہیدؒ اور مولانا محمد سعید عظیم آبادیؒ۔

۳ مؤلفہ حکیم فخر الدین خیالی حسنی رائے بریلوی (قلمی) (فریدی)

میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تین سبق ''شرح ملا جامی'' کے اپنے نانا صاحب سے پڑھے۔ فرماتے ہیں کہ ان کی تعلیم کا عجب طریقہ تھا کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا گویا ابواب علوم مفتوح ہوتے تھے۔ آپ نے اکثر علوم شاہ رفیع الدین صاحب سے حاصل کیے اور ''تفسیر جلالین'' حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے چہل قدمی کے وقت پڑھی۔ آپ نے اپنے برادر بزرگ کے ہمراہ ہجرت کی اور ''مکہ معظّمہ'' میں سکونت اختیار کی۔ جب تک دہلی میں رہے گوشۂ عزلت میں رہتے تھے اور ابنائے روزگار کی طرف کبھی رجوع نہیں کیا۔ ''مکہ معظّمہ'' میں بھی آپ کا یہی حال تھا۔ تھوڑی سی آمدنی میں جو کسب حلال سے فراہم ہوتی تھی اوقات گزاری کرتے تھے۔ مکان میں فرصت کے وقت ریشم کھولا کرتے تھے اور شب و روز عبادت خالق اور ہدایت خلائق میں مصروف رہا کرتے تھے۔ طالبان خدا کو مقصود تک پہنچاتے تھے۔

''مکہ معظّمہ'' میں ۲۷ر ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ جمعہ کے دن وفات ہوئی۔ آپ کی عمر ۸۲ سال ہوئی۔ حافظ سورتی صاحب مہتمم شہر بھوپال نے آپ کی تاریخ وفات اس آیت کریمہ سے نکالی ہے:

اَلاَ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللہِ لاَ خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلاَ ھُمْ یَحْزَنُوْن ط

جمعہ کے دن بھی صبح کی نماز آپ نے تیمّم سے ادا کی اور اشراق و چاشت بھی پڑھی۔ دوپہر ڈھلے جب ''حرم محترم'' میں اذان ہوئی اس وقت روح مبارک پرواز کر گئی۔ حسب وصیت ''جنت المعلیٰ'' میں شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے مزار کے قریب آپ کو دفن کیا گیا۔

جنازہ کی نماز میں ایسی کثرت ہوئی کہ تمام حرم کی دکانیں بند ہوگئیں۔
کھڑے رہنے کو بہت دشواری سے جگہ ملتی تھی۔ حرم شریف سے
''جنت المعلیٰ'' تک اتنی خلقت تھی کہ قدم اُٹھانا مشکل تھا۔ جنازہ کو
ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آخر وقت آپ نے جس قدر امانتیں رکھی تھیں
سب لکھوا دیں اور فرمایا کہ تیس ریال نقرئی میرے تکیے کے نیچے ہیں
اس میں سے تجہیز و تکفین ہو۔ کچھ دھوم دھام نہ ہو، تکلف نہ ہو۔ اسی
طرح عمل ہوا۔''

صاحب ''مقالات طریقت'' لکھتے ہیں کہ اب ''حرم محترم'' میں آپ کے داماد مرزا امیر بیگ صاحب اور آپ کی دُختر اور مولوی خلیل الرحمٰن بن مرزا امیر بیگ آپ کے نواسے موجود ہیں اور مولوی عبدالرحمٰن بن حافظ محتشم بن مولوی محمد معظم المعروف بہ مولوی محمدی بن مولوی مقرب اللہ بن شاہ اہل اللہ بن شاہ عبدالرحیم بن شیخ وجیہ الدین شہید نواسے مولانا محمد اسحاق کے آپ کے خلیفہ اور جانشین ''مکہ معظمہ'' میں موجود ہیں۔

شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ کی ایک دُختر کا نکاح مرزا امیر بیگ سے ہوا تھا[1]۔ ان کے صاحبزادے مولوی خلیل الرحمٰن تھے۔

سر سید احمد خاں اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' میں شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''علم و فضل میں بھی کم پایہ نہیں رکھتے تھے، خلق جمیل و صفات جزیل
اور قناعت و استغنا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ
جب کوئی بطور ہدیہ پیش کش لایا کچھ قبول نہ کیا، جو سرمایہ اپنے پاس

[1] امیر الروایات میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بیان کردہ ایک واقعہ میں حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کے داماد میرزا امیر بیگ کا ذکر آیا ہے۔ اس پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ میں نے بھی والد مرحوم کے ہمراہ ''مکہ معظمہ'' میں ان کی زیارت کی تھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۱۷۵ (فریدی)

رکھتے ہیں اس میں بسر اوقات کرتے ہیں۔ خواہ بہ تنگی خواہ بہ وسعت اور حسب استعداد اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے رہتے ہیں۔ اس کم استعدادی میں توفیق ایسے امور خیر کی ایسے ہی مردان خدا کا کام ہے۔ آپ نے ہمراہ اپنے برادر مرحوم کے ''ہندوستان'' سے ہجرت کی اور ''مکہ معظمہ'' میں توطن اختیار کیا۔ جب تک شاہجہاں آباد (دہلی) میں رہے گوشۂ عزلت میں پابدامن رہتے تھے اور ابنائے روزگار کی طرف کبھی رجوع نہ رکھتے تھے اور یہی حال ہے اُس بلاد میں کہ کچھ وجہ قلیل میں جو کسی کسب حلال سے بہم پہنچتا ہے اپنی گزر اوقات کرتے ہیں اور اوقات شبانہ روزی کو عبادت خالق زمین و آسمان میں بسر کرتے ہیں۔ حق جل واعلیٰ ایسے زبدۂ اہالیٔ روزگار کو تا دیر سلامت رکھے کہ اپنے خاندان عالیشان کے یادگار ہیں۔ آمین یارب العالمین۔''

''شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان'' نامی کتاب میں حکیم محمود احمد برکاتی شاہ محمد یعقوب محدث دہلوی مہاجر مکیؒ کے بارے میں ''مقالات طریقت'' کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں:

''ثقات کہتے ہیں کہ استعداد ظاہر کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی آیت کے معنیٰ بیان کرتے تو وہ مضامین عالی بیان کرتے کہ سامعین حیران و ششدر رہ جاتے۔ پہروں وہی بیان چلا جاتا۔ قوت باطن کا یہ حال کہ اِدھر سبق حدیث شریف کا بھی ہو رہا ہے اُدھر توجہ بھی جاری ہے۔ امانت داری ایسی کہ یعقوب امین مشہور تھے۔[1] (ماخوذ: از مقالات طریقت)''

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ص ۱۷۵ (فریدی)

مقالہ (۴)

کاروانِ اہلِ فضل وکمال[1]

تلامذہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ

حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بعد ۱۸، ۱۹ سال تک دہلی کے اندر شمع درس وتدریس کو روشن رکھا اور جب ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کر کے ''مکہ معظمہ'' چلے گئے تو وہاں بھی یہ سلسلۂ فیض جاری رہا۔ مگر دو تین سال کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ ہندوستان اور حجاز میں آپ کے تلامذہ کی یقیناً ایک کثیر تعداد ہو گی مگر آپ کے تلامذہ میں جو مشہور ومعروف شخصیتیں ہیں اور تاریخ وتذکرہ کی کتابوں سے جن کے حالات معلوم ہو سکے ہیں ان کو یکجا جمع کرنے کی ضرورت تھی۔ احقر نے مناسب سمجھا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے تذکرے کے بعد (جو الفرقان کے گذشتہ شمارے اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے) ان کے تلامذہ کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ آپ کے تلامذہ میں چند حضرات کی تو مستقل سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں۔ مثلاً حضرت قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ کے حالات[2] میں ''تذکرۂ رحمانیہ'' مؤلفہ قاری عبدالحلیم انصاری پانی پتیؒ، سوانح عمری حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، مؤلفہ حکیم محمد عمر چرتھالویؒ اور ''الحیاۃ بعد المماۃ''، سوانح عمری میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ، مؤلفہ قاضی مظفر حسین مظفر پوریؒ۔

میں نے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے تلامذہ کے حالات میں اختصار کو مدنظر رکھا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ کوئی ضروری بات چھوٹنے نہ پائے۔

---

[1] یہ مقالہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

[2] محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب ''مولانا محمد احسن نانوتویؒ'' کے ص ۱۸۵ پر، ''تذکرہ رحمانیہ'' کا مؤلف خواجہ الطاف حسین حالی کو بتایا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ (فریدی)

اس سلسلہ میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے: نزہۃ الخواطر جلد ہفتم و ہشتم، تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرۂ رحمانیہ، مقالاتِ طریقت، تذکرۂ علمائے ہند فارسی مؤلفہ مولانا رحمٰن علی، سوانح عمری مولانا شیخ محمد تھانویؒ، ترجمہ تذکرۂ علمائے ہند مرتبہ محمد ایوب قادری، تذکرہ مشاہیر کاکوری مؤلفہ مولانا حافظ محمد علی حیدر علوی کاکورویؒ، تذکرہ کاملانِ رامپور، تراجم علمائے اہل حدیث مؤلفہ ابویحییٰ امام خاں نوشہروی، تاریخ مظاہر علوم جلد اول مرتبہ حضرت شیخ الحدیث دامت[1] برکاتہم۔

مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ:

الشیخ العالم الفقیہ المجوّد عبدالرحمن بن محمد الانصاری البانی پتی۔ پہلے آپ نے اپنے والد ماجد سے علم نحو اور عربی کے رسائل پڑھے۔ پھر قاری سید امام الدین نخشی امروہیؒ سے شاطبی، مشکوٰۃ شریف، طریقۃ المحمدیہ اور علم فرائض پڑھا اور ان سے "سبعہ" کی قرأت بھی سیکھی۔ بعدہٗ دہلی پہنچے اور عربی علم ادب کی کچھ کتابیں مولانا رشید الدین دہلویؒ سے پڑھیں۔ مولانا سید محمد دہلویؒ سے شرح عقائد للتفتازانی مع حاشیہ خیالی پڑھی، مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ سے سوائے دورۂ حدیث کے باقی تمام کتب معقولات و منقولات پڑھیں۔ پھر آپ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے وابستہ ہوگئے اور ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر مرکزِ عنایات بنے۔ افتاء و تدریس کی صلاحیت حاصل کی۔ بعد فراغت شہر "باندہ" چلے گئے۔

---

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ بقید حیات تھے۔ آپ کا وصال "مدینہ منورہ" میں یکم شعبان ۱۴۰۲ھ موافق ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء میں ہوا اور "جنت البقیع" ابدی آرام گاہ بنی۔ (محب الحق)

[2] تذکرہ رحمانیہ میں قاری صاحبؒ کے امروہہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ قاری صاحبؒ نے سند تجوید و قرأت حاصل کرنے کے علاوہ امروہہ میں بخاری کے بھی چند پارے قاری امام الدین نخشی امروہیؒ سے پڑھے تھے۔ (فریدی) مولانا قاری امام الدین نخشی امروہیؒ علم تجوید میں مولانا قاری کرم اللہ محدثؒ کے شاگرد تھے۔ مولانا قاری کرم اللہ صاحب نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بھی استاد تھے۔ نواب صاحبؒ نے اپنے سفرنامہ حجاز "ترغیب السالک الی احسن المسالک" میں آپ کا تذکرہ بہت وقیع الفاظ میں کیا ہے۔ مقالاتِ فریدی جلد اول کی طرف مراجعت کی جائے۔ (محب الحق)

وہاں نواب ذوالفقار الدولہ نے جو اس نواح کے نواب تھے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ نے ۱۲۷۳ھ تک باندہ میں قیام کیا پھر اپنے وطن پانی پت آ گئے اور وہاں پر درس و افادہ میں کلیتاً مصروف و مشغول رہے۔ آپ اپنے تمام اوقات کو خدمت قرآن و حدیث میں صرف کرتے تھے۔ اہل علم کے لیے آپ کا نفع عام تھا، آپ کے زمانے کے علماء حنفیہ میں کوئی بھی ایسی نمایاں شخصیت نہیں ہے جس نے آپ سے استفادہ[1] نہ کیا ہو۔ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ مؤلف ''نزہۃ الخواطر'' فرماتے ہیں کہ میں ۱۳۱۲ھ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے حدیث مسلسل بالاولیۃ سنی۔ نیز میں نے ان کے سامنے اس نسخہ میں جس پر حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی مہر لگی ہوئی تھی شیخ محمد سعید سنبل کی اولیّات پڑھیں۔ اس کی تمام مرویّات کی، انھوں نے مجھے اجازت دی اور میرے لیے برکت کی دعا کی۔

آپ نے بہت سے رسائل تصنیف کیے۔ ۵ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتیؒ نے آپ کے سوانح و حالات میں ''تذکرۃ الصالحین'' المعروف بہ ''تذکرہ رحمانیہ'' ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کی حسب ذیل عبارت سے بھی قاری صاحبؒ کی اس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے جو استاذ کی نظر میں ان کو حاصل تھی۔

> ''(شاہ محمد اسحاق صاحبؒ) جب دہلی سے روانہ ہو کر قطب صاحبؒ میں ٹھہرے اور تمام عمائد شہر دہلی مشائعت کو وہاں تک پہنچے تو ایک اہل حدیث عالم نے جو حضرت شاہ صاحبؒ کی موجودگی تک اپنے آپ کو حنفی کہا کرتے تھے شاہ صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت دہلی کو علم سے خالی کیے جا رہے ہیں اپنا کوئی جانشین مقرر فرما دیجیے۔ عمائد دہلی نے بھی اس قول کی ہمنوائی کی مگر حضرت شاہ صاحبؒ کچھ

---

[1] سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی دیوبندیؒ نے جو حضرت قاسم العلوم والمعارفؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ سے بھی اجازت حدیث حاصل کی تھی (تذکرۃ الکرام و تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرہ رحمانیہ) (فریدی)

خاموش رہے، دوسری بار عرض کیا گیا، تب بھی آپ چپ رہے، تیسری مرتبہ سب کے اصرار پر فرمایا ''ہم نے قاری عبدالرحمٰن اور نواب قطب الدین خاں کو حدیث پڑھا دی ہے ان سے استفادہ کرو۔'' (تذکرہ رحمانیہ ص۵۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''یکا یک حضرت شاہ صاحبؒ کا حج کا ارادہ ہو گیا اس وقت قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ بموجب حکم شاہ صاحبؒ ''باندہ'' میں علوم دینیات کی خدمت پر مقرر ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے سفر حج کی اطلاع بھیجی تو آپ فوراً دہلی چلے آئے اور اپنے شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھ سے حضور کی مفارقت گوارا نہیں ہو سکتی۔ اگر اجازت ہو تو ساتھ ہی چلا چلوں مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ فرما کر روک دیا کہ نہیں تمہیں ابھی بہت سے کام انجام دینے ہیں۔''

مولانا نواب قطب الدین خاں محدث دہلویؒ (صاحب مظاہرِ حق):

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں آپ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''الشیخ العالم الصالح الفقیه المحدث قطب الدین بن محی الدین الحنفی الدهلوی''

''آپ نے حضرت شاہ محمد اسحاق ابن افضل عمریؒ سے فقہ وحدیث کی کتابیں پڑھیں اور مدت دراز تک ان کی خدمت میں رہے۔

آپ بڑے زاہد ومتورع اور قانع وعفیف واقع ہوئے تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف وتالیف کی طرف آپ کو بہت رغبت تھی۔ علمی مباحثہ اور مذاکرہ کی طرف بھی خصوصی میلان تھا، فقہ وحدیث میں

آپ کی بہت سی کتابیں ہیں۔لوگوں نے آپ کے دروس وفتاویٰ اور تصنیفات سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا ہے۔''

صاحب ''مقالاتِ طریقت'' نواب صاحبؒ کی شخصیت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص چندے ان کی (نواب قطب الدین کی) خدمت میں جا کر اوقات و عادات کو قلمبند کرے تو ایک دوسری ''کیمیائے سعادت'' (تیار) ہو جائے۔''

آپ کی تصانیف یہ ہیں: (۱) جامع التفاسیر (اردو) (۲) مظاہر حق شرح مشکوٰۃ شریف بزبان اردو (چہار جلد) (۳) ظفر جلیل شرح حصن حصین (اردو) (۴) معدن الجواہر (۵) آداب الصالحین (۶) الطب النبویؐ (۷) توقیر الحق (۸) تنویر الحق۔ ان کے علاوہ بھی آپ کے بہت سے رسائل ہیں (۹) جامع الحسنات (۱۰) تحفۃ السلطان (فی مناقب خلفاء الراشدینؓ) (۱۱) تحفۃ الزوجین (۱۲) تحفۃ الاحباء (۱۳) سراج القلوب (۱۴) مانعۃ الزنا (۱۵) وظیفۂ[۱] مسنونہ

نواب قطب الدین خاں دہلویؒ کے مریدوں اور شاگردوں میں سے دہلی کے اندر یہ حضرات مشہور ومعروف ہوئے:

(۱) مولانا عبدالقادر صاحبؒ (۲) مولانا رحیم بخش عرف مفتی محمد مسعودؒ (۳) مولانا خواجہ ضیاء الدین جو شاگرد رشید ہونے کے ساتھ ساتھ خلیفۂ طریقت بھی تھے اور خلقت کی ہدایت میں مصروف رہتے تھے۔

نواب صاحبؒ نے عمر کے آخری حصہ میں ''حرمین شریفین'' کا سفر کیا اور ۱۲۸۹ھ

---

۱ احکام العیدین بھی نواب صاحبؒ کی کتاب ہے جو احقر کے مطالعہ میں رہی ہے اور اس وقت بھی موجود ہے۔ تعجب ہے کہ ''نزہۃ الخواطر'' اور ''مقالات طریقت'' (مؤلفہ محمد عبدالرحیم ضیاء) میں ''احکام العیدین'' کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ (فریدی)

میں ''مکہ معظمہ'' میں آپ کا انتقال[1] ہوا۔ آپ نے ۶۵ سال کی عمر پائی۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجددی فاروقی محدث دہلوی مہاجر مدنیؒ:

الشیخ العالم الامام المحدث عبدالغنی بن ابی سعید بن الصفی العمری الدهلوی. آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں تھے، ماہ شعبان ۱۲۳۴ھ میں بمقام دہلی آپ کی ولادت ہوئی۔ پہلے آپ نے قرآن مجید حفظ کیا بعدہٗ نحو اور عربی مولانا حبیب اللہ دہلویؒ سے پڑھی۔ پھر فقہ و حدیث کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ سے ''موطاء امام محمد'' پڑھی اور مشکوٰۃ شریف شاہ مخصوص اللہ ابن شاہ رفیع الدین دہلویؒ سے پڑھی۔ اپنے والد ماجد سے طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ بھی اخذ کیا اور ان کے ہمراہ ۱۲۴۹ھ میں سفر ''حرمین شریفین'' کیا اور حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ وہاں شیخ محمد عابد سندھیؒ اور ابوزاہد اسماعیل ابن ادریس رومیؒ سے سند حدیث حاصل کی۔ پھر ہندوستان آئے اور تدریس حدیث میں مشغول ہو گئے۔ بہت سے علماء نے آپ سے اخذ علم حدیث کیا ہے جن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نمایاں شخصیتیں ہیں۔

جب ۱۲۷۳ھ موافق ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ انقلاب برپا ہوا اور انگریز دارالسلطنت دہلی پر دوبارہ قابض ہوئے اور انھوں نے تشدد کے ساتھ باشندگان دہلی پر حکومت کی تو آپ اپنے بڑے بھائی اور خانقاہ سے تعلق رکھنے والے خاندانی افراد کے ساتھ ارض حجاز کی طرف متوجہ ہوئے۔

''مکہ معظمہ'' میں حاضر ہو کر ''رُکن و حطیم'' میں تجدید عہد کی اور پھر ''مدینہ منورہ'' میں قیام فرمایا۔ آپ کی جلالت شان پر ''ہند و حجاز'' کے لوگوں کا اتفاق ہے۔ ''سنن ابن ماجہ'' پر آپ نے ''انجاح الحاجۃ'' کے نام سے ایک نفیس حاشیہ لکھا ہے۔ ''مدینہ منورہ'' میں ۶ محرم

---

[1] ''مقالاتِ طریقت'' میں آپ کی وفات کا مہینہ رجب لکھا ہے اور یہ کہ آپ کا انتقال ''مدینہ منورہ'' میں ہوا۔ (فریدی)

بروز سہ شنبہ ۱۲۹۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور ''جنت البقیع'' میں مدفون ہوئے۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ: الشیخ العالم الفقیہ المحدث احمد علی بن لطف اللہ الحنفی الماتریدی السھارنپوری. آپ سہارنپور میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ''دہلی'' کا سفر اختیار کیا اور مولانا شیخ مملوک علی صاحب صدیقی نانوتویؒ سے تحصیل علم کی۔حضرت شیخ وجیہ الدین سہارنپوریؒ سے سند حدیث حاصل کی جو مولانا عبدالحیؒ بڈھانویؒ کے شاگرد تھے۔مولانا بڈھانویؒ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے پھر آپ ''مکہ معظمہ'' گئے اور سعادت ''حج''[1] سے بہرہ مند ہوئے وہاں آپ نے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ مہاجر مکی سے ''صحاح ستہ'' پڑھیں[2] اور ان سے اجازت بھی

---

[1] آپ کی ایک قلمی بیاض حاصل ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۲۵۹ھ میں سفر حج کو گئے تھے۔

[2] شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم نے تاریخ مظاہر علوم جلد اول میں مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے بارے میں جو ارقام فرمایا ہے یہاں اس کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے مزید معلومات حاصل ہوں گی۔

> ''حضرت مولانا (احمد علی سہارنپوری) کا تذکرہ مقدمہ اوجز اور مقدمہ لامع الدراری میں حواشی بخاری کے ذیل میں مختصر طور پر مذکور ہے۔مولانا نے تعلیمی سلسلہ کافی عمر گزر جانے کے بعد شروع فرمایا لیکن جب شروع کیا تو طالب علمی کا حق ادا کر دیا۔ حدیث پاک سید المحدثین حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق سے پڑھنے کا اشتیاق وارادہ تھا کہ اسی دوران میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ ہجرت فرما گئے (آپ نے ''مکہ معظمہ'' پہنچ کر حضرت شاہ محمد اسحاقؒ سے حدیث پڑھی) اور جملہ کتب حدیث اپنے دست مبارک سے لکھ کر پڑھیں جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ صبح کی نماز کے بعد سے ظہر کی نماز تک ''حرم شریف'' میں حدیث پاک کی کتب نقل کرتے اور ظہر سے عصر تک حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ سے پڑھتے۔حدیث پاک کی تمام کتابیں اسی طرح پڑھیں۔حضرت مولانا نہایت خوش قلم تھے ان کے دست مبارک کی لکھی ہوئی کتب کی بندے نے بھی زیارت کی ہے۔مولانا نوراللہ مرقدہ کا ''ابوداؤد شریف'' کا کامل نسخہ حضرت (مولانا خلیل احمدؒ) کے پاس ''بذل المجھود'' کی تالیف کے زمانہ میں ساتھ ساتھ رہا مولانا نے ۱۲۹۰ھ میں دہلی میں مطبع احمدیہ قائم کر کے اپنی جدوجہد..... مسلسل

حاصل کی۔ پھر ''مدینہ منورہ'' پہنچ کر خاکِ درِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ پھر اس کے بعد آپ ہندوستان واپس آئے یہاں درس وتدریس کا سلسلہ قائم کیا۔ اور تجارت کو ذریعہ معاش بنایا۔

آپ نے اپنی ساری عمر ''صحاح ستہ'' کی تدریس وتصحیح میں گزاری۔ خاص طور پر صحیح بخاری کی تدریس وتصحیح میں زیادہ وقت گزارا چنانچہ مسلسل ۱۰ سال تک بخاری شریف کی تصحیح کی خدمت انجام دیتے رہے اور اس پر مقدمہ اور ایک مبسوط حاشیہ بھی لکھا۔

آپ کی وفات مرض فالج میں ۶ / جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ موافق ۹ / دسمبر ۱۸۷۹ء کو سہارنپور میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

مسلسل........اور مساعی جمیلہ سے حدیث پاک کی کتب طبع کرنی شروع فرمائیں۔ مولانا نے جو مطبع دہلی میں قائم فرمایا تھا اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کا سب سے پہلا مطبع ہے جس نے حدیث کی کتابیں طبع کرائیں۔ بخاری شریف کا تحشیہ بھی مولانا نے خود ہی فرمایا تھا۔ البتہ آخر کے پانچ سیپاروں کا تحشیہ مولانا ہی کے شاگرد رشید قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف کے حواشی بھی مولانا (احمد علی) نے تحریر فرمائے تھے۔ آخر زمانہ میں کلکتہ میں تدریس کتب حدیث کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا کا قیام مدرسہ مظاہر علوم میں بھی چھ سال رہا ہے۔ اس مدت میں بلا معاوضہ درس حدیث دیا۔ دو طلباء کا کھانا آپ کے یہاں مقرر تھا۔ سالانہ جلسہ انعامی میں بخاری شریف کے کبھی پانچ نسخے، کبھی تین عدد، کبھی دو عدد نسخے مرحمت فرمایا کرتے تھے۔ مدرسہ کی اعانت خود بھی بڑے حوصلہ سے فرمایا کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ قدیم اور مسجد کے لیے دس ہزار کی رقم کا مہیا ہو جانا زیادہ تر آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حضرت مولانا کا وصال بمرض فالج ۶ / جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ شنبہ کے دن ہوا اور اپنے جدّی قبرستان متصل عیدگاہ (سہارنپور) میں تدفین ہوئی۔ حضرت مولانا کی عمر شریف تقریباً ۷۲ سال ہوئی۔''

مولانا احمد علیؒ کے سانحہ ارتحال سے دو یوم قبل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا وصال ۴ / جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ کو ہوا۔ (فریدی)

حضرت مولانا عالم علی مرادآبادیؒ: الشیخ العالم المحدث عالم علی بن کفایت علی بن فتح علی الحسینی النگینوی ثم المرادآبادی. آپ نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ پھر تحصیل علم کے لیے سفر اختیار کیا اور رامپور پہنچ کر مفتی شرف الدین رامپوری اور شیخ غفران ابن تائب افغانی سے کتب درسیہ پڑھیں۔اس کے بعد دہلی آئے۔مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ سے پڑھا۔حکیم نصر اللہ خاں دہلوی (تلمیذ حکیم شریف خاں دہلویؒ) سے تعلیم طب حاصل کی۔حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث پڑھی اور سند حاصل کی بعد فراغت، علم حدیث اور علم طب کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور مرادآباد میں سکونت پذیر ہوئے، آپ سے بہت سے علماء نے اخذ علم[1] کیا۔آپ کی تصانیف میں ایک مبسوط شرح ''ضابطۂ تہذیب'' پر ہے۔اس کے علاوہ ایک رسالہ ''تنقیح مخرج الضاد'' ایک رسالہ ''فضائل صیام'' میں اور ایک رسالہ ''فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' میں ہے۔آپ کی دو کتابیں اور ہیں جن کے نام ''الحجۃ البالغۃ'' اور ''الوثیقۃ الباہرۃ'' ہیں۔

آپ نے ۲۷[2]/رمضان ۱۲۹۵ھ کو وفات پائی۔مرادآباد کی جامع مسجد کے صحن میں بجانب جنوب آپ کا مزار ہے۔''بباغِ جنان باد مسکن'' سے آپ کی تاریخ وفات

---

[1] منجملہ ان کے مولانا حسن علی شاہ محدث رامپوریؒ بھی تھے جن کے صاحبزادے مولانا محمد شاہ محدث رامپوریؒ ہوئے۔مولانا محمد شاہؒ کے صاحبزادے مولانا حامد شاہ محدث قاضی رامپور تھے۔ان تینوں حضرات نے تمام عمر علم حدیث وفقہ کا درس اپنے وطن میں دیا جس سے ہزارہا تشنگانِ علوم فیضیاب ہوئے۔ایک بڑا کتب خانہ چھوڑا جو اپنی نظیر آپ ہے۔مولانا حامد شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے قاضی سید احمد شاہ صاحب کی نگرانی میں یہ عظیم کتب خانہ ان کے مکان پر اب بھی موجود ہے۔

مولانا عالم علیؒ کے تلامذہ میں سے مولانا عبد الحق حقانی صاحب تفسیر حقانی بھی ہیں۔مولانا حکیم محمد صدیق قاسمی مرادآبادیؒ نے بھی آپ سے حدیث پڑھی ہے۔صاحب ''نخبۃ التواریخ'' مولانا آلِ حسن نخشی امروہیؒ نبیرۂ قاری امام الدین نخشی امروہیؒ نے بھی آپ سے صحیح بخاری پڑھی ہے۔

[2] ترجمہ ''تذکرہ علمائے ہند'' میں آپ کی تاریخ وفات ۲۰/رمضان المبارک لکھی ہے۔(فریدی)

نکلتی[1] ہے۔ (ماخوذ از: نزہۃ الخواطر جلد ہفتم وتذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۰، ۲۶۱)

تذکرۂ کاملانِ رامپور مؤلفہ حافظ احمد علی خاں شوقؔ رامپوری میں ص ۱۸۹ پر آپ کے متعلق لکھا ہے:

''ریاست رامپور سے تیس روپے ماہانہ پاتے تھے، رامپور میں بھی قیام رہا۔ نہایت متورع اور زاہد تھے، بہت سے لوگ مرید تھے پابندئ سنت کا سخت لحاظ تھا[2]''

حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکورویؒ: الشیخ العالم الکبیر

المفتی عنایت احمد بن غلام محمد بن لطف اللہ الدیوی ثم الکاکوروی۔

آپ ۱۲۲۸ھ میں بمقام ''دیوہ'' ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ جب ۱۳ سال کی عمر ہوئی تو آپ نے رامپور کا سفر اختیار کیا اور صرف ونحو مولانا سید محمد بریلویؒ سے پڑھی۔ رامپور ہی میں مولانا حیدر علی ٹونکیؒ اور مولانا نور الاسلام ابن مولانا سلام اللہ[3] رامپوریؒ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور مدتوں ان کی خدمت میں رہے پھر دہلی کا سفر اختیار کیا اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد علی گڑھ پہنچے اور مولانا بزرگ علی مارہرویؒ کے درس میں برابر حاضر رہے اور ان سے کتب معقول وحکمت پڑھیں۔ جامع مسجد علی گڑھ کے مدرسہ میں مدرس ومعلم رہے جہاں پورے ایک سال تک پڑھایا۔ پھر حکومت وقت کی

---

[1] مولانا حکیم محمد صدیق قاسمی مرادآبادیؒ نے آپ کا قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے اس میں بھی ۲۰ تاریخ کا ہی ذکر ہے جس کے پہلے مصرعے میں وقت دن، تاریخ اور مہینہ ہے اور آخری مصرعہ بلا تعمیہ وتخرجہ مادہ تاریخ ہے۔ قطعۂ تاریخ

بعد عصر از پنج شنبہ بستم از ماہ صیام ☆ شد ز درد واقع جانکاہ عالم ممتلی

سال و حال آں ز صدیق حزیں باید شنید ☆ ہائے رحلت کرد سید مولوی عالم علی

۱۲۹۵ھ

مقالاتِ فریدی، جلد اول بعنوان فخانہ قاسمی کا ایک جرعہ نوش کی طرف مراجعت کی جائے۔ (محب الحق)

[2] مقالات طریقت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے خلیفۂ طریقت بھی تھے۔

[3] آپ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اولاد میں سے تھے۔ (فریدی)

طرف سے عہدئے منصف وقاضی پر فائز کیے گئے۔ مشاغل تدریس کے ساتھ ساتھ اس عہدہ کے فرائض انجام دینے میں بھی مشغول رہے۔ اس عہدہ پر دو سال فائز رہے۔ یہاں سے شہر بریلی کو تبادلہ ہو گیا اور صدر الامین بنا دیے گئے۔ چار سال کے بعد ترقی کر کے صدر الصدور بن گئے اور ''آگرہ'' کو منتقل کیے گئے۔ آپ کے آگرہ پہنچنے سے پہلے ہنگامہ ۱۸۵۷ء برپا ہو گیا۔ یہ ہنگامہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ دفعتاً حکومت انگلشیہ کا تختہ پلٹ گیا اور اس کا وقار واقتدار ختم ہو گیا۔ یہ ۱۲۷۳ھ تھا مگر انگریزوں نے دوبارہ پھر اقتدار حاصل کر لیا اور اہل ہند کے ساتھ بُری طرح پیش آئے۔ انھوں نے بڑی سختی سے اس ہنگامہ کو فرو کیا۔ اور اپنے باغیوں اور ان کے معاونین کو گرفتار کر لیا۔ مفتی عنایت احمد کا کوروی پر بھی بغاوت کا الزام قائم ہوا اور ان کے لیے جلاوطنی کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ جزائر انڈمان (کالا پانی) بھیج دیے گئے۔ اس جزیرے میں رہ کر باوجود فقدان کتب کے آپ نے بعض رسائل لکھے۔ جزائر انڈمان کا حاکم وقت چاہتا تھا کہ ''تقویم البلدان'' کو زبان عربی سے اردو میں منتقل کرے تا کہ پھر انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کرنا آسان ہو جائے۔ اس حاکم نے مذکورہ کتاب کو بعض دوسرے علماء کے سامنے بھی جو کہ اس جزیرے میں بستے تھے ترجمہ کے لیے پیش کیا تھا۔ مگر کسی نے اس کام کو قبول نہیں کیا تھا۔ جب مفتی عنایت احمدؒ کے سامنے یہ کام پیش کیا گیا تو انھوں نے قبول فرما لیا اور اردو میں اس کتاب کا ترجمہ کر دیا۔ حاکم جزیرہ نے اس ترجمہ کو بہت پسند کیا اور ان کو رہا کر دینے کی سفارش کی۔ چنانچہ آپ کالے پانی کی قید سے رہا کر دیے گئے اور ہندوستان واپس آ گئے۔ اب آپ ''مطبع نظامی'' کانپور کے مالک عبدالرحمٰن ابن روشن خاں حنفی لکھنوی کے اصرار پر کانپور میں رہنے لگے اور وہاں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ اس مدرسہ میں تین سال تک نحو کا درس دیا۔ پھر حج وزیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ جب جدہ پہنچنے کے قریب ہوئے تو جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور اس جہاز کا کوئی بھی آدمی نہیں بچ سکا (ماخوذ: از نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

آپ کی متعدد تصانیف ہیں اور بقولِ مؤلف ''تذکرہ مشاہیر کاکوری'' ان کتابوں کے ناموں کے اعداد سے تاریخیں برآمد ہوتی ہیں ان میں سے بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ''تذکرہ مشاہیر کاکوری'' سے ان کتابوں کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

(۱) علم الفرائض مطبوعہ (۲) ملخصات الحساب مطبوعہ (۳) تصدیق المسیح ردع کلم القبیح (۴) کلام المبین فی آیاتِ رحمت للعالمین مطبوعہ (۵) ضمان الفردوس مطبوعہ (۶) فضائل علم و علمائے دین (۷) فضائل درود و سلام مطبوعہ (۸) محاسن العمل الافضل مع التتمات مطبوعہ (۹) ہدایاۃ الاضاحی مطبوعہ (۱۰) الدر الفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید مطبوعہ (۱۱) وظیفہ کریمہ مطبوعہ (۱۲) علم الصیغہ[۱] مطبوعہ (۱۳) خجستہ بہار بطرز گلستاں (۱۴) ترجمہ تقویم البلدان (۱۵) نقشہ مواقع النجوم (۱۶) بیان قدر شب برأت مطبوعہ (۱۷) رسالہ در مذمت میلہ ہا (۱۸) احادیث الحبیب المتبرّکہ یعنی چہل حدیث مطبوعہ (۱۹) تواریخ حبیبِ الٰہ مطبوعہ

حضرت مولانا عبدالجلیل شہید علی گڑھیؒ: الشیخ العالم المحدث عبدالجلیل بن ریاض الدین الاسرائیلی الکوئلی۔ آپ ۱۲۲۵ھ میں شہر علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اکثر کتب درسیہ مولانا بزرگ علی ماہرویؒ سے پڑھیں اور فنون ریاضیہ میں کمال حاصل کیا۔ پھر آپ دہلی گئے اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آپ نے علم حدیث کی طرف پوری توجہ مبذول رکھی۔ کامیابی کے بعد اپنے شہر کو واپس ہوئے اور ایک زمانہ تک علوم دینیہ کا درس دیا۔ پھر آپ کو نواب محمود علی خاں نے چھتاری بلایا جہاں آپ نے ایک مدت تک قیام فرمایا اور درس و افادہ کا سلسلہ قائم کیا۔ آپ سے بہت سے علماء نے استفادہ کیا ہے۔ آپ اخلاق عالیہ کا کامل نمونہ تھے۔ حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ سے بیعت تھے اور ان کی صحبت بھی اُٹھائی تھی۔ تمام عمر ان کے

---

[۱] علم صرف کی یہ کتاب جزائر انڈمان میں لکھی گئی ہے۔ (فریدی)

طریقہ پر مستقیم رہے۔ ثورۂ ہندیہ یعنی ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے ایام میں انگریزوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ قمری حساب سے آپ کی تاریخ وسنہ شہادت ۷محرم ۱۲۷۳ھ تھی۔ علی گڑھ کی جامع مسجد کے اندر بجانب شمال آپ کا مزار ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا مفتی عبدالقیوم بڈھانوی ثم بھوپالیؒ: نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں آپ کے بارے میں اس طرح تحریر کیا گیا ہے۔

الشیخ الامام العالم الکبیر المحدث المفتی عبدالقیوم بن عبدالحئی بن ھبۃ اللہ بن نور اللہ الصدیقی البڈھانوی. آپ ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، جب قرآن مجید حفظ کر لیا تو حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت ہوئے اور صرف ونحو کی مختصر کتابیں شیخ نصر الدین نقشبندی دہلویؒ نواسۂ حضرت شیخ رفیع الدین محدث دہلویؒ سے پڑھیں۔ بعض کتب درسیہ مولانا نصیر الدین لکھنویؒ مقیم دہلی سے پڑھیں اور فنون ریاضیہ خواجہ نصیر الحسینی الدہلویؒ سے حاصل کیے۔ علم فرائض شاہ محمد یعقوب مہاجرؒ سے سیکھا۔ شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے فقہ و حدیث پڑھی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا۔ آپ نے طریقت کو شیخ محمد عظیمؒ سے حاصل کیا جو کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے اصحاب میں سے تھے اور ان کی خدمت میں مدتوں شہر ٹونک میں رہے۔ نیز شاہ محمد یعقوب صاحبؒ سے بھی طریقت کو اخذ کیا۔ آپ جب مع اہل وعیال حج سے واپس ہوئے اور بھوپال میں ٹھہرے تو اس وقت کی والیۂ بھوپال نواب سکندر جہاں بیگم نے آپ کو بھوپال میں سکونت پذیر ہونے کی دعوت دی اور افتاء کے عہدے پر مقرر کیا اور جاگیر بھی دی چنانچہ آپ بھوپال میں سکونت پذیر ہوگئے۔

آپ علم، حلم، تواضع، خندہ روئی، افادہ، تدریس، تذکیر اور حق گوئی میں اپنے اسلاف کے قدم بہ قدم تھے۔ وہاں آپ برابر قرآن و حدیث کے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے آپ سے علماء کی ایک بڑی تعداد نے علمی استفادہ کیا۔ آپ صادق

الفراست واقع ہوئے تھے اور بسا اوقات آپ کو الہام و کشف بھی ہوتا تھا۔ مجھ سے ثقہ لوگوں نے آپ کی بعض ایسی خصوصیات بیان کیں جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا۔ منجملہ ان خصوصیات کے بعض خرق عادات اور کرامات اور تعبیرات خواب بھی ہیں۔ تعبیر خواب میں آپ کی یہ شان تھی کہ خواب کی جو تعبیر دی اسی طرح ظہور میں آیا۔ یہ سب چیزیں ان اصحاب نفوس قدسیہ کے اندر ہوتی ہیں جو خواہشات دنیاوی کی آلودگی سے پاک وصاف ہوتے ہیں۔ آپ کے بہت سے خصائل محمودہ وفضائل مشہودہ ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز ابن شاہ ولی اللہؒ کے بقیہ رہط (گروہ) اور یادگار تھے۔ آپ کی وفات ۱۲۹۹ھ میں بڈھانہ ضلع مظفرنگر میں ہوئی۔ عمر تقریباً ستر سال کی ہوئی تھی۔ (نزہۃ الخواطر)

اور مقالاتِ طریقت میں آپ کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

''واقف اسرار خاندان شاہ ولی اللہیؒ مولانا حافظ حاجی مولوی عبدالقیوم صاحب دہلوی نزیل شہر بھوپال ابن مولانا مولوی عبدالحی ابن شیخ ہبۃ اللہ ابن مولوی شاہ نور اللہؒ... آپ کی ولادت ۱۲۳۱ھ میں ہے۔ غلام نقی تاریخی نام ہے اور عبدالقیوم، کہتے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا رکھا ہوا نام ہے۔ آپ نے قرآن مجید خورد سالی میں اپنے والد ماجد کے رو برو حفظ کیا اور اکثر صرف ونحو، منطق وعقائد وغیرہ کی کتابیں مولوی نصیر الدین شافعی لکھنوی مدنیؒ سے پڑھیں۔ اور تفسیر جلالین، ابن ماجہ، نسائی اور علمِ فرائض مولانا شاہ محمد یعقوبؒ سے اور اکثر صحاح مولوی سید محبوب علی دہلویؒ سے اور کچھ ہدایہ مولوی مفتی سید مراد سے اور باقی فقہ اور بخاری شریف اور کچھ بیضاوی اور معالم التنزیل، مدارک، درمنثور اور صحاح ستہ، قول الجمیل، حزب البحر، حصن حصین، مستدرک، دارقطنی اور دارمی سب کچھ جناب مولانا محمد اسحاق صاحبؒ سے پڑھا ہے اور سنا ہے اور اجازت عامہ من کل الوجوہ حسب قاعدہ محدثین اور بضابطہ مشائخ طریقت اجازت وخرقہ حضرت مولانا موصوف سے آپ کو حاصل ہے اور آپ کو بیعت بحسب ارادت واجازت وخلافت حضرت امام المسلمین سید احمد شہیدؒ سے ہے

اور حضرت سید صاحبؒ نے آپ کو ''کلاہ'' (ٹوپی) بھی پہنایا ہے اور بہت کچھ دعا آپ کے واسطے کی ہے۔ آپ کو روحانیت حضرت[1] شاہ عبدالعزیزؒ و سید احمد شہیدؒ سے بھی استفاضہ ہے۔ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بھی آپ کو چاروں طریقوں میں بیعت اوراذکار و اشغال کی صحت (واجازت) ہے۔ اور آپ حلقے میں اخوند عبدالعظیم خاں صاحبؒ کے جو کہ حضرت سید صاحبؒ کے عمدہ خلفاء سے تھے اکثر حاضر رہے ہیں..... آپ کو مولانا محمد اسحاق صاحبؒ سے نسبت دامادی بھی حاصل تھی۔ مولانا صاحب کی دختر مرحومہ و مغفورہ سے ایک دختر اور دو فرزند یعنی حافظ مولوی محمد یوسف صاحب اور مولوی حافظ محمد ابراہیم صاحب ہوئے۔ دونوں صاحبزادے عالم، فاضل، متقی، پرہیزگار، ذی علم و وقار اپنے خاندان کی یادگار ہیں۔ (مقالات طریقت)

الروضة الممطورة مؤلفہ مولانا ذوالفقار احمد بھوپالیؒ میں حضرت مفتی عبدالقیومؒ کے متعلق چند ایسی معلومات ملتی ہیں جو دوسری جگہ نہیں ہیں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں جو کچھ آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے اس کو بھی ہدیہ ناظرین کر دیا جائے:

''شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے داماد و شاگرد رشید مولانا محمد عبدالقیوم صاحبؒ خلف الصدق مولانا مولوی محمد عبدالحی صاحب صدیقیؒ معہ اپنے اہل و عیال کے بھوپال میں مقیم رہے ایک مدت تک عہدہ افتا کو زینت بخشی بعد کو ترک کر دیا اور اپنے خانہ فیض عاشیانہ میں جادۂ استقامت و سداد پر قائم دائم رہے۔ اوقات شریف کو علم تفسیر و حدیث و فقہ کی

[1] آپ سفر جہاد میں اپنے والد شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڑھانویؒ کے ہمراہ تھے۔ مولانا عبدالحی دہلی سے روانہ ہو کر اوائل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ میں چار باغ (سوات) میں جا کر سید صاحبؒ سے ملے تھے انھوں نے ۸ر شعبان ۱۲۴۳ھ میں بمقام خہر انتقال فرمایا۔ جناب غلام رسول مہر اپنی کتاب ''سید احمد شہید'' میں مولانا عبدالحی بڑھانویؒ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالحی کے اکلوتے بیٹے مولوی عبدالقیوم ساتھ تھے۔ سید صاحبؒ نے فرط شفقت سے انھیں سینہ سے لگا لیا اور بہت تسلی دی (سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۶) اور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالحیؒ کے صاحبزادے مولوی عبدالقیوم سید صاحبؒ کے ساتھ سرحد پہنچے تھے۔ مولانا کے انتقال کے وقت سے سید صاحبؒ مولوی عبدالقیوم کو اپنے ساتھ بیٹھا کر کھانا کھلاتے تھے (سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۷) (فریدی)

تدریس و تعلیم سے معمور کیا۔ یہاں کہ اہالی موالی، رئیس مرؤس سب ان کی صلاح و علم و فضل کے قائل و معتقد تھے۔ خوش اخلاق، خوش وضع، بے تکلف، حسن المحاضرہ تھے۔ تمام دن حدیث شریف کے درس میں گزرتا، ذکر فکر کا شغل رہتا، ستر حال (حال کو چھپانے) کو بہت پسند رکھتے تھے۔ وفات سے کئی ماہ پہلے خاکسار نے ترجمہ ''موضح قرآن'' ان پر پڑھا اور آٹھ دس پارے تفسیر جلالین کے سنائے۔ (اور انھوں نے) سند عطا فرمائی جو خاکسار کے پاس موجود ہے اور بیعت سے بھی مشرف فرمایا۔ بعدہ وطن بڈھانہ کا قصد فرمایا بھوپال سے روانہ ہو کر بنارس پہنچے وہاں کچھ اقامت فرما کے وطن روانہ ہوئے۔ سندیلہ تک پہنچے، ارادہ تھا کہ حضرت مولانا مولوی فضل رحمٰن دام ظلہم کی زیارت سے مشرف ہوں مگر بواسیر کی شدت ہوئی پہنچ نہ سکے، وہاں سے بخط مستقیم وطن پہنچے۔ مرض میں زیادتی ہوئی آخر کو ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔ اپنے وطن میں مدفون ہوئے اور یہی ان کی خواہش دلی تھی۔ اللہ سبحانہ نے ان کی تمنا پوری کی چونکہ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت قلبی تھی اور اکثر اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مرکوز خاطر عاطر رہتا تھا۔ اس لیے عجیب حسن اتفاق ہوا کہ سال وفات میں دو بار قرآن شریف کا دور فرمایا۔

حضرت مولانا صاحب مرحوم کے دو صاحبزادے تھے اور ایک صاحبزادی تھیں اول بعد انتقال ان کی صاحبزادی صاحبہ کا انتقال ہوا من بعد میاں ابراہیم صاحب مرحوم فرزند خورد کا انتقال ہوا۔ مولوی یوسف صاحب ولد اکبر موجود ہیں۔ مگر ایک مدت سے مرض سخت میں گرفتار ہیں۔ اللہ جل شانہ شفائے عاجل عنایت فرمائے، یہ بھی مثل اپنے والد ماجد مرحوم کے درس حدیث شریف میں مشغول رہتے ہیں، نہایت صالح و متدین ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے آمین'' (الروضۃ الممطورہ)

حضرت مولانا محمد مظفر حسین کاندھلویؒ: صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے آپ کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''الشیخ العالم الفقیہ الصالح مظفر حسین بن محمود بخش الحنفی الکاندھلوی''

آپ تورع، استقامۃ علی الشریعہ اور اتباع سنت میں اپنے زمانہ کے اندر ممتاز تھے۔ آپ مشتبہ لقمہ کبھی نہیں کھاتے تھے اور اگر ناواقفیت کی بنا پر مشتبہ لقمہ کھا لیتے تھے تو معدہ قبول نہیں کرتا تھا۔ ابتداً آپ نے اپنے عم محترم مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ سے پڑھا اور مدتوں ان کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم کرتے رہے۔ پھر ان کی وفات کے بعد دہلی کا سفر کیا اور شاہ محمد یعقوب[1] دہلویؒ سے علم حاصل کیا۔ آپ نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے بھی ملاقات کی اور ان سے استفادہ کیا۔ آپ نے نکاحِ بیوگان کی اشاعت کے سلسلے میں بیحد کوشش کی اور اس سلسلہ میں بہت سی مشقتیں جھیلیں۔ آپ نے دو[2] حج کیے، پہلا حج کر کے ہندوستان واپس آ گئے اور دوبارہ سفرِ ''حرمین شریفین'' کیا، جب دوسرا سفر حج کیا اور ''مکہ معظّمہ'' پہنچے اس وقت ان کے پیر و مرشد شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ مہاجر مکی کا وصال ۱۲۸۲ھ میں ہوا۔ آپ نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھی۔ پھر (بعد ادائے حج) ''مدینہ منورہ'' کو روانہ ہوئے اور اثناء راہ میں مریض ہو گئے، جب ''مدینہ منورہ'' پہنچے تو اس دنیائے فانی سے انتقال کر کے آغوشِ رحمت الٰہی میں پہنچ گئے۔ تاریخ انتقال ۱۰؍محرم ۱۲۸۳ھ شب پنج شنبہ ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم مؤلفہ حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ)

---

[1] غالباً شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی جگہ سہواً شاہ محمد یعقوبؒ کا نام لکھا گیا ہے۔ دراصل مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ ممکن ہے شاہ محمد یعقوبؒ سے بھی کچھ پڑھا ہو۔ البتہ شاہ محمد یعقوب دہلویؒ مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کے شیخ طریقت و پیر و مرشد تھے۔

[2] مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ نے حالات مشائخ کاندھلہ میں لکھا ہے کہ آپ نے چھ حج کیے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (فریدی)

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مرحوم نے ''حالات مشائخ کاندھلہ'' میں مولانا مظفر حسینؒ کا جو ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''آپ ۱۲۲۰ھ میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے عم محترم حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ سے حاصل کی۔ بعدہٗ دہلی گئے اور وہاں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث پڑھی اور ظاہری و باطنی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔''

حضرت مولانا مظفر حسینؒ کے یہاں درس و تدریس کا سلسلہ نہ تھا، ایک سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے، کبھی کبھی مسجد میں اور کبھی گھر میں وعظ فرماتے تھے۔ اندازِ بیان سادہ ہوتا تھا مگر قلوب میں اترتا جاتا تھا اور تمام شکوک و شبہات سے دل کو صاف کر دیتا تھا۔ مجلس وعظ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا رحمت خداوندی بارش کی طرح آسمان سے برس رہی ہے اور ''پژمردہ قلوب'' کو سرسبز و شاداب کر رہی ہے۔

آپ ریاضات، مجاہدات، عبادات اور طاعات میں مشغول اور سرگرم رہتے تھے۔ رمضان المبارک میں تمام رات عبادات میں گزارتے اور ایک لمحے کے لیے نہ سوتے تھے اور نہ بستر پر لیٹتے تھے، روزِ حشر کے خوف سے ہر وقت آنسو آنکھوں سے جاری رہتے تھے۔ کبھی جلالِ ایزدی کے خوف سے چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا اور کبھی جمالِ رحمانی کے تصور سے چہرہ گلاب کی طرح سُرخ ہو جاتا تھا۔ زہد و تقویٰ خصوصی شعار تھا جو بچپن سے طبیعت میں ودیعت رکھا ہوا تھا، کبھی طاعت خداوندی اور اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تجاوز نہ کرتے تھے اور اپنے تمام دینی اور دنیاوی امور اور ظاہری و باطنی مہمات اور مشکلات کو ہمیشہ قرآن و حدیث کے موافق پورا کرتے تھے اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی میں ہمیشہ سرگرم رہتے تھے اور سنت نبویہ کے احیاء میں اپنی ساری مساعی اور پوری جد و جہد کو صرف کرتے تھے اور یہ کوشش کرتے تھے کہ کوئی کام اللہ اور رسول کی رضا کے خلاف سرزد نہ

ہو اور کوئی قدم سنت کے خلاف زمین پر نہ رکھتے تھے۔ (ماخوذ: از سفینۂ رحمانی)

ایک مرتبہ آپ کے پیر و مرشد حضرت شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ سے کسی آدمی نے سوال کیا کہ صحابہ کرامؓ کی وضع قطع کیسی تھی؟ شاہ صاحبؒ نے فرمایا ذرا صبر کرو تھوڑی دیر بعد مولانا مظفر حسینؒ آگئے، حضرت شاہ محمد یعقوبؒ نے اس سائل کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اصحاب پاکؓ کا نمونہ اس وقت دنیا میں مولوی مظفر حسین موجود ہیں۔ جس شخص کو وضع، لباس اور صورت و سیرت اصحاب کرامؓ سے اپنی آنکھوں کو منور کرنا منظور ہو وہ مولوی مظفر حسین کو دیکھ لے۔ (منقول از اوراق مولانا محمد سلیمان کاندھلویؒ)

''حالاتِ مشائخ کاندھلہ'' میں بحوالہ ''ارواح ثلاثہ'' یہ واقعہ بھی درج ہے:

''ایک مرتبہ نواب قطب الدین خاں صاحب نے شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ، مولانا (شاہ) محمد یعقوب صاحبؒ، مولوی مظفر حسین صاحب اور چند دوسرے احباب کی دعوت کی۔ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے دعوت منظور فرمالی اور مولوی (شاہ) محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی مگر مولوی مظفر حسین صاحبؒ نے منظور نہ فرمائی۔ اس سے نوّاب قطب الدین خاں کو ملال ہوا اور انھوں نے شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے شکایت کی کہ میں نے مولوی مظفر حسین صاحب کی بھی دعوت کی تھی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ شاہ محمد اسحاق صاحب نے مولوی مظفر حسین پر عتاب فرمایا اور فرمایا ارے مظفر حسین! کیا نواب قطب الدین خاں کا کھانا حرام ہے؟ انھوں نے فرمایا ''حاشا و کلا'' مجھے نوّاب صاحب پر اس قسم کی بدگمانی نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا پھر تو کیوں انکار کرتا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت نوّاب صاحب نے آپ کی بھی دعوت کی ہے اور (آپ کے بھائی) مولوی محمد یعقوب صاحب کی بھی اور ان کے علاوہ اتنے اور آدمیوں کی اور وہ آپ کو پالکی میں لے جائیں گے اس میں بھی ضرور صرف ہوگا اور نوّاب صاحب گو بگڑ گئے ہیں مگر پھر نوّاب زادے ہیں دعوت میں ضرور نوابانہ تکلف بھی کریں گے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہے نوّاب

صاحب مقروض بھی ہیں۔ پس یہ مقروض ہیں اور جتنا روپیہ وہ دعوت میں صرف کریں وہ ان کی حاجت سے زائد بھی ہے تو یہ روپیہ وہ اپنے قرض میں کیوں نہیں دیتے؟ ایسی حالت میں ان کا کھانا کراہت سے خالی نہیں، یہ بات شاہ صاحب کے ذہن میں بھی آ گئی اور شاہ صاحبؒ نے فرمایا میاں قطب الدین! اب ہم بھی تمہارے یہاں کھانا نہ کھائیں گے۔"

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی دیوبندیؒ نے بیان فرمایا کہ مولانا مظفر حسین کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں ایک بوڑھا ملا جو بوجھ لیے ہوئے جاتا تھا بوجھ کسی قدر زیادہ تھا۔ اس وجہ سے اس سے مشکل سے چلتا تھا۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے جب یہ حال دیکھا تو آپ نے اس سے وہ بوجھ لے لیا اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس بوڑھے نے ان سے پوچھا کہ اجی تم کہاں رہتے ہو؟ انھوں نے کہا میں کاندھلہ رہتا ہوں اس نے کہا وہاں مولوی مظفر حسین صاحب بڑے ولی ہیں۔ اور ان کی بہت تعریف کی۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے فرمایا اور تو اس میں کوئی بات نہیں البتہ نماز ضرور پڑھ لیتا ہے۔ اس نے کہا واہ میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہتے ہو۔ مولانا نے فرمایا میں ٹھیک کہتا ہوں اس پر وہ بوڑھا ان کے سر ہو گیا۔ اتنے میں ایک اور شخص آ گیا جو مولانا مظفر حسین صاحبؒ کو جانتا تھا۔ اس نے اس بوڑھے سے کہا بھلے مانس مولوی مظفر حسین یہی تو ہیں۔ اس پر وہ بوڑھا ان سے لپٹ کر رونے لگا۔ مولانا بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔

مولانا مظفر حسین صاحبؒ انتہائی سادہ اور بے تکلف تھے۔ ایک مرتبہ گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ملنے گئے۔ چلتے وقت حضرت گنگوہیؒ نے کہا کھانا تناول فرما لیجیے۔ فرمایا بھائی دور کا سفر ہے میری منزل کھوٹی ہوگی۔ حضرت گنگوہیؒ نے کہا جو کچھ رکھا ہے وہی سہی۔ مولانا راضی ہو گئے اور فرمایا کہ بس وہی لے آنا جو گھر میں موجود ہو۔

گھر میں باسی روٹی اور دال رکھی تھی۔ حضرت گنگوہیؒ وہی ہاتھ پر رکھ کر لے آئے۔ دال بھی روٹی پر رکھی تھی پھر نہیں معلوم مولانا نے کھائی یا ساتھ باندھ لی پھر مولانا

مظفر حسینؒ نے ''رام پور منہیاراں'' پہنچ کر حضرت حکیم ضیاء الدینؒ سے فرمایا کہ مولوی رشید احمد صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں، حضرت بہت اچھے آدمی ہیں۔ پھر فرمایا اجی بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ پھر فرمایا اجی تم سمجھے تو ہو نہیں ایسے اچھے ہیں کہ بہت ہی اچھے۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ایسی کیا خاص بات ہوئی؟ فرمایا کیا کہوں انھوں نے تھوڑا سا ناشتہ کرنے کے لیے راستہ میں مجھ سے کہا میں نے کہا جو کچھ گھر میں موجود ہو وہ لے آؤ۔ انھوں نے باسی روٹی اور دال لے کر دے دی۔ سبحان اللہ! کیسے اچھے آدمی ہیں۔

حضرت مولانا مظفر حسینؒ ایک مرتبہ ''نانوتہ'' تشریف لے گئے، وہاں اس وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ موجود تھے۔ فرمایا بھائی ایک مسئلہ میں تردد ہے، میں نے سنا تھا کہ سب صاحبزادے جمع ہیں اس لیے مسئلہ پوچھنے آیا ہوں، وہ مسئلہ یہ ہے کہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے میں علماء اختلاف کرتے ہیں۔ بس تم لوگ آپس میں گفتگو کر کے ایک منقح (صاف) بات بتلا دو کہ جائز ہے یا نہیں؟ میں دلائل نہیں سنوں گا چنانچہ سب حضرات نے گفتگو کی اور مولانا نے اُدھر التفات بھی نہ فرمایا۔ گفتگو کر کے ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت طے ہو گیا جائز ہے۔ فرمایا اچھا تو میں جاتا ہوں۔ ان بزرگوں کو حضرت مولانا مظفر حسینؒ سے خاص عقیدت و محبت تھی اور سب ان کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ابتدا میں امامت سے بھی گھبراتے تھے اور وعظ بھی نہ کہتے تھے۔ حضرت مولانا مظفر حسینؒ نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے پھر تحریر فرمایا ہے حضرت مولانا مظفر حسینؒ اس آخری زمانہ میں قدما کا نمونہ تھے۔ تقویٰ اللہ اکبر! ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ مشتبہ چیز اگر معدہ میں پہنچ گئی تو اسی وقت قے ہو جاتی تھی اور اتباع سنت تو

نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا۔ سبحان اللہ! (بحوالہ سوانح قاسمی)

حضرت مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ جو حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے والد اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے استاد تھے۔ ''دہلی'' میں سرکاری مدرسہ ''دارالبقاء'' میں مدرس تھے۔ نانوتہ اور دہلی کے درمیان آمد ورفت میں راستہ میں کاندھلہ پڑتا تھا۔

حضرت مولانا مظفر حسینؒ نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ کاندھلہ میں مل کر جایا کرو۔ حضرت مولانا مملوک علیؒ نے کہا تکلف نہ کرنا صرف ملنے کے لیے کچھ دیر ٹھہر جایا کروں گا۔ چنانچہ مولانا مملوک علی صاحب ہمیشہ دہلی آتے اور جاتے جب کاندھلہ سے گزرتے تو باہر سڑک پر (بیل) گاڑی کو چھوڑ کر ملنے آتے۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ اول یہ پوچھتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے اگر کہا کھا چکا تو پھر کچھ نہیں اور نہ کھائے ہوئے ہوتے تھے تو کہہ دیتے میں کھاؤں گا۔ مولانا پوچھتے کہ رکھا ہوا لا دوں یا تازہ پکوادوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ رکھا ہوا لا دو اس دفعہ صرف کھچڑی کی کھرچن تھی۔ اسی کو لے آئے اور فرمایا رکھی ہوئی تو یہی تھی انھوں نے کہا بس یہی کافی ہے۔ پھر جب رخصت ہوتے تو مولانا مظفر حسین صاحبؒ ان کو گاڑی تک پہنچانے جاتے تھے۔ یہی ہمیشہ کا معمول تھا۔

حضرت مولانا مظفر حسینؒ بالکل سادہ وضع قطع رکھتے تھے ایک گاڑھے کا کرتا ایک پاجامہ ایک نیلی لنگی۔ یہ آپ کا لباس اور کل اثاثہ ہوتا تھا۔ میری دادی صاحبہ (مولانا احتشام الحسن کی) یعنی حضرت مولاناؒ کی صاحبزادی فرماتی تھیں کہ ایک بار میں نے موٹی ململ کا کرتا حضرت کے لیے سیا اول تو زیب تن کرنے سے انکار فرمایا پھر میری خوشنودگی کو پہنا مگر جمعہ کی نماز پڑھ کر فوراً اتار دیا اور فرمایا کہ میرا گاڑھے کا کرتا دے دو۔ اس میں عُجب پیدا ہوتا ہے۔

آپ سواری پر کم سوار ہوتے تھے اور اکثر پیدل سفر کرتے تھے۔ سامان سفر لوٹا، لنگی اور مشکیزہ ہوتا تھا۔ جہاں شام ہو جاتی وہیں شب بسر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شام

ایک ایسے گاؤں میں ہوئی جہاں سب ہندو تھے کوئی مسلمان نہ تھا۔ وہاں والوں سے کہا کہ رات کو رہنے کے لیے کوئی جگہ بتا دو تو ایک شخص نے گاؤں کے باہر کولھو پر بتا دیا۔ آپ کے پاس روٹی تھی اس کو تناول فرمایا اور اسی جگہ قیام کیا۔ اتفاقاً وہی شخص رات کو کسی کام کے لیے جنگل میں آیا تو حضرتؒ کو قرآن پڑھتے سنا۔ تمام رات بیتابی سے گزاری اور صبح کو حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ رات جو تو پڑھ رہا تھا وہی جلدی سے مجھے بھی پڑھا دے۔ اس کے بعد آپ کو اپنے گھر لے گیا اور اس کے بیوی بچے وغیرہ سب مسلمان ہو گئے۔ آپ بہت منکسر المزاج تھے، اپنا ہر ایک کام خود کیا کرتے تھے بلکہ دوسروں کے کام بھی کیا کرتے تھے۔ عادت شریفہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور جو جو گھر اپنے اقارب کے تھے ان میں تشریف لے جاتے اگر کسی کو بازار سے کچھ منگوانا ہوتا تو پوچھ کر وہ لا دیتے تھے۔ پیسہ اس زمانہ میں کم تھا جو شے آتی تھی وہ غلّہ کی آتی تھی۔ آپ غلّہ کبھی کرتے کے پلّے میں لے جاتے اور کبھی لنگی میں۔

بیوہ کے نکاح کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا آپ کو فکر ہوئی کہ اس رسم کو توڑنا چاہیے چنانچہ آپ نے اس رسم کو توڑا (اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے)

حضرت مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ بیان فرماتے ہیں کہ بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً حضرت مولانا مظفر حسینؒ سے ہوئی اور والد صاحب مرحوم نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجراء فرمایا اور ان دونوں بزرگوں کے قدم بقدم حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اس کو پورا شائع کیا۔ یہ اجران صاحبوں کے نام اعمال میں تا قیامت رہے گا۔

آپ نے ٦ حج کیے آخری حج کے متعلق مولانا احتشام الحسن صاحبؒ لکھتے ہیں حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کا خط آیا کہ تم یہاں (مکہ) چلے آؤ۔ اس خط کو مولانا نور الحسن صاحبؒ نے چھپا لیا تھا۔

دادی صاحبہ فرماتی تھیں کہ تیرے دادا نے ایک مرتبہ ململ کا کرتا سلوایا اس میں گریبان میں تکمہ اور گھنڈی کے بجائے سیپ کے بٹن لگوائے جس کو وہ جمعہ کے دن پہنتے تھے اور نماز پڑھتے ہی آ کر اُتار دیتے تھے کہ کہیں والد صاحب (مولانا مظفر حسین) کی نظر نہ پڑ جائے۔ ایک دفعہ میں اس کو رکھنا بھول گئی اور چارپائی پر پڑا رہا۔ والد صاحب تشریف لائے تو ان کی نظر پڑ گیا۔ بہت غور اور افسوس کے ساتھ اس کو دیکھا اور فرمایا کہ بی اب اس گھر میں فیشن آ گیا۔ ہمارا اب یہاں گزر نہیں ہو سکتا اور حج کا ارادہ فرمالیا تب مولانا نورالحسن صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کا مکتوب گرامی بھی دکھلا دیا۔ یہ روانگی روز شنبہ ۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۲۸۱ھ کو ہوئی اور روانگی سے قبل اپنے خاندان کی مستورات کو جمع کیا اور فرمایا۔ تم ان چار کتابوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا اور مولویوں کی انھیں باتوں کو ماننا جو ان کے موافق ہوں اور انھیں کتابوں کو قبول کرنا جو ان کے موافق ہوں۔ وہ چار کتابیں یہ ہیں: (۱) تفسیر موضح قرآن تصنیف حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ (۲) مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ شریف (۳) ترجمہ مشارق الانوار (۴) ترجمہ ہدایہ۔

یہاں سے روانگی کے بعد ابھی آپ ''مکہ مکرمہ'' نہ پہنچے تھے کہ مرض اسہال لاحق ہو گیا۔ ''مکہ مکرمہ'' میں آپ نے حضرت حاجی امداد اللہؒ سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ ''مدینہ منورہ'' میں موت آئے مگر بظاہر اب میری موت کا وقت قریب آ گیا۔ آپ مراقبہ کیجیے انھوں نے مراقبہ کے بعد فرمایا کہ نہیں آپ ''مدینہ منورہ'' پہنچ جائیں گے۔ کچھ روز کے بعد آپ اچھے ہو گئے جب آپ ''مدینہ منورہ'' گئے تو ایک منزل باقی تھی کہ آپ پھر بیمار ہو گئے اور ۱۰؍ محرم ۱۲۸۳ھ موافق ۲۵؍ مئی ۱۸۶۶ء بروز جمعہ انتقال فرمایا اور نزدیک قبر حضرت عثمان غنیؓ مدفون ہوئے۔ ۶۲ سال کے قریب عمر ہوئی۔ کرتا، پاجامہ، لنگی، لوٹا اور مشکیزہ آپ نے چھوڑا۔

[1] مولانا احتشام الحسن صاحب کے دادا مولانا ضیاء الحسن ابن مولانا نورالحسن کاندھلوی مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کے داماد تھے۔ (فریدی)

حسب وصیت لوٹا اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا لنگی مریدین میں تقسیم کر دی گئی کرتا اور پاجامہ صاحبزادیوں کے پاس بھیج دیا گیا جس میں کرتا مبارک موجود ہے۔

حضرت مولانا مظفر حسینؒ نے وہاں پہنچ کر جو خط صاحبزادیوں کے پاس بھیجا وہ میرے (مولانا احتشام الحسن کے) پاس موجود ہے۔ تبرکاً اس کو نقل کیے دیتا ہوں:

''بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین اما بعد! از اضعف العباد محمد مظفر حسین بہ برخوردار پیارا راحت دل بی بی امتہ السبحان وامتہ الرحمٰن وامتہ المنّان بعافیت باشند۔ بعد السلام علیکم واشتیاق ملاقات کہ معلوم کریں۔ میں اس جگہ (مکہ) بخیریت پہنچا اور بخیریت ہوں اور حاجی امداد اللہ صاحب نے واسطے جانے میرے کے ہندوستان کو ہر چند حضرت پیر و مرشد صاحب (شاہ محمد یعقوب صاحب) کو کہا لیکن اجازت نہ پائی۔ اس واسطے میں لاچار ہوں اور تمہارا خیال اکثر رہتا ہے اور تم کو چاہیے کہ تم خدا سے دعا کرو کہ جو میرے حق میں دین اور دنیا میں بہتر ہو وہ ظہور میں لاوے اور تم کو چاہیے کہ اللہ کی رضامندی ہر کام میں لحاظ رکھو اور خدا کے حکم کے آگے اور اتباع سنت کے (آگے) کسی کا خیال نہ کرو اور یہی بات آخرت میں کام آوے گی۔ باقی سب قصے جھگڑے یہاں کے یہیں رہیں گے۔ جو کام اللہ کے واسطے کیا وہی ساتھ جائے گا اور صبر اور تسلی سے رہنا کہ صبر آدھا ایمان ہے اور یہی مضمون والدہ امتہ المنان کو بھی معلوم ہووے اور بخدمت سب صاحبوں کے سلام کہنا اور سب سے دعا کے واسطے کہنا کہ میرے

واسطے دعا کریں..... زیادہ والسلام۔"

حضرت مولانا مظفر حسینؒ کے یہاں بیعت و تلقین کا سلسلہ جاری تھا اور ہر جگہ بکثرت لوگ آپ سے مرید ہو کر کتاب و سنت کے شیدائی بن جاتے تھے۔

حافظ محمد یوسف صاحب (نانا شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے) اور ان کے بھائی حافظ محمد یونس صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا مظفر حسینؒ کی یہ ایک خاص کرامت اور برکت تھی کہ جو بھی ان سے مرید ہو گیا اس کی پھر تہجد کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ اس ناچیز (احتشام الحسن) کو بھی حضرت مولاناؒ کے جس مرید سے ملنے کا اتفاق ہوا اس کو تہجد اور نوافل مسنونہ اور اوراد مسنون کا پابند پایا جن کی صورتوں سے ایمانیت اور نورانیت عیاں نظر آتی تھی۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ مولانا مظفر حسینؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"أَمَّا الشَّيخ مُظَفَّر حُسَيْن الْكَانْدهلَوى فَكَانَ وَرِعاً تَقِياً آمِراً بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَاهِياً عَنِ الْمُنْكَرِ، اَخَذَ عَنْ عَمِّهِ المفتى الٰهى بخش، وَ عَنِ الصَّدْرِ الْحَمِيْدِ مولانا محمد اسحاق، وَاسْتَرْشَدَ عَنْ مولانا محمد يعقوب الدهلوى وَ كَانَ نَائِبَهُ فِي الْهِنْدِ. وَ هُوَالَّذِى اَجْلَسَ شَيْخَ الْإِسْلَام مولانا محمد قاسم بالديوبندى عَلٰى مِنْبَرِ الْوَعْظِ."

(ماخوذ: از کتاب التمہید حاشیہ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۸۲)

"ترجمہ: شیخ مظفر حسین کاندھلوی بہت متقی و پرہیز گار بزرگ تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل تھے۔ انھوں نے اپنے عم محترم مفتی الٰہی بخش صاحبؒ اور صدر حمید مولانا شاہ محمد اسحاقؒ سے علم حاصل کیا اور شاہ محمد یعقوب دہلویؒ سے فیض باطن حاصل کیا اور

ہندوستان میں وہ ان کے نائب و خلیفہ تھے۔ مولانا مظفر حسینؒ وہ ہیں
جنھوں نے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم (نانوتوی) دیوبندیؒ کو سب
سے پہلے منبر وعظ پر بٹھایا۔"
حضرت مولانا مظفر حسینؒ نے تین صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔

(۱) بی بی امتہ السبحان (۲) بی بی امتہ الرحمٰن (۳) بی بی امتہ المنان۔ بی بی امتہ السبحان اور بی بی امتہ المنان لاولد فوت ہوئیں۔ بی بی امتہ الرحمٰن کی شادی مولانا ضیاء الحسن ابن مولانا نور الحسن صاحب سے ہوئی جو اپنے والد بزرگوار کا صحیح نمونہ تھیں اور اپنے زمانہ کی رابعہ بصریہ تھیں[1]۔

آخر میں دہلی کے مشہور واعظ مولانا محمد حسین فقیر دہلویؒ کے حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کی مدح میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

میرے مرشد میرے کامل پیشوا ☆ عالم دیں نائب خیر الوریٰ
نام ان کا ہے مظفر اس لیے ☆ حق کے منصور و مظفر آپ تھے
عالم عارف تھے صاحبِ دل تھے وہ ☆ علم ظاہر میں بڑے کامل تھے وہ
وعظ میں ان کے عجب تاثیر تھی ☆ ہر نصیحت آپ کی اکسیر تھی
ان سے عالم سیکھتے تھے دین حق ☆ ان سے سب درویش لیتے تھے سبق
اور بھی ہیں اتنے اوصاف ان کے نیک ☆ یہ ہوئے گویا بیاں سو میں سے ایک
ایسے کم ہوتے ہیں ذیشان و رفیع ☆ تھے جو وہ مغفور مدفونِ بقیع

(ماخوذ: از تعلیم الحیاء ص ۲۳۰)

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ: صاحب نزہۃ الخواطر حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی الحسنیؒ آپ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں: الشیخ العلامۃ

---

[1] یہ بی امی کہلاتی تھیں اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی نانی اور مولانا احتشام الحسن صاحبؒ کی دادی تھیں۔

المحدث المسند المعمّر صاحب المقامات العلية والكرامات المشرقة الجليلة شرف الاسلام فضل رحمٰن بن اهل الله بن محمد فياض بن بركت الله بن عبدالقادر بن سعدالله بن نورالله المروف به نور محمد بن عبداللطيف بن عبدالرحيم بن محمد الصديقي الملانوی ثم المرادآبادی

آپ ۱۲۰۸ھ میں ''ملاّ نواں'' میں پیدا ہوئے آپ نے مولانا نور ابن انوار انصاری لکھنوی فرنگی محلیؒ وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ پھر شیخ حسن علی محدث لکھنویؒ کی ہمراہی میں دہلی کا سفر کیا۔ وہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، شاہ غلام علی دہلویؒ اور شاہ محمد آفاقؒ وغیرہم سے ملاقات کی اور حدیث مسلسل بالاولیۃ اور حدیث مسلسل بالمحبۃ کو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے سنا۔ ان سے صحیح بخاری کا کچھ حصہ بھی سنا پھر اپنے وطن لوٹ آئے اور وہاں پر کچھ عرصے ٹھہرے پھر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی وفات کے بعد دوبارہ دہلی کا سفر کیا اور ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی خدمت میں رہے۔ اور ان سے کتب ''صحاح ستہ'' پڑھیں اور سلوک طریقت حضرت شاہ محمد آفاق نقشبندی دہلویؒ سے طے کیا۔ آپ ان کی خدمت میں مدتوں رہے یہاں تک کہ علم و معرفت میں حصۂ وافر پایا۔ پھر اپنے وطن کو لوٹے اور وہاں پر ایک زمانہ تک مقیم رہے۔ جب آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا تو آپ ''گنج مرادآباد'' کو منتقل ہوگئے جو ملاّ نواں سے چار میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں پر نکاح کر کے سکونت پذیر ہوگئے۔ اس زمانہ میں آپ سفر کو اقامت پر ترجیح دیتے تھے۔ اکثر اوقات آپ لکھنو، کانپور، بنارس اور قنوج وغیرہا کی طرف جاتے تھے۔ اس زمانہ میں آپ اکثر مطابع میں تصحیح مصحف کا کام کرتے اور تدریس حدیث میں مشغول رہتے تھے۔

جب آپ کی عمر زیادہ ہوگئی تو آپ نے سفر کرنا ترک کر دیا اور گنج مرادآباد ہی میں یکسو ہو کر بیٹھ گئے۔ وہاں آپ کے پاس لوگوں کا اس طرح ہجوم ہوتا تھا جس طرح پیاسوں کا پانی کے چشموں پر ہوتا ہے۔ تحفے اور ہدیے پے در پے آپ کی طرف آتے تھے۔ بڑے

بڑے امرا اور رؤسا آپ کے سامنے سر تواضع خم کرتے تھے۔ لوگ ہر طرف سے آپ کے پاس آتے تھے یہاں تک کہ آپ ہندوستان میں اپنے زمانہ کی ایک منفرد شخصیت بن گئے تھے۔ اللہ کی طرف سے آپ کو جو قبولیت عامہ حاصل ہوئی وہ آپ کے زمانہ کے مشائخ میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ میں نے جن لوگوں کو دیکھا ہے اور جن کو جانتا ہوں ان میں آپ اتباع سنت اور پیروی اخلاق محمدیؐ میں سب سے اعلیٰ تھے۔ آپ سنت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ پرہیزگاری، قناعت، استغنا، سخاوت، کرم اور زہد میں ممتاز تھے۔ آپ مال کو جمع نہیں کرتے تھے آپ کو ہزاروں روپے حاصل ہوتے تھے لیکن اسی دن لوگوں پر بانٹ دیتے تھے یہاں تک کہ آپ کوئی رات ایسی نہیں گزارتے تھے کہ اس میں آپ کے پاس کوئی درہم و دینار (روپیہ پیسہ) ہو۔ آپ معمولی لباس پہنتے اور معمولی کھانا کھاتے تھے۔ ایسا لباس بھی آپ نہیں پہنتے تھے جس سے عالمانہ شان و شوکت ظاہر ہو۔ آپ قول حق اور کلمۂ صدق کہنے میں کسی کا خوف نہیں کرتے تھے۔ آپ کے اوپر علم و عمل، زہد و ورع، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی امامت و سیادت ختم ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حسن اعتدال، حسن اخلاص اور ابتہال الی اللہ کی دولت سے مالا مال تھے۔ آپ کے اندر دوام مراقبہ، دعا، حسن اخلاق اور احسان الی الخلق کی خصوصیات تھیں۔ اگر میں رکن و مقام یعنی خانۂ کعبہ کے سامنے حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر قسم کھا کر یہ کہوں کہ میں نے دنیا میں ان سے زیادہ کوئی صاحب کرم، دینار و درہم سے بے پروا اور کتاب و سنت کا پابند نہیں دیکھا تو میں حانث نہیں ہوں گا۔ میں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں دیکھا۔ آپ درمیانی قد کے، صاف رنگ اور بڑے سر والے تھے۔ مسجد میں لوگوں کی امامت کرتے تھے اور مسجد کے حجرے ہی میں رہتے تھے۔ اپنے اصحاب و رفقاء کے ساتھ ان کے کاموں میں سعی و کوشش کرتے تھے۔ ان کا لباس عام آدمیوں جیسا تھا۔ ظہر سے پہلے درس قرآن و حدیث دیتے تھے، ظہر و عصر کے

بعد بھی اغلب اوقات میں درس دیتے تھے۔

اس کے بعد (حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ فرماتے ہیں کہ) میں نے ان سے حدیث مسلسل بالاولیۃ اور حدیث مسلسل بالمحبۃ اور کچھ حصہ صحیح بخاری شریف کا سنا تھا آپ خود ہی حدیث کی قرأت کرتے تھے اور اثناء قرأت میں احادیث پر تقریر بھی فرماتے جاتے تھے۔ جہاں تک آپ کے ''کشف و کرامات'' کا تعلق ہے وہ حدِّ تواتر کو پہنچ گئیں تھیں۔ (آپ نے ۱۰۵ سال کی طویل عمر پائی) اور آپ کی وفات ۲۲؍ربیع الاول [1] ۱۳۱۳ھ کو گنج مرادآباد میں ہوئی۔ مرادخاں کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ (ماخوذ: از نزہۃ الخواطر جلد ہشتم)

مولوی رحمٰن علی صاحب ''تذکرۂ علمائے ہند'' نے آپ کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

''حضرت موصوف (شاہ فضل رحمٰنؒ) ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے چنانچہ فضل رحمٰن (بغیر الف لام اور بغیر الف بعد میم) ان کا تاریخی نام ہے۔ اس حساب سے عمر شریف ۱۳۰۵ھ تک جو کہ اس مجموعہ (تذکرۂ علمائے ہند) کی تالیف کا زمانہ ہے، ۹۷ سال ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کی طویل زندگی سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے۔ انھوں نے درسی مروّجہ علوم کی تحصیل اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ مولانا شاہ عبدالعزیز (محدث) دہلویؒ، مرزا حسن علی کبیر محدث لکھنویؒ اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے کی۔ زہد و اتقاء اور اتباع فقہ و حدیث (و قرآن) ان کا دستور و طریق ہے۔ مرید و خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق دہلویؒ اور حضرت شاہ غلام علی [2] دہلویؒ کے ہیں۔ آپ شروع میں تذکیر و وعظ بھی فرماتے تھے اب جسمانی ضعف کی وجہ سے جو اس عمر کا تقاضا ہے وہ بھی نہیں ہوتا ہے۔ پھر بھی اس زمانے میں مخلوق ان کی

---

[1] تذکرہ مولانا فضل رحمٰن مؤلفہ (مولانا) ابوالحسن ندوی کے ص ۷ا پر تاریخ وفات ۸؍ربیع الاول لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اسی کتاب کے ص ۸۵ پر ۲۲؍ربیع الاول لکھی ہے جو صحیح ہے۔

[2] جہاں تک میرے علم میں ہے حضرت شاہ فضل رحمٰن حضرت شاہ غلام علیؒ کے خلیفہ نہیں تھے بلکہ ان سے باقاعدہ بیعت ہونا بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ (فریدی)

طرف رجوع کرتی ہے۔ چھوٹے بڑے، مالدار، مفلس، مشہور اور غیر مشہور نزدیک و دور سے آتے ہیں اور بیعت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ مؤلف اوراق (رحمان علی) ماہ ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ میں اپنے وطن مالوف (ریواں) سے ملاقات کی غرض سے کانپور تک گیا وہاں معلوم ہوا کہ ''اناؤ'' سے گنج مرادآباد تک بارش کی وجہ سے سخت طغیانی ہے۔ گاڑی اور پالکی وغیرہ سواری کا عبور کرنا سخت دشوار ہے۔ اس لیے یہ مشہور شعر پڑھ کر ریواں واپس آ گیا۔

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل ☆ کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

صاحبِ ''الروضۃ الممطورہ'' مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی آپ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں ''حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب دام فیضہم شاگرد رشید حضرت مولانا (شاہ) محمد اسحاق صاحبؒ کے ہیں۔ ساری کتب حدیث انہیں سے پڑھیں جس وقت خاکسار شرف ملازمت و بیعت سے مشرف ہوا تو درخواست اجازت حدیث شریف کی، کی۔ فرمایا کہ مجھے زبانی اجازت ہے میں بھی زبانی اجازت دیتا ہوں ''پڑھو، پڑھاؤ'' الحمد للہ علی ذٰلک

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن کے حالات وسوانح نیز ملفوظات واقوال بہت سی کتابوں اور رسالوں میں جمع کیے گئے ہیں جن میں چند کے اسماء حسب ذیل ہیں:

(۱) ارشاد رحمانی مؤلفہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ (۲) فضل رحمانی (۳) کمالاتِ رحمانی، یہ دونوں کتابیں مولانا سید تجمل حسین بہاریؒ کی تالیف ہیں (۴) رسائل نواب سید نورالحسن خاں (۵) ہدیہ عشاق رحمانی مؤلفہ مولوی عبدالغفار آسیونی (۶) افضال رحمانی (مؤلف کا نام معلوم نہ ہوسکا) (۷) ذکر رحمانی، غالباً یہ قاضی ابرار حسین مرادآبادیؒ کی تالیف ہے (۸) نیل المراد فی السفر الی گنج مرادآباد، مؤلفہ حکیم الامت مولانا اشرف علی[1] تھانویؒ (۹) تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

---

[1] حضرت مولانا تھانویؒ نے حضرت گنج مرادآبادیؒ سے دو مرتبہ ملاقات کی ہے۔ اس رسالہ میں ان دونوں ملاقاتوں کی روداد ہے۔ ''تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی'' (مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن ندوی) میں یہ پورا رسالہ درج کر دیا گیا ہے اور کتاب ''ارواح ثلاثہ'' میں بھی یہ رسالہ شامل کر دیا گیا ہے۔ (فریدی)

یہ تذکرہ بہت جامع ہے اور اس کا انداز بیان بھی بڑا دلکش ہے۔ یہ مذکورہ بالا کتابوں اور ان کے علاوہ دیگر بہت سی کتابوں کو سامنے رکھ کر اور ان سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے۔ ان تمام کتابوں کا کتب خانوں میں یکجا ملنا مشکل ہے۔ گویا کہ یہ کتاب حضرت مولانا گنج مرادآبادیؒ کے حالات وسوانح میں ''عطر مجموعہ'' کا حکم رکھتی ہے۔

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ:

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں ان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

الشیخ العالم المحدث محمد مظہر بن لطف علی بن محمد حسن الصدیقی الحنفی النانوتوی. آپ ''نانوتہ'' ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ پھر تحصیل علم کے لیے ''دہلی'' گئے اور وہاں مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مفتی صدرالدین دہلویؒ اور مولانا رشیدالدین دہلویؒ سے پڑھا۔ نیز بعض کتب حدیث حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے پڑھیں۔ آپ کچھ عرصہ تک ایک مطبع میں تصحیح کے کام میں مشغول رہے اور وہاں طلبہ نے آپ سے فقہ، اصول اور کلام کی کتابیں پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی آپ سے بعض ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ تصحیح کے مشغلے کے بعد آپ نے اپنی پوری عمر مدرسہ ''مظاہر علوم'' سہارنپور میں قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس اور علوم و فنون کی نشرواشاعت میں گزار دی۔ مدرسہ مظاہر علوم ۱۲۸۳ھ میں قائم ہوا تھا اور اس کی بنیاد مولانا سعادت علیؒ نے ڈالی تھی جو کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے ایک رُکن تھے۔ مولانا محمد مظہر ایک جیّد اور متبحر عالم تھے۔ علوم وفنون میں آپ کو بڑا رسوخ حاصل تھا۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس مقرر ہوئے تھے اور آپ ہی کے نام پر اس کا نام مظاہر علوم رکھا گیا تھا۔

آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دست مبارک پر بیعت تھے اور ان سے اجازت بھی حاصل تھی۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت بہت زیادہ کرتے تھے اور ہمیشہ ذکر بھی

بکثرت کرتے تھے۔ ''اسم ذات'' کے ذکر سے برابر رطب اللسان رہتے تھے۔ تکلف سے دور تھے، دنیا سے بہت زیادہ بے پروا اور صاحب وقار تھے۔ آپ کے چہرے پر ایک قدرتی رعب تھا۔

آپ نے ۲۴ر ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو اتوار کے دن ۷۰ر سال کی عمر میں وفات پائی۔ تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکلتی ہے ع زین جہان نقلِ مکان کرد بدار جنّات

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم تاریخ مظاہر علوم جلد اول میں حافظ فضل حق سہارنپوریؒ کے سانحہ ارتحال کا ذکر کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

''دوسرا حادثہ عظیمہ جو سابقہ جملہ حوادث سے کہیں زیادہ تھا وہ حضرت مولانا محمد مظہر کا وصال تھا جو ۲۴ر ذی الحجہ (مطابق اکتوبر ۱۸۸۵ء) کی شب میں آٹھ بجے کے قریب بمرض درد گردہ پیش آیا۔''

حضرت ممدوح نور اللہ مرقدہ گویا ابتدائے مدرسہ سے اب تک ..... ہر نوع کا جزوی (وکلی) نظم فرماتے تھے۔ مدرسہ کی ہر نوع کی خبر گیری، نگرانی حضرت ہی کے حوالہ تھی۔ عزل ونصب ملازمین، ترقی وتنزلی مدرسین، حضرت ہی کی ذات سے متعلق تھا۔ اس حادثے کی وجہ سے عام طلبہ پر بالخصوص طلبۂ حدیث پر اثر ہونا یقینی تھا۔ حضرت مولانا محمد مظہرؒ اعلیٰ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے عمر میں بڑے تھے لیکن حضرت کے خلفاء اور محبوب ترین خدام میں تھے۔[1]

مولانا سید محمد[2] ثانی حسنی ''حیات خلیل'' میں مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کے بارے میں

---

[1] حضرت مولانا محمد مظہرؒ کے کچھ مزید حالات اخبار ''شفاء الصدور'' (عربی) بابت ماہ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں موجود ہیں۔ مدرسہ کے کتب خانہ میں بھی اس اخبار کے پرچے محفوظ ہیں۔ (تاریخ مظاہر علوم جلد اول حاشیہ ص ۵۰) (فریدی)

[2] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو مولانا محمد ثانی حسنیؒ بقید حیات تھے، آپ کا وصال ۲۲ر ربیع الاول ۱۴۰۲ھ موافق ۱۶ر فروری ۱۹۸۲ء میں ہوا... آپ صاحب تصانیف کثیرہ تھے جن میں سے چند یہ ہیں: سوانح حضرت مولانا محمد یوسفؒ، تذکرہ مولوی محمد ہارون کاندھلویؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے حالات، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات، حیات خلیل وغیرہ۔ (محب الحق)

تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا محمد مظہر حافظ لطف علیؒ کے صاحبزادے تھے ..... بخاری شریف شاہ محمد اسحاقؒ سے پڑھی۔ آگرہ اور دہلی میں ملازم رہے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں شریک رہے اور ''شاملی'' کے میدان میں زخم کھائے پھر روپوشی کی زندگی بسر کی۔ جب انتشار و پراگندگی کا دور ختم ہوا اور امن قائم ہوا تو آپ سہارنپور تشریف لائے اور مولانا سعادت علی صاحب کے قائم کیے ہوئے مدرسہ مظاہر علوم میں درس و تدریس کا مشغلہ جاری کیا۔ درحقیقت مظاہر علوم کی ترقی اور تعمیر جدید میں آپ ہی کا ہاتھ نمایاں تھا اور آپ ہی کے نام پر اس مدرسۂ عربیہ کا ''مظاہر علوم'' نام رکھا گیا۔ اللہ نے آپ کو سادگی و متانت، تواضع، انکسار، احتیاط و ورع، عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ ذہانت و ذکاوت، حسن انتظام، علم و فضل اور متعدد علوم میں لیاقت و کمال کی دولتوں سے پوری طرح نوازا تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اگرچہ عمر میں بڑے تھے لیکن انھیں سے بیعت ہوئے۔ بیعت کیا ہوئے ان کی محبت و عشق میں ڈوب گئے۔ حضرت گنگوہیؒ بھی آپ کی بڑی عزت فرماتے، اجازت و خلافت سے بھی آپ کو مشرف کیا۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن نانوتویؒ نے دہلی کالج سے عربی کی تکمیل کی اور تحریک آزادی میں حصہ لیا.... آپ کے ایک اور بھائی تھے جن کا نام مولانا محمد منیر[1] تھا۔ وہ ۱۲۴۷ھ میں ''نانوتہ'' میں پیدا ہوئے۔ شاملی کے میدان میں تحریک آزادی کی جنگ لڑی اور اس کے بعد بریلی میں ملازمت اختیار کی۔ (حیات خلیل ص ۳۶، ۳۷)''

حضرت مولانا محمد مظہرؒ کے تلامذہ یقیناً بڑی تعداد میں ہوں گے لیکن ان سب میں اعلیٰ و اولیٰ اور اشرف و افضل حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کی ذات اقدس تھی۔

---

[1] مولانا محمد منیر نانوتویؒ اپنے والد حافظ لطف علیؒ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی گئے۔ وہاں مولانا مملوک علی نانوتویؒ مفتی صدر الدین آزردہؒ اور شاہ عبدالغنی مجددی فاروقی دہلویؒ سے علمی استفادہ کیا۔ آپ نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے۔ تصوف میں آپ کی دو کتابیں ''سراج السالکین'' ترجمہ منہاج العابدین، ''فوائد غریبہ'' ہیں۔ ایک سال سے کچھ زیادہ مدت تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ دیانت و امانت آپ کی مسلّم تھی۔ (محب الحق)

حضرت الحاج مولانا نورالحسن کاندھلویؒ: حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ اپنی کتاب ''تذکرہ مشائخ کاندھلہ'' میں حضرت مولانا نورالحسنؒ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

آپؒ ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ کو پیدا ہوئے اور قرآن حفظ کیا۔ اپنے دادا حضرت مولانا مفتی الٰہی بخشؒ کی آغوش میں نشو ونما پائی اور تحصیل علم اپنے والد بزرگوار اور جد امجد سے کی پھر ۱۲۴۷ھ میں تکمیل علم کے لیے دہلی کا سفر اختیار فرمایا۔ دہلی میں اس وقت حضرت محمد اسحاق محدث دہلویؒ، مولانا فضل حق صاحب خیرآبادیؒ اور مفتی صدرالدین صاحب آزردہؒ رونق افروز تھے۔ حضرت مولانا نورالحسنؒ نے انھیں حضرات سے کمالات کا اکتساب فرمایا اور جملہ علوم منقول و معقول میں پورا کمال حاصل کیا حتیٰ کہ خود اپنے اساتذہ کی نگاہوں میں بھی ہر علم و فن میں یگانہ روزگار اور یکتائے زمانہ شمار ہوتے تھے۔ قوت حافظہ اس قدر تھی کہ جو بات ایک دفعہ سن لی یا دیکھ لی وہ ہمیشہ کے لیے دل پر نقش اور دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھی اور پھر ذوق طلب کا یہ حال تھا کہ مفتی صدرالدین صاحبؒ نے ابتدا میں آپ سے وقت نہ ہونے کا عذر کیا اور پھر مولانا کے بہت اصرار پر کہا کہ کچہری آتے اور جاتے مین وقت مل سکتا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے اس کو منظور کر لیا۔ چنانچہ مفتی صدرالدین صاحبؒ پالکی میں گھر سے کچہری جاتے تو حضرت مولاناؒ پالکی کے ساتھ دوڑتے جاتے تھے اور سبق پڑھتے جاتے تھے۔ کچہری پہنچتے ہی سبق موقوف ہو جاتا تھا اور حضرت مولاناؒ انتظار میں بیٹھ جاتے تھے۔ مفتی صاحبؒ جب کچہری کے کام سے فارغ ہو کر پالکی میں واپس ہوتے تو واپسی میں جس قدر سبق ہوتا تھا اس کو پورا کرتے تھے۔ مہینوں یہی معمول رہا پھر مفتی صاحبؒ نے مستقل وقت دینا شروع کیا۔

حاشیہ مفتی صدرالدین بر میر زاہد اسی زمانہ میں نقل کیا۔ علوم فلسفہ و حکمت میں کمال، امام فن مولانا فضل حق خیرآبادیؒ سے حاصل کیا۔ فلسفہ و حکمت کی متعدد کتابیں اسی

زمانہ کی نقل کی ہوئی ہیں۔ ان دونوں اساتذہ کو حضرت مولانا نورالحسنؒ سے جو شدید تعلق تھا اس کا بخوبی اندازہ اُن خطوط سے ہوتا ہے جو ان صاحبان نے مولانا موصوف کو لکھے ہیں اور جن کو مولانا محمد سلیمان صاحب نے یکجا کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے۔ احقر (نسیم احمد فریدی) نے مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے وہ مکتوبات جو مولانا نورالحسن کاندھلویؒ کے نام ہیں مولانا احتباء الحسن سلمہ ابن حضرت مولانا احتشام الحسن صاحبؒ کے پاس دیکھے ہیں اور سرسید احمد خاں کے دو ایک مکتوبات بھی ان سے سنے ہیں جو مولانا نورالحسن کاندھلویؒ کو لکھے گئے ہیں۔

مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ نے ''نزہۃ الخواطر'' جلد ہفتم میں مولانا نورالحسن کاندھلویؒ کا جو تذکرہ ارقام فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

الشیخ الفاضل نورالحسن ابن ابی الحسن ابن المفتی الٰہی بخش کاندھلوی. آپ کاندھلہ (ضلع مظفرنگر) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اول اپنے والدؒ سے ایک عرصہ تک تعلیم حاصل کی اور پھر علامہ فضل حق[1] ابن فضل امام خیرآبادیؒ کے شاگرد ہوئے اور ان سے علوم حکمیہ حاصل کیے۔ پھر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ آپ سے بہت سے علماء نے علم حاصل کیا۔ آپ حلیم الطبع، صاحب اخلاق حسنہ، بہترین مقرر، شریں کلام اور صاحب فصاحت و بلاغت تھے۔ علم منطق و حکمت میں بھی آپ یگانہ روزگار تھے۔

۱۱رمحرم الحرام ۱۲۸۵ھ بروز سہ شنبہ کاندھلہ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔

---

[1] ''نزہۃ الخواطر'' میں مولانا کے دیگر اساتذہ مفتی صدرالدینؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ کا ذکر رہ گیا ہے۔ مولانا نورالحسن راشد سلمہ نے بھی ''تبرکات'' میں شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کا ذکر مولانا نورالحسنؒ کے استاذ حدیث کی حیثیت سے نہیں کیا جو یقیناً تسامح کی بات ہے، تبرکات کی اشاعت کے بعد مولانا راشد سلمہ نے کاندھلہ میں مجھ سے فرمایا کہ حدیث کی ایک کتاب کی عبارت سے پتہ چل رہا ہے کہ مولانا نورالحسن کاندھلویؒ نے ہجرت سے کچھ پہلے ہندوستان میں حضرت شاہ محمد اسحاقؒ سے حدیث پڑھی ہے۔ ''سفینۂ رحمانی'' اور ''عمدۃ الصحائف فی اہل الکشف والمعارف'' اور ''تذکرہ مشائخ کاندھلہ'' میں یقینی اور واضح طور پر حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ مہاجر کو حضرت مولانا نورالحسن کاندھلویؒ کا استاذ حدیث بتایا گیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ (فریدی)

مولانا نور الحسن راشد ابن حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلوی زید مجدہما اپنی کتاب ''تبرکات'' میں مولانا نور الحسن صاحبؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت مولانا نور الحسنؒ تعلیم کے بعد آگرہ گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ چار سال کالج میں رہے پھر سکریٹری کالج کے متعصّبانہ رویّہ کی وجہ سے مستعفی ہو گئے۔ آگرہ سے آنے کے بعد ''نکوڑ'' ضلع سہارنپور میں قائم مقام تحصیلدار مقرر ہوئے۔ بعد میں مستقل تحصیلدار ہو گئے تھے پھر یہاں سے بھی مستعفی ہو گئے۔ آخر میں مہاراجہ ''الور'' نے مولانا کے فضل و کمال کا شہرہ سن کر اپنے دربار میں بلالیا۔ الور کی ملازمت چھوڑنے کے بعد وطن میں قیام کیا اور یہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا کے تلامذہ کی طویل فہرست میں متعدد نامور علماء کے علاوہ سرسید کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ سرسید نے دہلی اور آگرہ میں مولانا سے تعلیم حاصل کی۔ سرسید نے اپنی تالیفات جلاء القلوب بذکر المحبوب مطبوعہ ۱۸۴۲ء تحفہ حسن مطبوعہ ۱۸۴۴ء تسہیل فی جر ثقیل مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۴ء میں مولانا کا ذکر بحیثیت استاد کیا ہے۔ حاشیہ ہدایہ اولین، حاشیہ دیوان متنبّی، تاریخ ریاست الور، انتخاب احادیث استبصار مؤلفہ مولانا آل حسن موہانی، رسالہ فرائض مولاناؒ کی علمی یادگار ہیں۔

تذکرہ علمائے ہند میں محمد ایوب قادری نے مولانا نور الحسن صاحبؒ کے بارے میں ایک نوٹ اس طرح تحریر کیا ہے:

> ''مولوی نور الحسن عالم با عمل، فاضل بے بدل، کاندھلہ کے شیوخ سے تھے۔ مولوی ابو الحسن ابن مفتی الٰہی بخش کے صاحبزادے تھے۔ کاندھلہ میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ معقولات کی تحصیل مولانا فضل حق خیر آبادیؒ سے کی اور حدیث کی تحصیل خاتم المحدثین شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے کی۔ مولوی نور الحسن نہایت مقدس اور متورع بزرگ تھے، عبادت و ریاضت خوب کرتے تھے۔

۱۱ر محرم بروز سہ شنبہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء یا ۱۸۶۹ء کاندھلہ میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔"

(بحوالہ سفینۂ رحمانی مؤلفہ عبدالرحمٰن ص ۸۵، ۸۶ اور مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو "عمدۃ الصحائف فی حال اہل الکشف والمعارف" از مولوی عبدالکریم ص ۳۳۸، ۳۴۳، مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد)

حضرت مولانا نور الحسنؒ نے چار صاحبزادے یادگار چھوڑے جو سب کے سب ذہین وذکی ذی استعداد اور باکمال تھے۔ مولانا محمد ضیاء الحسن عرف محمد صادق، مولانا حکیم محمد ظہور الحسن عرف محمد ابراہیم، مولانا محمد فیض الحسن عرف محمد اکبر اور مولانا محمد ریاض الحسن عرف محمد سلیمان۔

مولانا احتشام الحسن صاحبؒ، مولانا اظہار الحسن صاحب[۱]، مولانا افتخار الحسن (زید مجدہما) مولانا ضیاء الحسن عرف محمد صادق کے پوتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ مولانا ضیاء الحسن صاحبؒ کے نواسے تھے۔ مولانا حکیم ظہور الحسن عرف محمد ابراہیم کی اولاد میں حضرت مولانا انعام الحسن (موجودہ امیر جماعت[۲] تبلیغ) ہیں۔ مولانا محمد فیض الحسن عرف محمد اکبر[۳] کی اولاد میں اس وقت حافظ فرید[۴] الحسن ابن الحافظ الحاج محمد ظہیر الحسن شہیدؒ موجود ہیں۔

۱۔ جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو مولانا اظہار الحسنؒ بقید حیات تھے ۲۷ر ربیع الاول ۱۴۱۷ھ موافق ۱۳ر اگست ۱۹۹۶ء کو وصال ہوا۔ آپ مرکز جماعت تبلیغ کے مدرسہ کاشف العلوم میں صحاح ستہ کی ابوداؤد شریف کا درس دیتے تھے۔ مطالعہ وسیع تھا۔ (محب الحق)

۲۔ جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو حضرت مولانا انعام الحسنؒ بقید حیات تھے۔ ۱۰ر محرم ۱۴۱۶ھ موافق ۱۰ر جون ۱۹۹۵ء یوم عاشورہ بروز ہفتہ اپنے خالق سے جا ملے۔ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے پہلو میں سپرد رحمت کیے گئے۔ آپ کی امارت میں تبلیغی جماعت کا پوری دنیا میں تعارف ہوا۔ (محب الحق)

۳۔ آپ مدرسۃ العلوم (علی گڑھ کالج) میں ملازم تھے۔ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "تفہیمات الٰہیہ" کا ایک قلمی نسخہ جو سر سید احمد خاں مرحوم کے کتب خانہ سے آیا ہے مولانا محمد اکبر کاندھلوی کا لکھا ہوا ہے اور اس پر جا بجا مولانا محمد اکبر کے حواشی ہیں اور کہیں کہیں سر سید احمد خاں کے بھی۔ (فریدی)

۴۔ جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو حافظ فرید الحسن کاندھلوی بقید حیات تھے۔ آپ کا وصال ۱۰ر ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ موافق ۲۲ر دسمبر ۲۰۰۴ء میں ہوا۔ (محب الحق)

مولانا محمد ریاض الحسن عرف محمد سلیمان لاولد تھے۔

مولانا نصیر الدین حنفی غازی دہلویؒ: مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ نے نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں مولانا نصیر الدین دہلویؒ کا جو تذکرہ کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

الشیخ العالم الکبیر المجاھد نصیر الدین بن نجم الدین الحسینی السونی پتی الدھلوی. آپ امام ناصر الدین حسینی سونی پتیؒ کی نسل سے تھے اور شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے نواسے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ آپ نے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ اور دیگر علماء سے علم حاصل کیا۔ آپ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے داماد بھی تھے (تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد) حضرت شاہ محمد آفاق عمری نقشبندی دہلویؒ سے بیعت ہو کر اخذ طریقہ کیا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر ۱۲۵۰ھ میں ایک قافلہ کے ساتھ ہجرت فرمائی۔ آپ نے ''سندھ'' کے علاقہ میں ایک مدت تک قیام کیا اور بعدہٗ مقام ''استھانہ'' پہنچے جو اس وقت حضرت سید احمد شہیدؒ کے رفقاء اور مجاہدین کا مرکز تھا۔ سب مجاہدین نے آپ کو اپنا امیر مانا اور بیعت جہاد کی۔ آپ صاحب ہمت عالیہ اور کثیر الدعا تھے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں بھی آپ کو امتیاز حاصل تھا۔ تقریباً ۱۲۵۶ھ میں آپ نے انتقال کیا۔

جناب غلام رسول مہر نے اپنی کتاب ''سرگذشت مجاہدین'' میں مولانا نصیر الدین دہلویؒ کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں جو اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے قابل مطالعہ ہیں۔ یہاں پر اس کتاب کی کچھ عبارتیں بطور اقتباس نقل کی جاتی ہیں۔

سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کے کارفرماؤں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ دوبارہ ایک بڑی جماعت تیار کر کے آزاد علاقہ میں بھیج دی جائے جس سے سید صاحب کے شروع کیے

---

[1] مولانا سید نصیر الدین حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مرشد اول تھے۔ حاجی صاحبؒ نے آپ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں اجازت وخرقہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ شائم امدادیہ ص ۱۱ (فریدی)

ہوئے کام میں جوش وخروش کی نئی روح پیدا ہو جائے۔اس اہم فرض کی بجا آوری کا شرف روز ازل سے مولوی سید نصیر الدین دہلویؒ کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔جنھوں نے سید صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا دعوت جہاد سے ایک جماعت تیار کی اور سید صاحبؒ کی طرح وطن مالوف سے ہجرت کر کے تحریک جہاد کی تجدید کا انتظام کیا۔

مولوی سید نصیر الدین دہلویؒ حضرت سید نا ناصر الدینؒ کی اولاد میں سے تھے اور شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے نواسے تھے۔ننہیالی رشتہ کی وجہ سے دہلی ہی میں تربیت پائی لیکن ابتدا میں تحصیل علم کی طرف چنداں توجہ نہ تھی۔خود فرماتے ہیں کہ شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی صاحبزادی سے نکاح کے لیے والدہ نے درخواست کی مگر علوم سے بے التفاتی کے باعث درخواست منظور نہ ہوئی۔اس واقعہ نے مولوی سید نصیر الدین کے دل میں خاص جوش پیدا کر دیا اور اس ذوق وشوق سے پڑھنے لگے کہ تھوڑی ہی مدت میں ایک ممتاز عالم بن گئے۔شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے یہ دیکھتے ہی اپنی صاحبزادی کا نکاح ان سے کر دیا۔

مولوی صاحب نے تکمیل علوم کے لیے پورب کا سفر کیا اور کلکتہ میں بھی خاصی دیر ٹھہرے جس زمانہ میں سید صاحبؒ ایک بڑے قافلے کے ساتھ بقصد حج کلکتہ پہنچے تھے مولوی نصیر الدین وہیں مقیم تھے۔ ۱۲۴۰ھ میں شاہ محمد اسحاق صاحب (دہلی میں) وعظ فرماتے تھے تو مولوی نصیر الدین مدرسہ کے دروازے پر فراہمی زراعانت میں مصروف رہتے تھے۔آخر میں (واقعہ بالاکوٹ کے بعد) آپ نے خود جہاد کا عزم کر لیا۔

حاجی سید عبدالرحیم سورتی، مولوی بہاء الدین چنیا پٹی، احمد سادا کار، امام الدین سوزن ساز وغیرہ رفیقان خاص سے مشورہ کیا اور کہا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالو۔ سب رفیقوں نے خود مولوی صاحب ہی کی امارت پر اتفاق کیا۔اس کے بعد آپ نے امروہہ، اجمیر، ٹونک، رامپور، میرٹھ اور اطراف دہلی میں دعوت وتبلیغ کی غرض سے دورے کیے تا کہ مجاہدین کی ایک جماعت فراہم ہو جائے۔اس سلسلہ میں احیاء دین اور رد بدعات کا

کام انجام دیتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق اختلافات مٹانے اور مسلمانوں کو اصول واساساتِ دین پر متحد کرنے کا خاص اہتمام تھا۔ ایک موقع پر کسی نے کہا کہ مذہبی معاملات میں اختلاف نیا نہیں۔ یہ صحابہؓ کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ مولوی سید نصیر الدین نے فرمایا کہ ہم اکابر کی لغزشوں کے اتباع پر مامور نہیں۔ بے شک صحابہ میں بہ اقتضاء بشریت اختلاف کی مثالیں بھی ملتی ہیں لیکن ہمیں ان کے مکارم کی پیروی کرنی چاہیے۔ مولوی نصیر الدین منگلوریؒ کی شہادت کے بعد صرف ۷۰، ۸۰ مجاہدین باقی رہ گئے تھے جن کا انتظام میر اولاد علی عظیم آبادی نے سنبھال رکھا تھا۔

مولوی سید نصیر الدین استھانہ پہنچے تو وہ امیر بن گئے لیکن وہاں ابھی کوئی کارنامہ انجام نہ دینے پائے تھے کہ خدا کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ ان کی وفات ۱۸۴۰ء میں ہوئی اور استھانہ میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر ۱۸۴۱ء کی طغیانی دریائے سندھ میں بہہ گئی تھی۔

نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ جب ان پر نزع کی حالت طاری ہوئی تو خدا کی قدرت کا عجیب نقشہ نظر آیا۔ اس حالت میں انسان کے ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں لیکن حضرت مولانا لیٹے لیٹے یکا یک اُٹھے اور اطمینان سے بیٹھ گئے اگرچہ ان کا جسم انتہائی ضعف اور بے طاقتی کا شکار ہو چکا تھا لیکن آنکھیں کھولیں، انگشت شہادت اُٹھائی اور بلند آواز سے عربی اور ہندی (اردو) میں ایمان واسلام کے متعلق نہایت عمدہ باتیں بہت اچھے انداز میں بیان فرماتے رہے۔ مولوی سید نصیر الدین کا ممتاز ترین کارنامہ یہ ہے کہ جب سید صاحبؒ اور ان کے دوسرے بلند منزلت رفقاء کی شہادت کے بعد جہاد کی گرم جوشیوں پر افسردگی طاری ہو گئی تو مولوی صاحب موصوف نے عزم وہمت سے کام لے کر اس تحریک کو تازہ رونق بخشی۔ ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمان بے حسی کا شکار ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے ملک کی حکومت ان سے چھین لی تھی اور نظم ونسق کو اپنی مصلحتوں کے مطابق چلانے لگے

تھے، گویا عام اسلامی فضا کی جگہ سراسر غیر اسلامی فضا پیدا ہو رہی تھی۔ سید صاحبؒ اُٹھے مسلمانوں کا جمود توڑا اور ان کے سامنے یہ نصب العین پیش کیا کہ جانفشانی و جانبازی سے کام لے کر کھوئی ہوئی عزت و عظمت دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہے اور اسلامیت کا وقار از سرِ نو قائم کیا جاسکتا ہے۔

مولوی سید نصیر الدینؒ نے جب دیکھا کہ تحریک کا جوش و خروش ختم ہو رہا ہے تو جواں مردانہ میدان میں آگئے اور اپنی ذات کو بے تامّل قربانی کے لیے پیش کر دیا۔

نواب وزیر الدولہ بالکل بجا فرماتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد خلق خدا کی ہدایت شریعت کے احیاء اور تحریک جہاد بے آب و تاب ہو رہا ہے۔ خدا کی طرف سے مولوی سید نصیر الدین کی بدولت اس تحریک میں بے اندازہ رونق اور جلا پیدا ہو گئی۔

مولوی نصیر الدین کی دعوت میں بڑی تاثیر تھی، یہ ان کی حق پرستی، عشق کتاب و سنت اور اخلاص کا روشن ثبوت تھا۔

مولوی صاحب کی شادی شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور ان کے دو فرزند تھے ایک کا نام عبداللہ تھا اور دوسرے کا عبدالحکیم۔ مولوی صاحب جہاد کے لیے نکلے تھے تو ان کے دونوں فرزند تعلیم پا رہے تھے۔ چنانچہ بعض مکاتیب میں ان کی تعلیم کے لیے تاکید فرمائی ہے۔ ایک مکتوب میں اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں: ''خدا سے قوی امید رکھیے کہ وہ ہم کو اور آپ کو اس دنیا میں حسب مراد ملائے گا۔ ہر کام میں خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے، فرض نماز اور تلاوت قرآن پر استقامت ضروری ہے، ادائے زکاۃ میں غفلت نہ ہو۔ عبداللہ اور عبدالحکیم کی تعلیم کے لیے کوشش کیجیے۔ دل دونوں بیٹوں میں لگائیے اُٹھتے بیٹھتے خدا کا نام لیتی رہیے۔

سید صاحبؒ کی طرح مولوی نصیر الدین کو بھی اس دنیا میں بیوی اور بال بچوں سے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ اغلب ہے مولوی صاحب کی اہلیہ اور بیٹے شاہ محمد اسحاق محدث

دہلویؒ کے ساتھ ہجرت کر کے ''مکہ معظمہ'' چلے گئے ہوں۔

مولانا سید عبدالحئی رائے بریلویؒ نے (اپنی کتاب دہلی اور اس کے اطراف میں) لکھا ہے کہ مولانا سید نصیر الدین کے اولاد نہ چلی البتہ ان کے بھائی سید ناصر الدین کے ایک فرزند سید معز الدین تھے اور سید معز الدین کے فرزند سید ظہیر الدین احمد تھے جن سے مولانا سید عبدالحئی نے ۱۸۹۵ء میں ملاقات کی تھی۔ ان ہی سید ظہیر الدین احمد نے ولی اللہی خاندان کی بیشتر تصنیفات چھپوائی تھیں بلکہ اس غرض سے ایک مطبع بھی قائم کر لیا تھا۔

حکیم محمود احمد برکاتی اپنی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''شاہ رفیع الدین دہلویؒ کی صاحبزادی امۃ اللہ کا عقد مولوی سید نجم الدین سونی پتیؒ سے ہوا تھا۔ ان سے دو صاحبزادے تھے (۱) سید ناصر الدین اور (۲) سید نصیر الدین۔'' سید ناصر الدین کے صاحبزادے سید معز الدین تھے اور سید معز الدین کے صاحبزادے مولوی سید ظہیر الدین احمد (عرف مولوی سید احمد مؤلف یادگارِ دہلی) جنھوں نے اپنے اسلاف کی بہت سی کتابیں شائع کر کے ان کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔

مولوی سید نصیر الدین کا عقد شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی دُختر سے ہوا تھا۔ ان سے دو صاحبزادے تھے ایک عبداللہ اور دوسرے مولوی عبدالحکیم۔ یہ دونوں اپنے نانا کے ساتھ ''مکہ معظمہ''[1] ہجرت کر گئے تھے اس لیے ان کے بعد کی نسلوں کے حالات سے ہم بے خبر ہیں۔

مولانا شیخ محمد محدّث تھانویؒ: صاحبِ نزہۃ الخواطر مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ آپ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں۔ **الشیخ الفاضل الکبیر محمد ابن احمداللہ العمری التھانوی[2].**

آپ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے، آپ نے مولانا عبدالرحیم تھانویؒ

---

۱ آپ کے مفصل حالات مقالاتِ فریدی جلد اول میں آفتاب علم و عرفان کے عنوان میں ملاحظہ کریں۔ (محب الحق) ۲ مولانا کا نام درحقیقت شیخ محمد ان کے نام کا جز ہے۔ جیسا کہ خود حضرت مولاناؒ کی تحریروں سے اور ان کے بعض اشعار اور حالات محمد یہ مؤلفہ حکیم محمد عمر چرتھالوی سے معلوم ہوتا ہے۔ (فریدی)

اور مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادیؒ سے تعلیم حاصل کی پھر دہلی گئے اور وہاں مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ سے علوم متعارفہ پڑھے۔ منطق وحکمت مولانا فضل حق خیر آبادیؒ سے پڑھی۔ بعدہٗ شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کی خدمت میں آئے اور علم حدیث حاصل کیا۔ آپ مفراط الذکاء، سریع الادراک، قوی الحفظ اور شیریں کلام تھے۔ بچپن میں حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت ہوئے۔ جب سن رشد کو پہنچے تو پھر میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ سے طریقہ سیکھا۔ آپ ''ٹونک'' بھی گئے اور وہاں تعلیم وتدریس پر مقرر رہوئے۔ ایک عرصہ تک ٹونک میں رہنے کے بعد اپنے وطن لوٹے اور اپنی پوری عمر ارشاد وتلقین میں صرف کی۔ آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: (۱) دلائل الاذکار (۲) القسطاس فی اثر ابن عباس (۳) ارشاد محمدی (۴) المکاتبۃ المحمدیہ (۵) المناظرۃ المحمدیہ (۶) تفصیل الختنین (۷) حاشیہ شرح عقائد۔

۱۲۹۶ھ میں آپ کا وصال ہوا، ۶۶ سال کی عمر پائی۔ آپ کی تاریخ وفات اور مدت عمر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مجھے بتائی تھی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

حالات محمدیہ مؤلفہ مولانا محمد عمر چرتھاولی نے آپ کی سوانح وحالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں اس کتاب سے اخذ کر کے آپ کے کچھ حالات پیش کیے جاتے ہیں[1]:

مولانا شیخ محمد صاحبؒ کے والد کا نام نامی مولانا احمد اللہ تھا۔ آپ تھانہ بھون میں ۲۰؍جمادی الاولی ۱۲۳۰ھ کو پیر کے دن پیدا ہوئے۔ آپ پانچ سال کے تھے کہ آپ کی والدہ کا اور دس سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ بعد ازاں فارسی شروع کی اور پھر مولانا عبدالرحیم صاحبؒ سے عربی صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں۔ آپ

---

[1] حالات محمدیہ کو پیش نظر رکھ کر احقر نے حضرت شیخ محمد محدث تھانویؒ پر ایک مفصل ومبسوط مقالہ لکھا تھا جو ماہنامہ تذکرہ دیوبند بابت اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (فریدی)

نے مولانا محمد قلندر جلال آبادیؒ سے بھی تعلیم حاصل کی۔ مولانا پندرہ سال کے تھے کہ دہلی میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث پڑھی۔ انیس سال کی عمر میں تمام علوم و فنون مثلاً حدیث، فقہ، تفسیر، اصول، فرائض، کلام، منطق، ریاضی اور فلسفہ سے فراغت کی سند حاصل کی۔

حصولِ تعلیم کے بعد آپ نے اپنے وطن تھانہ بھون میں قیام کیا اور اہل وطن کو وعظ اور تعلیم و تدریس کے ذریعہ فیض پہنچایا۔ آپ نے پہلے حافظ محمد ضامن شہیدؒ سے جو کہ رشتہ میں آپ کے ماموں ہوتے تھے روحانی فیض حاصل کیا۔ بعد ازاں میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ سے بیعت کی اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے۔ جس زمانہ میں حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ تھانہ بھون پہنچے تو آپ کے بزرگوں نے آپ کو بھی برکت کے طور پر حضرت سید صاحبؒ سے بیعت کرادیا۔

۱۲۶۲ھ میں ٹونک کے نواب وزیر الدولہ کی خواہش پر احادیث تہذیب اخلاق کا کام ٹونک میں رہ کر انجام دیا۔ بعد ازاں ۱۲۶۳ھ میں ''حرمین شریفین'' کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ''مکہ معظّمہ'' میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۶۲ھ) کے چھوٹے بھائی شاہ محمد یعقوب صاحب مہاجر (متوفی ۱۲۸۲ھ) سے سند علوم پائی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

حج کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور ۱۲۶۴ھ میں حدیدہ اور عدن کے راستہ سے بمبئی پہنچے۔ اثنائے راہ میں امام ابوالحسن شاذلی یمنیؒ کے مزار پر حاضری اور فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۲۷۴ھ سے ۱۲۷۷ھ تک آپ میرٹھ میں مسجد خیر المساجد واقع خیر نگر میں مقیم رہے۔ جہاں بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔ میرٹھ میں آپ نے ذکر و فکر اور درس و تدریس کا شغل جاری رکھا۔ ۱۲۷۸ھ میں نواب وزیر الدولہ کے صاحبزادے نواب محمد علی خاں کی خواہش پر ٹونک تشریف لے گئے، وہاں نواب صاحب

نے آپ سے حدیث پڑھی۔ آپ کا قیام اس مرتبہ ٹونک میں ۱۲۸۰ھ تک رہا۔

جہاد ۱۸۵۷ء میں آپ کو اپنے رفقاء[1] حضرت حاجی امداد اللہؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کی رائے سے اختلاف تھا لیکن یہ اختلاف ایسا نہ تھا جس سے آپس میں کوئی رنجش پیدا ہوتی۔ آپ نے نہ تو مجاہدین کی مخالفت کی اور نہ مجاہدین نے آپ کے اختلاف سے نفرت کا اظہار کیا بلکہ یہ ایک اجتہادی اختلاف تھا۔ آپ کے اخلاق و عادات کے متعلق آپ کے مرید حکیم محمد عمر چرتھالوی حالات محمدیہ میں لکھتے ہیں:

آپ ہمیشہ پاک وصاف، نفیس وشفاف کپڑے پہنا کرتے تھے اور لطیف وقلیل کھانا کھاتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن جاڑوں میں اور گرمیوں میں اکثر روزانہ نہاتے تھے۔ آپ کسی حالت میں کسی فرد بشر کی عیب بینی اور اس پر نکتہ چینی نہیں کرتے تھے۔ کبھی کسی کو برا نہ کہتے اور کسی وقت بے وضو نہیں رہتے تھے۔ آٹھ پہر میں کل چار گھنٹے آرام فرماتے۔ ہر امر میں اتباع سنت فرماتے تھے۔

آپ سے مسائل معلوم کرنے والوں میں بعضا آدمی بے تکے سوال کرتا اور بہت سمع خراشی کرتا تھا۔ مگر آپ جواب میں ذرا بھی سختی کو کام میں نہ لاتے تھے۔ نہایت نرمی سے مکرر سہ کرر سمجھاتے، کبھی کسی سے ترش روئی یا خفگی سے پیش نہ آتے تھے۔ بلا وجہ کسی سے بغض نہیں رکھتے تھے۔ بلا ضرورت شرعی کہیں نہ جاتے۔ ہر وقت اپنی قیامگاہ میں بیٹھا رہنا پسند فرماتے اور سفر میں باجود سواری موجود ہونے کے کوسوں تک پیدل چلتے تھے۔ آپ کی صورت بہت حسین تھی، آپ کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ دیکھ لی آخر تک از بر رہتی۔ تفسیر،

---

[1] حضرت حافظ ضامن شہیدؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرؒ اور حضرت شیخ محمد محدثؒ مسجد پیر محمد کے تین حجروں میں رہتے تھے اور تینوں حضرات کے متوسلین کا اجتماع رہتا تھا۔ ذکر و فکر کی محفلیں آباد تھیں اسی وجہ سے اس تاریخی مسجد کو دکانِ معرفت کہا جاتا تھا۔ اسی مسجد کے جنوب میں خانقاہ امدادیہ اب تک موجود ہے جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آخری وقت تک تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا اور ذکر و شغل کے انوار سے مسجد و خانقاہ کے در و بام کو بدستور سابق منور کیا۔ (فریدی)

اصول فقہ اور حدیث میں خاص ملکہ تھا۔

یوں تو آپ کے سیکڑوں شاگرد اور ہزاروں مرید تھے۔ لیکن ان مریدوں میں آپ کے خلیفہ قاضی محمد اسماعیل[۱] منگلوریؒ، حکیم محمد عمر چرتھاولیؒ اور شاگردوں میں نواب محمد علی خاں والیِ ٹونک، دیوان شمس الدین نائب ریاست ٹونک اور قاضی شیخ محمد محدث مچھلی شہریؒ (قاضی بھوپال) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ اپنے زمانہ کے زبردست صاحب نسبت بزرگ اور بلند مرتبہ محدث تھے۔ آپ نے تصنیفات کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ چھوڑا ہے جو یہ ہے: (۱) دلائل الافکار (۲) مناظرۂ محمدیہ مصنفہ ۱۲۶۴ھ (بجواب رسالہ مولانا عبدالحق خیرآبادیؒ جو کہ انھوں نے امام رازیؒ کے بعض اقوال کی تردید میں لکھا تھا) (۳) مکاتیب محمدیہ جواب اعتراض مولوی بشیر الدین قنوجی (۴) ارشاد محمدی (فی الاشغال والاعمال) (یہ رسالہ ۱۲۷۷ھ میں میرٹھ کے قیام کے زمانہ میں طبع ہو کر شائع ہوا) (۵) انوار محمدی فی المراقبات والمشاہدات (یہ رسالہ مطبع ضیائی میرٹھ میں طبع ہوا) (۶) رسالۂ صلوٰۃ (۷) الہامات محمدیہ (۸) قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباس (یہ کتاب مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی کتاب دافع الوسواس کے جواب میں تحریر فرمائی) (۹) بیاض محمدی حصہ اول (یہ کتاب مجرب اعمال و نقوش میں ہے اور مسلم پریس دہلی میں چھپ چکی ہے) (۱۰) بیاض محمدی حصہ دوم (۱۱) شرح نسائی (۱۲) رسالہ گل و لالہ (یہ رسالہ فن تصوف میں ہے اور میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کی زندگی میں لکھا گیا ہے) (۱۳) فتاویٰ محمدی (۱۴) سماع موتی (یہ رسالہ آخر ماہ صفر ۱۲۹۶ھ میں لکھا گیا ہے اور آپ کی آخری تصنیف ہے جو بوجہ کمزوری حکیم محمد عمر چرتھاولی کو بول کر لکھائی اور مولانا رحم الٰہی منگلوری کو جو اس روز اتفاق سے رک گئے تھے سنائی۔ یہ رسالہ دراصل سماع موتی کے ایک استفسار کے جواب میں ہے) (۱۵) مثنوی دفتر

---

۱ قاضی محمد اسماعیل منگلوریؒ کے صاحبزادے قاضی عبدالغنی منگلوریؒ تھے۔ ہندوستان کے دو مشہور و معروف شاعر اصغر گونڈویؒ اور جگر مرادآبادیؒ قاضی عبدالغنی منگلوریؒ سے ہی بیعت تھے۔ (فریدی)

ہفتم۔ حکیم محمد عمر صاحب نے مولانا کی بتیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے تصنیف کی تھیں لیکن دیگر کتابوں کے نام نہیں لکھے۔

قاضی محمد اسماعیل منگلوریؒ نے اپنے رسالہ تنبیہ کے حاشیہ میں ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے جس کا نام فیضانِ محمدی ہے۔

کتب مذکورہ میں رسالہ ''گل و لالہ'' اور ''فتاویٰ محمدی'' نہیں چھپیں۔ بقیہ مذکورہ بالا کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جو ورثہ میں منتقل ہوا۔ مولانا کے بڑے صاحبزادے مولانا محمود[1] احمد تھے۔ جن کے چار لڑکے مسعود احمد، محمد احمد، محمد اعلیٰ اور حافظ محمد افضل تھے۔ پہلے دونوں صاحبزادے پاکستان چلے گئے تھے۔ موخر الذکر یعنی حافظ محمد افضل کے دو لڑکے اسلم اور اکمل مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی کے نواسے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک یہ کتب خانہ جناب اسلم صاحب کے پاس تھا لیکن جب وہ پاکستان چلے گئے تو ان کے جاتے ہی پناہ گزیں حضرت مولانا کے مکان پر قابض ہو گئے اور انھوں نے تمام کتب خانہ ردی میں کسی دوسری جگہ جا کر فروخت کر دیا[2]۔

اسلم صاحب کے مکان کے برابر میں جامعہ اشرفیہ کے ایک مدرس رہتے تھے جو کتابیں باقی رہ گئی تھیں انھوں نے خرید لیں۔ اس طرح یہ نادر کتب خانہ ختم ہو گیا۔ باقی رہے نام اللہ کا! آپ نے ۷/ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو بروز سہ شنبہ تھانہ بھون میں انتقال فرمایا۔ شیخ محمد مرحوم سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

مولانا جمال الدین دہلویؒ: (مولانا منشی جمال الدین ابن وحید الدین ابن

---

[1] مولانا کی کنیت ابوالمحمود آپ کے ان ہی صاحبزادے کے نام پر تھی۔ حضرت مولانا شیخ محمدؒ نے کئی نکاح کیے تھے آپ کی ایک بیوی سے مولانا محمود احمد اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں۔ دوسری بیوی سے مولانا محمد عمر اور ایک لڑکی تھی اور تیسری بیوی سے حافظ محمد صدیق تھے۔

[2] اس کتب خانہ کا یہ حال مجھے مولانا سید حامد حسن صاحب امروہی خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک خط سے معلوم ہوا جو انھوں نے احقر کے جواب میں لکھا تھا۔ (فریدی)

محی الدین ابن حسام الدین صدیقی کوتانوی دہلوی)

آپ ۱۲۱۷ھ میں بمقام کوتانہ جو کہ دہلی سے تیس میل پر واقع ہے پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ پھر بغرض تحصیل علوم دہلی کا سفر کیا اور یہاں پر مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ، شاہ محمد یعقوب دہلویؒ اور ان کے بڑے بھائی شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھا۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ اور ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز محدث نیز حضرت غلام علی مجددی دہلویؒ سے بھی علمی و روحانی استفاضہ کیا تھا۔ اولاً آپ شاہ محمد آفاق نقشبندیؒ سے بیعت تھے۔ پھر شاہ محمد یعقوب دہلویؒ سے اپنا تعلق قائم کیا اور عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے۔

۳۳ سال کی عمر میں تقدیر آپ کو بھوپال لے آئی۔ یہاں سکندر بیگم والیۂ بھوپال نے آپ سے نکاح کیا اور آپ کو بھوپال کا مدار المہام بنا دیا۔ ۱۲۶۳ھ سے آپ تمام عمر سکندر بیگم اور ان کی صاحبزادی شاہجہاں بیگم کے نائب رہے۔ آپ بہت حلیم، سخی، متواضع، کثیر العبادت اور صاحب صدق و اخلاص تھے۔ برابر تدریس قرآن اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مشغول رہتے تھے۔ یتیموں اور ضعیفوں کی خبر گیری رکھتے تھے۔ تزویج بیوگان اور تجہیز دوشیزگان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اشاعت سنت اور نشر قرآن آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ خود قرآن کی تلاوت کرتے اور قرآن کا درس دیتے .... قرآن کے نسخوں کو بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے تھے اور مستحقین پر تقسیم کر دیتے تھے۔ آپ کے آثار باقیہ میں سے یہ بات بھی ہے کہ آپ نے شیخ علی مہائمی کی تفسیر رحمانی کو کئی جلدوں میں طبع کرایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی دو مشہور اور معرکۃ الآرا کتابیں حجۃ اللہ البالغہ، اور ازالۃ الخفاء آپ ہی نے طبع کرائیں اور ان کتابوں کو مستحقین پر تقسیم کر دیا۔ آپ کے آثار باقیہ میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے ترکی اور افغانی زبانوں میں قرآن کی تفسیر کو اپنا مال کثیر خرچ کر کے طبع کرایا اور بلاد ترکستان و افغانستان و روم میں شائع کیا۔

آپ کے آثارِ خیر میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے بڑے بڑے مدارس اور اونچی اونچی مسجدیں شہر بھوپال میں بنوائیں۔ یہاں پر مسجدوں کی کثرت اور ان کی آبادی کثرت تلاوت قرآن، کثرت درس حدیث، اشاعت تشرع وتورع میں آپ کا بہت کچھ حصہ ہے۔ آپ صورت وسیرت دونوں میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ مسجد میں اہتمام کے ساتھ جماعت کی نماز ادا کرتے تھے۔ مسجد میں اپنا جوتا خود اُٹھاتے تھے۔ آپ کے محل سرائے میں دربانوں اور پاسبانوں کا کوئی کام نہ تھا۔ جو شخص جس وقت آپ کے پاس جانا چاہتا بے تکلف جا سکتا تھا اور اپنا مقصد پیش کر سکتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ آپ صحابہ کرامؓ کے اخلاق کا نمونہ تھے آپ کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا۔ (کمافی روزِ روشن) (ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا مفتی قاضی محمد ایوب ابن قمر الدین صدیقی پھلتیؒ:

آپ ۱۲۴۱ھ یا ۱۲۴۴ھ میں پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مظفر نگر میں مولانا نصر اللہ خاں خورجویؒ سے مختصرات پڑھیں اور پھر دہلی گئے، وہاں مولانا سید محمد دہلویؒ، مولانا سدید الدین ابن مولانا رشید الدین دہلویؒ، مولانا محمد عمر ابن مولانا محمد اسماعیل دہلویؒ، مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ، مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ، شاہ احمد سعید مجددی دہلویؒ، علامہ ملا نوابؒ اور مفتی عبدالقیوم محدث بڈھانویؒ وغیرہم سے علوم حاصل کیے۔

آپ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی خدمت میں بھی جاتے رہتے تھے اور ان کی مجالس وعظ میں بھی آپ حاضر ہوتے تھے اور ان سے پڑھا بھی تھا۔ دو مرتبہ ''حرمین شریفین'' گئے۔ شریف محمد ابن ناصر ابن حسین حازمی قشیریؒ سے اور شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ سے ''مکہ معظّمہ'' میں اجازت حدیث حاصل کی۔

۱۲۶۶ھ میں بھوپال گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اپنے خالہ زاد بھائی حضرت مولانا مفتی عبدالقیومؒ کی جگہ ۱۲۹۷ھ میں ریاست بھوپال کے مفتی مقرر

ہوئے۔اور تقریباً ۱۳۰۲ھ میں وہاں کے قاضی ہوئے۔آپ اخلاق حسنہ کا مجموعہ تھے۔ تعبیر رویا میں مشہور ومعروف تھے۔درس وافادہ میں برابر مشغول رہتے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ فرماتے ہیں کہ میں ان سے بھوپال میں ملا ہوں اور ان کے حلقۂ درس میں بھی حاضر ہوا ہوں۔وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل کرے اور ان کی برکات سے ہمیں نفع پہنچائے۔آپ نے ۱۳۱۵ھ میں بھوپال ہی میں وفات پائی۔(ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ہشتم)

مولانا عبدالرشید نقشبندی مجددی مہاجرؒ: الشیخ العالم الصالح عبدالرشید بن احمد سعید بن ابی سعید العمری الدھلوی المہاجر.

آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں حضرت شاہ احمد سعید مجددی مہاجرؒ کے صاحبزادے تھے۔۱۲۳۷ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور قرآن حفظ کیا۔مولانا حبیب اللہؒ اور مولانا فیض احمدؒ سے علم حاصل کیا اور صحاح ستہ کو حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھا۔ پھر اپنے والد کی خدمت میں رہے اور سلوک طے کیا۔اپنے والد کے ساتھ ۱۲۷۴ھ میں حجاز گئے اور حج وزیارت سے فارغ ہوکر ''مدینہ منورہ'' میں سکونت پذیر ہوئے۔اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۲۷۷ھ میں ان کے جانشین ہوئے اور مسند مشیخت پر بیٹھے۔آپ صاحب ورع و تقویٰ، کثیر البکا، شدید الخشیہ اور صاحب معارف ومواجید بزرگ تھے۔''مدینہ منورہ'' سے ''مکہ مکرمہ'' منتقل ہوگئے تھے۔وہاں تاحیات تربیت طالبین اور تسلیک سالکین میں مشغول رہے۔ ۱۷ رذی الحجہ ۱۲۸۷ھ کو ''مکہ معظمہ'' ہی میں وفات پائی اور جنت المعلی میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے مزار مقدس کے سامنے دفن ہوئے۔(ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

انوار العارفین مؤلفہ صوفی محمد حسین مرادآبادیؒ میں بھی آپ کا تذکرہ موجود ہے۔ اس تذکرہ میں سے یہ چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) آپ کے پدر بزرگوار حضرت شاہ احمد سعید مجددیؒ نے آپ کو حفظ کلام اللہ اور

فراغت علوم ظاہری کے بعد تحصیل سلوک کے لیے اپنی نگرانی میں رکھا اور نقشبندی طریق اور دیگر طرق کے اذکار و افکار اور اشغال طریقہ تعلیم و تلقین فرمائے۔

(۲) حجاز کو ہجرت کرنے سے پہلے آپ اپنے رشتہ کے چچا مولانا ارشاد حسین مجددیؒ کے پاس ایک مرتبہ دہلی سے رام پور تشریف لے گئے تھے جو کہ آپ کا آبائی وطن تھا۔ نواب کلب علی خاں کی ولی عہدی کا زمانہ تھا۔ ظاہری تعلیم حاصل کرنے کے بعد نواب صاحب کو کسی مرشد کامل کی تلاش و جستجو ہوئی۔ جب مولانا عبدالرشید مجددیؒ کی آمد کی خبر سنی تو بکمال نیازمندی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور مولانا ارشاد حسین مجددیؒ کی وساطت سے مرید ہونا چاہا۔ آپ نے نواب صاحب کو بیعت فرمالیا اور طریقہ مجددیہ کے سلوک کی رہنمائی فرمائی اور اس طریق کے حاصل کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا۔ (ماخوذ از انوار العارفین ص ۵۰۸، ۵۰۹)

مولانا عبداللطیف ویلوری مدراسیؒ (قطب ویلور): الشیخ الامام العالم الصالح عبداللطیف بن ابی الحسن الحسینی النقوی الاحمدآبادی.

آپ ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا پھر اپنے والد مولانا ابوالحسن سے نیز مولانا محمد حسین اور مولانا علاء الدین ملک العلماء مدراس سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۴۲ھ میں ان علماء سے سند فراغت حاصل کی۔ بعد کو ۱۲۶۰ھ میں حجاز گئے اور حج وزیارت سے سرفراز ہوکر "مکہ معظمہ" میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجرؒ کی خدمت میں اقدس میں رہے اور علم حدیث حاصل کیا۔ ۱۲۶۲ھ میں حضرت شاہ صاحب موصوف نے آپ کو اجازت حدیث عطا کی۔ پھر آپ ہندوستان واپس آئے اور اپنی پوری عمر نشر علوم و معارف میں صرف کی۔ جس نے آپ کی تصنیفات دیکھی ہیں اس کو وسعت علم میں آپ کا مرتبہ، آپ کی قوت فہم اور تیزی ذہن کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے بڑھاپے کے زمانہ میں انگریزی زبان سیکھی اور ملکہ وکٹوریہ کو انگریزی زبان میں ایک خط لکھا

جس میں اس کو دعوت اسلام کی تھی۔ آپ کی تصنیفات یہ ہیں: (۱) القول الفصل (۲) جواہر الحقائق (۳) جواہر السلوک (۴) فصل الخطاب۔ آپ کے اور شیخ عبدالفتاح شارح مثنوی کے درمیان نسبی حیثیت سے ۹ واسطے ہیں۔ ۱۱ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ میں بمقام "مدینہ منورہ" آپ کا وصال ہوا۔ (کما فی حدیقۃ المرام، ماخوذ از نزہۃ الخواطر)

مقالاتِ طریقت مؤلفہ محمد عبدالرحیم ضیاء میں بھی مولانا عبداللطیف ویلوریؒ کے حالات درج ہیں۔ ناظرین کے اضافہ معلومات کے پیش نظر مقالات طریقت سے بھی مولانا ویلوریؒ کے سوانح کی تلخیص لکھی جاتی ہے۔

حافظ حاجی سید عبداللطیف المعروف بہ سید شاہ محی الدین القادری النقوی الویلوری المدنی قدس اللہ اسرارہ ابن سید شاہ ابو الحسن قادریؒ

آپ کی ولادت ۱۲۰۷ھ میں ویلور میں ہوئی۔ ۱۹ سال کی عمر میں کتب عقائد، فقہ، آداب و اخلاق، انشاء و قصائد وغیرہ اپنے والد ماجد اور دوسرے استادوں سے پڑھ چکے تھے۔ ۱۲۲۸ھ میں حفظ قرآن مجید سے فارغ ہوئے۔ مدت تک کتب تفاسیر و احادیث اور کتب سیر و تاریخ، بزرگوں کے حالات و ملفوظات اور عیسائیوں سے مناظرہ کی کتابیں مطالعہ میں رکھیں۔ اسی اثنا میں تحفہ اثنا عشری (مصنفہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ) دیکھی اور شوق اس بات کا پیدا ہوا کہ دہلی جا کر براہ راست اس کے مصنف سے ملاقات کی جائے۔ جب اسباب سفر کی تیار کر لی تو آپ کی والدہ ماجدہ نے اس ارادہ سے مطلع ہو کر فرمایا کہ اول اپنے علاقہ میں علوم سے اچھی طرح فراغت پا لو پھر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں جانا تا کہ ان سے استفادہ کا سلیقہ پیدا ہو جائے۔ حسب ارشاد والدہ ماجدہ ۱۲۳۴ھ میں مدراس تشریف لے گئے اور تیمنا و تبرکاً دو سبق مولانا عبدالعلی بحر العلوم فرنگی محلیؒ المعروف بہ ملک العلماء اور فاضل عالیجاہ مولانا باقرؒ سے پڑھ کر فاضل متبحر مولانا علاء الدین جو ملک العلماء کے

داماد اور شہر استاذ تھے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام علوم عقلی و نقلی سے ۵؍شعبان ۱۲۴۲ھ میں فراغت حاصل کی۔ اس عرصہ میں ادھر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا ادھر آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ آپ اپنے والد کے خلیفہ و جانشین ہو گئے۔

آپ ہر جمعہ کو مردوں میں اور ہر سہ شنبہ کو عورتوں میں وعظ فرماتے اور کتب دینی طالبان خدا کو پڑھاتے تھے۔ آپ ہمیشہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ احیاء التوحید، احیاء السنہ، تنبیہ الجاہلین، صراط المومنین اور اصل العلوم۔ آپ کی یہ کتابیں اسی زمانہ کی تصنیف ہیں۔ آپ نے ۲؍شعبان ۱۲۶۰ھ کو پہلا سفر حجاز اختیار کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ ''مکہ معظمہ'' میں ایک سال سے زیادہ جناب معلّی القاب قطب آفاق حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق محدث مہاجرؒ کی خدمت و صحبت میں رہے اور سند فراغت حدیث حاصل کی۔ (مقالاتِ طریقت میں یہ سند درج ہو گئی ہے)

آپ نہایت متبع سنت اور قامع بدعت تھے۔ ایک عالَم نے آپ سے ہدایت پائی۔ آپ کے تخمیناً ۶ لاکھ سے زیادہ مرید ہیں۔ علم و عمل، تواضع و انکسار، توکل و قناعت نیز سخاوت اور فراست میں وحید العصر تھے۔ لوگ دور و دراز سے آپ کی خدمت میں آتے اور اپنے دینی مقاصد میں کامیاب ہوتے تھے۔ آپ سے دور دراز علاقوں سے فتوے طلب کیے جاتے تھے۔ اور آپ ان کے جوابات لکھ کر بھیجتے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کا ایک ضخیم دفتر ہے۔ اور آپ کے مکتوبات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔

۳؍شوال ۱۲۸۹ھ[1] بروز سہ شنبہ آپ دوبارہ حج و زیارت کے لیے گئے۔ حج کے بعد ۱۱؍محرم الحرام ۱۲۹۰ھ بروز پنجشنبہ بوقت عصر ''مدینہ منورہ'' میں آپ کی وفات ہوئی اور

---

[1] اگر ۳؍شوال ۱۲۸۹ھ میں مولانا ویلوریؒ کا دوسرا حج ہوا تھا تو تاریخ وفات یقیناً ۱۱؍محرم ۱۲۹۰ھ ہو گی۔ میری بیاض میں مقالات طریقت سے وفات کا کوئی سنہ درج نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ میرے لکھنے سے چھوٹا یا کتاب میں ہی نہیں ہے۔ نزہۃ الخواطر میں تاریخ وفات ۱۱؍محرم ۱۲۸۹ھ لکھی ہے اگر یہ صحیح ہے تو سفر حجاز شوال ۱۲۸۸ھ میں ہوا ہو گا۔ (فریدی)

جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند ارجمند سید رکن الدین آپ کے خلیفہ و جانشین ہوئے[1]۔

مولانا امداد العلی امروہیؒ: شیخ وزیر علی کے صاحبزادے تھے اور امروہہ کے ساکن تھے۔ آپ فاضل کامل، عالم متبحر، حافظ و قاری، محدث اور مقتدائے وقت اور طبیب بے بدل تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ سے جن کا قیام اس زمانہ میں امروہہ میں تھا علم تجوید و قرأت سیکھی۔ مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ مہاجر مکی سے اخذ علوم کیا۔ طب کی تکمیل حکیم غلام حسنؒ اور حکیم امام الدین خاں دہلویؒ سے کی۔ بعد تحصیل و تکمیل علوم امروہہ ہی میں قیام رہا اور مدت العمر اپنے مکان واقع محلّہ مولانا (ملانہ) پر درس و تدریس اور مطب کا شغل رہا۔ نہایت نیک نہاد، گوشہ نشین و عزلت گزیں بزرگ تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ علم طب کے عملی و نظری فنون میں ایک مبسوط کتاب سراج الوہاج نامی عربی میں تالیف کی۔ اس کے علاوہ متعدد رسائل مجمع البحرین وغیرہ مختلف مسائل کی تحقیقات میں لکھے۔ تاحیات جامع مسجد امروہہ کی امامت بھی آپ سے متعلق رہی۔ خاندانِ بنی القضاۃ میں شیعی عقائد کا شیوع ہونے لگا تو عیدین کی نماز بھی آپ ہی پڑھانے لگے۔ تقریباً ۱۲۸۲ھ میں وفات ہوئی۔ (ماخوذ از تذکرۃ الکرام مؤلفہ محمود احمد عباسی)

---

[1] محترمی مولانا سید صبغت اللہ بختیاری زید مجدہم استاذ مدرسہ باقیاتِ صالحات ویلور نے حال ہی میں اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ احقر کو توجہ دلائی کہ تلامذہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدثؒ میں مولانا عبداللطیف ویلوریؒ کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ میں نزہۃ الخواطر میں مولانا ویلوریؒ کے جو حالات درج ہیں ان کے ترجمے پر اکتفا کر چکا تھا اور یہ بات ذہن میں نہیں رہی تھی کہ مقالات طریقت میں بھی مولانا ویلوریؒ کا ذکر ہے اور میں اس کو نقل کر چکا ہوں۔ عرصہ ہوا میں نے اپنی ایک بیاض میں مولانا ویلوریؒ کا تذکرہ مقالات طریقت سے نقل کر لیا تھا۔ یہ کتاب میں نے ایک جگہ سے مستعار لی تھی اور پھر واپس کر دی تھی۔ اب مولانا سید صبغت اللہ بختیاری نے مقالات طریقت کا حوالہ دیتے ہوئے مجھے اس طرف متوجہ فرمایا تو میں نے اپنی یہ بیاض نکلوائی اس میں تذکرہ موجود تھا۔ اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا گیا ہے۔ (فریدی) جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو مولانا بختیاریؒ بقید حیات تھے۔ آپ کا وصال ۱۱ر مئی ۱۹۹۳ء میں ہوا۔ تدفین ۱۲ر مئی کو ہوئی۔ (محب الحق)

مولانا عبدالخالق حسینی محدث دہلویؒ: آپ نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ سے تحصیل علم کی اور ان کی خدمت میں مدتوں رہے۔ بعدہٗ شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ سے سند حدیث حاصل کی۔ آپ کے داماد مولانا نذیر حسین صاحب دہلویؒ اور بہت سے لوگوں نے آپ سے اخذ علم کیا۔ آپ نے ایک عرصہ تک دہلی میں درس دیا۔ ۱۲۶۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم بحوالہ مقدمہ غایت المقصود)

مولانا حافظ عبدالعزیز اخوند ابن الٰہی بخش دہلویؒ: آپ ۱۲۱۱ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، صرف ونحو اور عربی مولانا کریم اللہ دہلویؒ سے پڑھی اور شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ سے بخاری شریف پڑھی۔ آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے بھی فیض علم حاصل کیا تھا۔ اور شاہ محمد غوث مارہرویؒ سے سلوک طریقت طے کیا تھا۔ ایک مدت تک ان کے پاس رہے پھر دہلی میں مسند مشیخت وارشاد پر بیٹھے۔

۱۰ محرم الحرام ۱۲۹۶ھ کو آپ کا انتقال ہوا اور احاطۂ خواجہ باقی باللہؒ میں دفن ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم بحوالہ ریاض انوار)

محمد عالم شاہ فریدی نے اپنی کتاب مزارات اولیاء دہلی میں آپ کا تذکرہ کیا ہے اس میں سے چند معلومات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

اخوند حافظ عبدالعزیز دہلوی کا لقب شاہ مقبول احمد قادری ہے۔ آپ نے ۹ سال کی عمر میں اخوند برہان الدین سے قرآن شریف حفظ کیا تھا۔ اور مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ سے سورہ بقرہ کا آخری رکوع پڑھا تھا۔ مولانا کریم اللہ دہلویؒ سے تحصیل علم کیا۔ بعدہٗ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے کتب حدیث پڑھی تھیں۔

آپ کا مزار آستانہ خواجہ باقی باللہؒ میں جانب شمال وشرق ایک چھوٹی سی علیحدہ چہار دیواری میں ہے۔ آپ کے بعد آپ کے نواسے مولوی محمد عمر جانشین ہوئے۔

مولانا عبداللہ الہ آبادیؒ: آپ مؤضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے

وطن میں حاصل کی اور اپنے شہر کے اساتذہ سے ایک مدت تک علوم کو پڑھ کر دہلی کا سفر کیا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث پڑھی۔ آپ نے بہت سی کتب متداولہ کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ تقلید شخصی کے انکار میں متشدد تھے۔ حکیم سید عبدالحئ حسنیؒ نے تذکرہ النبلاء سے اخذ کر کے آپ کا تذکرہ لکھا ہے اور آخر میں مولانا شمس الحق دیانویؒ کا آپ کے بارے میں ایک قول درج کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے بہت سے فضائل ہیں۔ کاش کہ آپ کے اندر بعض مسائل میں تشدد نہ ہوتا۔ (از نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا عبدالہادی جھومکوی (بہاری): آپ ۱۲۰۵ھ میں جھومکا ضلع چمپارن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بتوں کے پجاری تھے۔ آپ نے غیر مسلم باپ کی نگرانی میں علم خط، انشا، تاریخ اور انگریزی زبان کو سیکھا۔ پھر قانون حکومت پڑھا اور امتحان وکالت دینے کے لیے پٹنہ پہنچے تو اسی زمانہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ وہاں تشریف لائے۔ حضرت سید صاحبؒ کا یہ سفر حج تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سید صاحبؒ کی برکت سے آپ کو ایمان و اسلام کی دولت سے نوازا۔ آپ نے شاہ محمد اسماعیل دہلویؒ سے پڑھا پھر مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ، مولانا سید حسن ابن علی بخاری قنوجیؒ اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے تحصیل علم کی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے سارن اور چمپارن (صوبہ بہار) کے لیے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ آپ چمپارن میں دورہ فرماتے تھے، حکمت و موعظت حسنہ کے ساتھ وعظ کرتے تھے اور سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو نفع پہنچایا۔ سفر حج کے اندر ۱۲۶۵ھ میں آپ نے وصال فرمایا۔
(نزہۃ الخواطر جلد ہفتم بحوالہ تذکرۃ النبلاء)

مولانا علی احمد ٹونکیؒ: آپ ۱۲۴۲ھ میں دہلی آئے اور محلہ کٹرہ پنجابیان میں سکونت پذیر ہوئے۔ مولانا عبدالخالق دہلویؒ سے اخذ علم کیا اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ

سے سند حدیث حاصل کی۔

۱۲۵۰ھ میں سندھ گئے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلہ کے ہمراہ ٹونک آ گئے۔ نواب وزیر الدولہ نے آپ کا بہت اکرام کیا اور محکمہ انشاء میں آپ کا تقرر کر دیا۔ آپ تمام عمر اسی عہدے پر فائز رہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا کرامت علی ابن حیات علی اسرائیلی شافعی دہلویؒ: آپ دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی۔ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ اور مولانا فضل امام خیر آبادیؒ سے تحصیل علم کی۔ حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ سے بھی حدیث کا کچھ حصہ پڑھا۔ پھر حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث کی سند حاصل کی۔ آپ نے ایک مدت تک دہلی کے اندر درس دیا پھر حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں عدل وقضا کے محکمہ میں آپ کا تقرر ہوا اور ایک ہزار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس عہدے پر بیس سال تک قائم رہے۔ سیرت احمدیہ (عربی) ایک ضخیم کتاب آپ کی تصنیفات میں سے ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا محمد جمیل ابن عبد الغفار حنفی برہانپوریؒ: آپ شہر برہان پور میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا اور اساتذہ شہر سے کتب مختصرات پڑھیں پھر حیدر آباد کا سفر کیا اور وہاں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ دہلی آئے اور مولانا سید محمد قندھاریؒ، مفتی صدر الدینؒ اور شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ کا سفر کیا اور مرزا حسن علی شافعیؒ سے اخذ علوم کیا۔ آپ نے حجاز کا سفر کیا اور حج وزیارت سے سرفراز ہوئے۔ بعدہٗ ہندوستان واپس ہو کر برہان پور کے قاضی مقرر ہوئے۔ ایک مدت تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ پھر حیدر آباد گئے اور وہاں کے مدرسہ عالیہ میں مقرر ہوئے۔ تمام عمر درس وافادہ میں مشغول رہے۔ آپ سے بہت سے لوگوں نے علم حاصل کیا۔ ۱۲۷۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم بحوالہ تاریخ برہان پور)

مولانا نوازش علی حنفی دہلویؒ: آپ نے خاص طور پر حدیث حضرت شاہ محمد

اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھی۔ دیگر کتب درسیہ دوسرے علماء سے پڑھی تھیں۔ آپ حلیم، قانع، متوکل اور خوش اخلاق تھے۔ کبھی کبھی اپنے مکان پر مجلس وعظ وتذکیر منعقد کیا کرتے تھے اور کبھی لوگ اپنے گھروں پر بلا کر آپ کا وعظ سنتے تھے۔ وعظ و پند کے اندر بہت مقبول تھے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا یار علی حنفی محدث ترہتیؒ (دربھنگوی): آپ فقہ وحدیث میں بلند پایہ تھے۔ کتب درسیہ اپنے وطن میں پڑھیں پھر دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث پڑھی۔ آپ بہت ذکی الطبع اور تیز ذہن والے تھے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا امام الدین ابن یار محمد کشمیری حنفی طوکیؒ: الشیخ العالم الفقیہ المحدث امام الدین بن یار محمد الکشمیری الحنفی الطوکی.

آپ بمقام ریاست پونچھ ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے وطن میں کچھ تحصیل علم کر کے دہلی گئے۔ وہاں مفتی صدرالدین صاحبؒ اور دیگر علماء سے کتابیں پڑھیں۔ حدیث حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھی۔ پھر ٹونک چلے گئے۔ وہاں مولانا حیدر علی حسینی رامپوریؒ سے فقہ، اصول فقہ، طب، حدیث اور بہت سے علوم حاصل کیے۔ ٹونک میں آپ نے سکونت اختیار کر لی تھی۔ نواب محمد علی خاں اور بہت سے علماء نے آپ سے علم حاصل کیا۔ شیخ ابوالخیر احمد بن عثمان مکیؒ نے بھی آپ سے سند حدیث لی۔ شہر ٹونک میں علم وفضل کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ آخر عمر میں وہاں کے قاضی ہو گئے تھے۔ ۱۳۱۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہشتم)

مولانا حفیظ اللہ ابن گاما خاں دہلویؒ: آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید دہلویؒ نے آپ کے لیے برکت کی دعا کی تھی۔ آپ کے والد حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے پاس بیٹھنے والوں میں تھے۔ آپ نے بعض کتب درسیہ مولانا عبدالخالق دہلویؒ سے اور بعض کتب درسیہ حضرت شاہ

محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھیں۔ جب حضرت شاہ محمد اسحاقؒ حجاز کو ہجرت کر گئے تو آپ میاں نذیر حسین محدثؒ کی خدمت میں پہنچ گئے اور ان سے تفسیر، حدیث اور فقہ حنفی کو حاصل کیا۔ پھر درس وافادہ میں مشغول ہوئے۔ آپ ہر ہفتہ پیر کے دن وعظ فرماتے تھے۔ آپ کے وعظ احادیث صحیحہ اور تفسیر قرآن پر مشتمل اور بہت دل نشین ہوتے تھے۔ (مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ فرماتے ہیں کہ میں آپ کی مجلس وعظ میں حاضر ہوا ہوں) ۳؍رمضان ۱۳۴۴ھ کو دہلی میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہشتم)

مولانا محمد ابن عبدالرحمٰن انصاری سہارنپوری مہاجر مکیؒ: آپ سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کے لیے بچپن ہی میں دہلی کا سفر کیا۔ وہاں مولانا سید نصیر الدین مجاہد- داماد حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ- کی خدمت میں رہے اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے اور ان کے بھائی حضرت شاہ محمد یعقوبؒ سے پڑھا۔ پھر اپنے استاذ مولانا نصیر الدین مجاہد کے پاس سندھ چلے گئے اور ان کے ساتھ رہ کر جہاد فی سبیل اللہ کیا۔ مولانا محمد حیات محدث سندھیؒ کے بعض تلامذہ سے سندھ میں مشکاۃ المصابیح پوری توجہ کے ساتھ پڑھی۔ آپ کو مشکاۃ کے ذریعہ سے حدیث میں ملکہ راسخہ حاصل ہوا۔ پھر "مکہ معظمہ" کا سفر کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ وہاں شیخ عبداللہ سراج مکی حنفیؒ کی خدمت میں رہے۔ شیخ عبداللہ سراج حنفی سے دس سال میں بخاری پڑھی اور جب حضرت شاہ محمد اسحاق- محدث دہلویؒ ہجرت کر کے "مکہ معظمہ" آئے تو ان سے تمام کتب صحاح ستہ از اول تا آخر پڑھیں۔ آپ نے نجد وعسیر، شام اور یمن کا پاپیادہ سفر کیا تھا اور ہر جگہ مشائخ عصر سے علم حاصل کیا تھا اور سب نے آپ کو اجازت دی تھی۔ آپ نے "مکہ معظمہ" میں تمام عمر درس دیا۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے ۷۰ سال درس حدیث دیا ہے۔ ۹۰ سال سے زیادہ آپ کی عمر ہوئی۔ ۱۳۰۸ھ میں "مکہ معظمہ" میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہشتم)

مولانا ابراہیم ابن مدین اللہؒ ساکن نگرنہسہ (بہار): آپ ۱۲۲۵ھ

میں پیدا ہوئے۔ مختصرات اپنے والد اور دیگر علماء سے پڑھیں۔ ریاست رامپور کا سفر کیا اور شیخ نور الاسلام ابن سلام اللہ دہلوی ثم رامپوریؒ، مفتی شرف الدین رامپوریؒ اور مولانا حیدر علی ٹونکیؒ سے پڑھا۔ رامپور سے دہلی کا سفر کیا، وہاں کچھ کتابیں مفتی صدر الدین صاحب دہلویؒ سے پڑھیں۔ حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حاصل کی۔ شیخ حسن علی سے بھی جو کہ مرزا حسن علی محدث لکھنوی کے علاوہ تھے حدیث پڑھی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ۱۸ سال درس دیا۔ ''حرمین شریفین'' گئے، حج وزیارت سے سرفراز ہوئے اور وہاں سے اپنے ساتھ عمدہ عمدہ کتابیں لائے۔ آپ کو کتابوں کے جمع کرنے اور رات دن ان کے مطالعہ کرنے کا شوق تھا۔ حاذق طبیب بھی تھے۔ آپ کی بہت سی تصنیفات میں سے تین کتابیں یہ ہیں: (۱) الحی شرح دیوان متنبیؔ (۲) ضابط الادباء (۳) حاشیہ علی شرح الشمسیہ ۹ رمضان ۱۲۸۲ھ کو وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا احمد الدین ابن نور حیات حنفی بگویؒ (پنجابی): آپ نے کتب درسیہ اپنے بھائی مولانا محی الدین بگویؒ اور دیگر علماء سے پڑھیں۔ بعدہٗ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے کتب حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ آپ بغرض تحصیل علم دہلی میں ۱۴ سال مقیم رہے اور بہت سے علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔

پھر پنجاب کو لوٹے اور وہاں درس وافادہ میں مشغول ہوئے۔ آپ سے بہت سے لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ آپ ذکر اور مراقبہ کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں سے ''حاشیہ شرح جامی اور حاشیہ خیالی'' ہے۔ ان کے علاوہ بھی اور تصنیفات ہیں جو عنقاء صفت ہوگئیں۔ ۱۳ر شوال ۱۲۸۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ کما فی حدائق الحنفیہ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا احمد اللہ ابن دلیل اللہ صدیقی انامیؒ: آپ نے دہلی جا کر حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ پھر درس وافادہ میں مشغول ہوئے۔

مولانا سخاوت علی جونپوریؒ اور مولانا کرامت علی جونپوریؒ جیسے علماء آپ کے شاگرد تھے۔ مائۃ مسائل آپ کی تالیف ہے جس میں آپ نے اپنے استاذ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی فقہی تحریرات جمع فرمائی ہیں۔ اس رسالہ کو ۱۲۴۵ھ میں مرتب کیا۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا تاج الدین ابن عارف علی حسینی نقوی سہسوانیؒ: آپ سہسوان ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی اور تحصیل علم کے لیے سفر کیا۔ مولانا بزرگ علی مارہروی اور دیگر علماء سے اخذ علم کر کے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث پڑھی۔ پھر بلاد عرب اور مصر و شام کا سفر کیا۔ حج و زیارت سے سرفراز ہوئے پھر ایک طویل مدت کے بعد اپنے شہر سہسوان واپس آئے اور اپنی تمام عمر افادہ و عبادت میں صرف کی۔ ۲۶ رشوال ۱۲۹۲ھ میں ۹۰ سال کی عمر پا کر سہسوان میں وفات پائی۔ کما فی حیات العلماء (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا حکیم رستم علی حنفی دہلویؒ: آپ دہلی کے باشندے تھے۔ علم ہیئت، علم ہندسہ اور علم طب میں بہت زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ آپ نے فنون ریاضیہ کو خواجہ فرید الدین دہلوی سے سیکھا۔ اور حدیث شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھی۔ آپ بہادر شاہ بادشاہ کے مقرب تھے۔ بادشاہ نے آپ کا لقب مصلح الدولہ حکیم رستم علی خاں رکھا تھا۔ کما فی آثار الصنادید (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مفتی رضی الدین خاں کاکورویؒ: آپ ۱۲۱۶ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے کتب درسیہ اپنے والد ماجد اور مولانا فضل اللہ عثمانی نیوتنوی سے پڑھیں۔ کتب حدیث اپنے والد کے چچا شیخ امین الدین محدثؒ[1] اور شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھیں۔ شیخ امین الدین سے بیعت بھی تھے۔ دہلی میں افتا کے عہدے پر فائز ہو کر اس کے بعد بسلسلہ

[1] آپ مشاہیر کاکوری میں سے ہیں۔ شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ کے خلیفہ و مجاز ہونے کا شرف آپ کو حاصل ہے۔ (فریدی)

ملازمت دوسرے شہروں میں منتقل ہوتے رہے۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ کو انتقال ہوا۔ کما فی مجمع العلماء (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

آپ کے بارے میں صاحب تذکرہ مشاہیر کاکوری تحریر کرتے ہیں:

مولوی محمد رضی الدین خاں ابن مولوی علیم الدین خاں ابن قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر ابن حضرت ملا حمید الدین محدثؒ یہ ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ انھوں نے اپنے والد ماجد اور مولوی فضل اللہ نیوتنوی اور مولانا محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھیں۔ احادیث کی سند بھی انھیں سے حاصل کی۔ آپ سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت مولانا حاجی امین الدین کاکورویؒ سے بیعت تھے۔ اولاً بہ عہدۂ افتاء وصدر امینی ضلع آگرہ میں مقرر ہوئے۔ پھر ایک مدت تک دہلی میں صدر امین رہے۔ پھر وہاں سے الہ آباد میں صدر الصدور ہو گئے۔ وہاں سے مختلف اضلاع میں تبدیل ہوتے رہے۔ غدر کے زمانہ میں بریلی سے وطن آئے۔ یہاں بعارضہ تپ محرقہ چند روز علیل رہ کر بتاریخ ۱۹ ماہ ربیع الآخر ۱۲۷۴ھ وفات پائی اور حظیرہ متصل چاند محل میں دفن ہوئے۔ ان کے بیٹے مولوی احسن الدین صاحب اولاً ۱۰، ۱۲ سال ملکہ گیتی زوجہ امجد علی شاہ بادشاہ کے یہاں معتمدین میں رہے۔ پھر حیدرآباد گئے، وہاں بھی معزز عہدے پر ملازم ہو گئے تھے۔ آپ بہت ذی ثروت ووجاہت گزرے ہیں۔ (تذکرہ مشاہیر کاکوری)

مولانا سراج احمد حسینی نقوی سہسوانیؒ: آپ سہسوان ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مفتی شرف الدین رامپوریؒ، مولانا تراب علی لکھنویؒ، مولانا محمد اسماعیل لندنی وغیرہم سے کتب درسیہ پڑھ کر دہلی کا سفر کیا۔ وہاں پر حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد لکھنؤ اور کاکوری میں عرصہ تک علمی خدمات انجام دیں۔ پھر سہسوان واپس ہو گئے اور گوشۂ تنہائی اختیار کیا۔ ''سراج الایمان'' آپ کی ایک تصنیف ہے جو کہ مولوی فضل رسول بدایونی کے جواب میں ہے۔ ۱۹ شوال ۱۲۸۹ھ میں

آپ کی وفات ہوئی۔ کمافی حیات العلماء (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا سید ظہور محمد محدث ابن خیرات علی ترمذی کالپویؒ: آپ ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ رسائل مختصرہ اپنے وطن کالپی کے اساتذہ سے پڑھے۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں مولانا ولی اللہ ابن حبیب اللہ اور شیخ حیدر ابن مبین سے پڑھا۔ نور الانوار، ہدایۃ الفقہ، شرح نخبۃ الفکر، رسالہ شیخ عبدالحق دہلوی در اصول حدیث، موطا امام مالک، بلوغ المرام، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے کچھ اجزا اور کل حصن حصین، یہ سب کتابیں مرزا حسن علی شافعی محدث لکھنویؒ سے پڑھیں اور مرزا حسن علی محدث لکھنوی نے آپ کو ان تمام کتابوں کی تحریری اجازت ۱۲۴۸ھ میں بمقام باندہ عنایت فرمادی تھی۔ پھر آپ دہلی گئے اور حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حاصل کی۔ ۱۲۵۰ھ میں آپ حجاز گئے حج و زیارت سے سرفراز ہوئے اور مدینہ منورہ میں ۱۴ ماہ قیام کیا۔ وہاں شیخ محمد عابد سندھیؒ سے بخاری اور مسلم پڑھ کر سند حدیث حاصل کی۔ پھر ہندوستان واپس آئے۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی اپنی کتاب ''تقصار'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے مولانا ظہور محمد سے کئی مرتبہ ملاقات کی ہے۔ وہ بہت باوقار اور نورانی چہرے والے تھے۔ ۲۲ رشعبان ۱۲۸۸ھ میں آپ نے وفات پائی۔ کمافی ضیائے محمدی (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

مولانا مفتی سعداللہ مرادآبادیؒ: مولانا مفتی محمد سعداللہ ابن نظام الدین مرادآبادی قوم شیخ کلال مرادآباد میں محلہ کسرول کے اندر مولسری والی مسجد کے عقب میں آپ کا مکان تھا۔ ۷ ارر جب ۱۲۱۹ھ کو مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کم سن تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ خانگی اختلاف کی وجہ سے گھر سے غائب ہوکر تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ شہروں شہروں پھر کر اور مسجدوں میں رہ کر علم حاصل کیا۔ پہلے رامپور میں فراش خانہ کے سامنے والی مسجد میں قیام رہا اور مولوی محمد نور خاں سے پڑھا۔ اس کے بعد نجیب آباد پہنچے اور مولوی عبدالرحمٰن قہستانی سے شرح جامی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ پھر دہلی پہنچے اس وقت حضرت شاہ

عبدالعزیز محدث دہلویؒ حیات تھے۔ان سے بھی علمی فیض حاصل کیا اور مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ، اخوند شیر محمد ولایتیؒ، مفتی صدرالدین خاںؒ صدر اعلیٰ سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں۔ بعدہٗ لکھنؤ گئے وہاں کے اساتذہ کے نام یہ ہیں: مولانا ظہوراللہ لکھنویؒ، مرزا محمد ہاشم علی محدث لکھنویؒ، ملا حسن لکھنویؒ، مولانا محمد اشرف لکھنویؒ، مرزا حسن علی محدث لکھنویؒ۔

آپ لکھنؤ سے مراد آباد آئے اور شادی کے بعد لکھنؤ کے مدرسہ شاہی میں مدرس ہوئے۔ پھر تاج اللغات ترجمہ قاموس کے دفتر میں ملازم ہوئے۔اس کے بعد ترقی کر کے مفتی کے عہدہ پر پہنچے۔آپ حج و زیارت سے بھی فیضیاب ہوئے۔''مکہ معظمہ'' میں شیخ جمال مکیؒ سے بھی سند حدیث حاصل کی۔

شیخ احمد علی شوق رامپوری ''تذکرہ کاملانِ رامپور'' میں آپ کا ذکر خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: فقیر نے اکثر رسائل آپ کے ہاتھ کے نقل کیے ہوئے دیکھے۔اس وقت کتابیں نایاب تھیں۔ جہاں جو کتاب ملی نقل کر لی۔ایک سو سے متجاوز آپ کی نقل کی ہوئی کتب اور رسائل ہوں گے۔سلطنت لکھنؤ کی خرابی کے بعد ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے پہلے نواب یوسف علی خاں نے جو کہ آپ کے شاگرد تھے آپ کو عہدۂ قضاء و افتاء پر مقرر کیا۔آخر تک اسی عہدہ پر مامور رہے۔آپ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند یہ ہیں:

مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجرؒ بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، ملا نواب مہاجرؒ، حکیم محمد ابراہیم لکھنویؒ، مولانا انور علی لکھنویؒ، مولانا شاہ عبدالحق کانپوریؒ، حکیم احمد سعید امروہیؒ افسر الاطباء حیدر آباد دکن، مولانا شبیر علی امروہیؒ، مولانا فریدالدین کاکورویؒ، مولانا مفتی دوست محمد ولایتیؒ مفتی رسایت ٹونک۔آپ نظم و نثر دونوں میں کامل تھے۔فارسی زبان میں آشفتہ تخلص تھا۔آپ کی تصانیف بہت زیادہ ہیں۔مولف تذکرہ کاملان رامپور نے ان کی تصانیفات میں سے جتنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ معلوم ہوئیں ان کی ایک مفصل فہرست دی ہے۔ان میں چند یہ ہیں:

فتاویٰ سعدیہ[1]، قول المانوس فی صفات القاموس عربی (مطبوعہ)، حاشیہ صدرا عربی (غیر مطبوعہ)، رسالہ عروض با قافیہ عربی (مطبوعہ)، شرح عروض با قافیہ (مطبوعہ)، زاد السبیل الی دار الخلیل[2] (اردو)، شرح سہ نثر ظہوری فارسی (غیر مطبوعہ)، رسالہ طہر متخلل (مطبوعہ)، حاشیہ مالابدہ فارسی (مطبوعہ)، رسالہ تجوید، درایت الاصول عربی (مطبوعہ)، نور الصباح فی اغلاط الصراح، خلاصۃ النوادر (تجوید)، نوادر البیان فی علوم قرآن، شرح ضابطہ تہذیب، میزان الافکار شرح معیار الاشعار، حاشیۂ شرح سلم، حاشیہ شرح چغمنی، غایۃ البیان فی تحقیق السبحان، القول الفصل فی ہمزۃ الوصل، مفید الطلاب فی خاصیاۃ الابواب، ترجمہ فقہ اکبر امام اعظم (مع متن ۱۲۵۶ھ میں طبع ہوا)، رسالہ درحالات امام اعظم، اشاعت الجمعہ بزبان فارسی، نوادر الوصول فی شرح الفصول (فارسی)۔ یہ پورا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۵۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کتاب لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں تصنیف کی تھی۔ چند اجزا چھپے تھے کہ سلطنت لکھنؤ میں انقلاب آ گیا۔ اس کے بعد یہ کتاب ۱۲۹۴ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں ۲۸۴ صفحات پر چھپی۔ آخر عمر میں رامپور کی ملازمت سے ترک تعلق کا ارادہ تھا۔ رئیسہ بھوپال نے عہدۂ قضا کے واسطے آپ کو طلب کیا۔ بھوپال جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ سفر آخرت کا وقت آ گیا۔ ۱۴ ر رمضان ۱۲۹۴ھ کو رامپور میں رحلت فرمائی اور شاہ بغدادی کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ مولوی لطف اللہ اور مولوی بشارت اللہ دو فرزند یادگار چھوڑے۔ مولوی بشارت اللہ کے صاحبزادے مولوی رشید اللہ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا اسعد اللہ[3] دامت برکاتہم ناظم مدرسہ مظاہر علوم ہیں۔ رامپور میں مفتی سعد اللہ

---

[1] حضرت مولانا اسعد اللہ ناظم مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) دامت برکاتہم سے زبانی استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی چار جلدیں تھیں اور صرف پہلی جلد طبع ہوئی ہے۔ احقر کے پاس یہ مطبوعہ نسخہ موجود ہے اور ایک قلمی فتاویٰ سعدیہ بھی دستیاب ہوا ہے جو غالباً دوسری جلد ہے۔ [2] یہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں تصنیف کی۔ اس میں مناسک حج اور مقامات متبرکہ کا ذکر ہے۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ میں چھپی ہے۔ (فریدی)

[3] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو حضرت مولانا اسعد اللہ ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور بقید حیات تھے۔ آپ کا وصال ۱۵ ر رجب ۱۳۹۹ھ موافق ۱۰ ر جون ۱۹۷۹ء میں ہوا اور سہارنپور میں تدفین ہوئی۔ (محب الحق)

کی اولاد جس محلہ میں آباد ہے اس کا نام آزاد بنگلہ ہے۔

مولانا عبدالعلی خاں رامپوری ریاضی داںؒ: آپ یوسف خاں ساکن محلہ راج دوارہ رامپور کے صاحبزادے تھے۔ رامپور میں پیدا ہوئے اور شروع میں مولوی حیدر علی ٹونکی سے کسب علوم کیا۔ اس کے بعد مفتی شرف الدین خاں، ملا عبدالرحیم خاں وغیرہما سے علوم حاصل کیے۔ پھر دہلی جا کر شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے حدیث کی تکمیل کی۔ حکیم صادق علی خاں سے طب پڑھی۔ نواب محمد سعید خاں والیٔ ریاست رامپور نے نواب محمد یوسف علی خاں کی تعلیم کے لیے آپ کو مقرر کیا تھا۔

مولانا عبدالعلی خاں کے شاگردوں میں مفتی عبدالقادر اور مولوی عبدالعزیز خاں کے علاوہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی بھی تھے۔ نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کو بھی آپ نے پڑھایا ہے۔ آپ مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس اول رہے۔ علاوہ مدرسہ کے مکان پر بھی کوئی وقت ریاضیات کے درس سے خالی نہ رہتا تھا۔ نہایت منکسر المزاج اور خلیق تھے۔ رسالہ قوشجیہ پر حاشیہ بزبان فارسی لکھا ہے جو طبع ہو گیا ہے۔ آپ کا انتقال ۱۳۰۳ھ میں ہوا اور محلہ راج دوارہ میں مولوی غلام جیلانی رفعت کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ کا قطعہ تاریخ وفات مولانا محمد سعید حیرت نے لکھا جو یہ ہے

دردا کہ کرد رحلت عبدالعلی مدرس ☆ بادا نزول رحمت صبح و مسا بخاکش

چوں سال انتقالش کردم طلب ز حیرت ☆ گفتا کہ رحمت حق بادا بروح پاکش

۱۳۰۳ھ

آپ کے کفن و دفن کے لیے نواب خلد آشیاں نے ایک سو روپیہ بھیجے تھے۔

(ماخوذ بحوالہ تذکرہ کاملان رامپور)

مولانا محمد فیاض رامپوریؒ: مولانا محمد فیاض اخوند سید احمد خاں کے صاحبزادے اور مولوی محمد حیات کے حقیقی بھائی تھے۔ آپ نے علوم دینیہ مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ

سے حاصل کیے۔رام پور کے محلہ لال مسجد میں رہتے تھے۔تخمیناً ۶۰ سال کی عمر میں ۱۲۸۸ھ
میں انتقال کیا اور محلّہ لال مسجد میں ہی دفن ہوئے۔(ماخوذ از تذکرہ کاملان رام پور)
مولانا مفتی صدرالدین دہلویؒ: مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ تحریر فرماتے ہیں:
الشیخ العالم الکبیر العلامة المفتی صدر الدین بن لطف الله الکشمیری ثم الدهلوی.

آپ ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔یہیں نشو ونما پائی۔تمام علوم عقلیہ مولانا فضل امام خیرآبادیؒ مؤلف ''مرقاۃ'' منطق سے پڑھے۔اور علوم نقلیہ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ سے حاصل کیے۔اثناء تحصیل علم میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے اور ان سے بھی استفادہ کرتے رہتے تھے۔جب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا وصال ہوگیا تو حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے بھی سند حدیث حاصل کی۔آپ دہلی میں مدت تک صدرالصدور کے عہدہ پر رہے۔آپ تمام علوم میں خصوصاً علوم ادبیہ میں یگانہ روزگار تھے۔جب آپ سے کسی فن سے متعلق کوئی سوال کیا جاتا تھا تو اس کا جواب سن کر معلوم ہوتا تھا کہ آپ اس فن میں منفرد ہیں۔معاصر علماء آپ کو علم کے لحاظ سے کامل و یکتا سمجھتے تھے۔شعراء آپ کو پرچم شعر وشاعری کا حامل سمجھتے[1] تھے اور امرا آپ کی محفل میں آمد و رفت رکھتے تھے۔آپ ۱۲۷۳ھ (ہنگامۂ ۱۸۵۷ء) تک نہایت رئیسانہ زندگی گزارتے تھے۔جب بغاوت شروع ہوئی اور بغاوت کے بعد انگریزوں کو دوبارہ غلبہ حاصل ہوا تو آپ پر بغاوت کی حمایت میں فتویٰ دینے کا الزام انگریزوں کی طرف سے عائد کیا گیا۔آپ کو گرفتار کرلیا گیا اور آپ کے مال واسباب کو لوٹ لیا گیا۔پھر کچھ دنوں کے بعد آپ کو چھوڑ دیا گیا اور آپ نے اپنے گھر کے اندر رہ کر اپنی توجہ درس و تدریس پر مرکوز کر دی۔ ۲۵ طلباء کو جو مدرسہ دارالبقاء متصل جامع مسجد میں پڑھتے تھے آپ وظیفہ دیتے تھے۔

---

[1] مفتی صاحبؒ اردو اور فارسی کے بہترین ادیب وشاعر تھے۔آزردہ تخلص تھا۔(فریدی)

آپ کی تصنیفات میں سے چند کتابیں یہ ہیں: (۱) منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال (۲) الدر المنضو د فی حکم امراۃ المفقو د (۳) مجموعہ فتاویٰ۔

آپ کا وصال ۱۲۸۵ھ میں دہلی میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ ۸۱ سال کی عمر پائی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ہفتم)

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے ''اتحاف النبلاء'' میں آپ کا ذکر خیر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں پر اس میں سے بھی چند باتیں ترجمہ کر کے لکھی جاتی ہیں۔

(۱) آپ (مفتی صدر الدین) امرا، علما، حکام اور رعایائے شہر کے نزدیک صاحب وجاہت وریاست تھے۔ سوائے بادشاہ دہلی کے، شہر دہلی اور نواحی دہلی کے اعیان واکابر اور رؤسا میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو آپ کے مکان پر حاضر نہ ہوتا تھا۔ طلباء اخذ علم کے واسطے اہل دنیا مشورۂ معاملات کے لیے، انشا پرداز اپنے مضامین کی اصلاح کی غرض سے اور شعراء مشاعرے کی تیاری کے سلسلے میں آپ کے پاس آتے تھے۔ اس زمانہ میں ان جیسا کوئی فاضل اس جمعیت، قوت حافظہ، حسن تحریر، متانت تقریر، فصاحت بیان، بلاغت معانی، مروّت اخلاق اور احسان کے لحاظ سے نہیں دیکھا گیا۔

(۲) باوجود اپنے مسلک میں سخت ہونے کے انصاف کو پسند کرتے تھے۔ بارہا ان کی زبان سے مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولانا محمد اسحاق دہلویؒ مہاجر مکہ کی تعریف وتوصیف سنی گئی۔

(۳) نواب صاحب نے حضرت شاہ عبد العزیزؒ کا ایک مکتوبِ گرامی بھی درج کیا ہے جو مولانا امین اللہ مہتمم مدرسہ کلکتہ کے نام ہے اور اس میں مفتی صدر الدین دہلویؒ کے لیے ملازمت کی سفارش کی گئی ہے۔ یہ پورا مکتوبِ گرامی بڑا دلچسپ اور قابل دید ہے اور اس میں شاہ صاحبؒ نے ایک جگہ جو تحریر فرمایا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ مفتی صدر الدین میرے شاگرد ہیں اور ان کے دادا (نام نہیں لکھا) میرے والد کے شاگرد تھے۔[1]

[1] نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے جو کہ مفتی صدر الدین آزردہ دہلویؒ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں مفتی صدر الدین کو شاہ محمد اسحاق صاحب کا شاگرد نہیں بتایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ.... جاری

(۴) آپ نے دو سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر وصال فرمایا۔ ظہور علی دہلوی نے فارسی زبان میں قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے جس کے آخری شعر سے تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ظاہر ہوتی ہے۔

چراغش ہست تاریخِ ولادت ☆ کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود

اسی قطعہ کے دو شعروں سے وفات کی تاریخ اور مہینہ ۲۴ ربیع الاول اور دن پنجشنبہ معلوم ہوتا ہے۔

میاں نذیر حسین صاحب محدثؒ: **الشیخ الامام العالم الکبیر المحدث العلامة نذیر حسین بن جواد علی بن عظمت اللہ بن اللہ بخش الحسینی البھاری ثم الدھلوی.**

آپ ۱۲۲۰ھ یا ۱۲۲۵ھ میں سورج گڑھ[۱] میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بچپن ہی میں بغرض تحصیل علم عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے۔ وہاں ۱۲۳۷ھ میں سید احمد شہیدؒ، مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئیؒ بڈھانویؒ کی زیارت[۲] کی۔ اس ملاقات کے بعد تحصیل

جاری..... کی وفات کے بعد مفتی صدرالدینؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی قرابت اور جانشینی کو پیش نظر رکھ کر بطور تبرک شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے سند حدیث حاصل کی ہوگی۔

۱۔ ابو یحییٰ نوشہروی کی کتاب تراجم علمائے اہل حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مولد موضع بلتھوا ہے جو کہ سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) سے ۵،۶ میل کی مسافت پر واقع ہے۔

۲۔ تراجم علمائے اہل حدیث میں لکھا ہے کہ میاں صاحب پٹنہ میں مولوی شاہ محمد حسین (خلیفہ مولوی ولایت) کی درسگاہ میں پہنچے اور یہاں انھوں نے مشکوٰۃ شریف اور ترجمہ قرآن پڑھا۔ حکیم عبدالحئی حسنیؒ نے کتاب دہلی اور اس کے اطراف میں لکھا ہے کہ میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے سید صاحبؒ کو دیکھا ہے؟ کہنے لگے ہاں دیکھا ہے۔ جب وہ سفر کلکتہ سے لوٹے تھے اس وقت میں نے ان کو پٹنہ میں دیکھا ہے۔ میں اس زمانہ میں یوسف زلیخا پڑھتا تھا۔ ابو یحییٰ نوشہروی اور حکیم عبدالحئی کے پٹنہ سے متعلق بیانات میں بہت فرق ہے۔ ابو یحییٰ صاحب نے بتایا ہے کہ وہ یہاں ۱۲۳۷ھ میں مشکوٰۃ شریف اور ترجمہ قرآن پڑھ رہے تھے اور حکیم عبدالحئی صاحب نے خود میاں صاحب کی زبانی نقل کیا ہے کہ وہ اس وقت پٹنہ میں یوسف زلیخا پڑھتے تھے۔ اس بارے میں حکیم صاحب کے بیان کو یقیناً ترجیح حاصل ہے۔ (فریدی)

علم کی طرف زیادہ رغبت ہوگئی۔ چنانچہ آپ الہ آباد پہنچے وہاں پر علمائے الہ آباد سے مختصرات کا درس حاصل کیا۔ پھر دہلی کا سفر کیا درمیان سفر میں کئی مقامات پر اقامت گزیں ہوئے پھر ۱۲۴۳ھ میں دہلی آئے۔ اکثر کتب درسیہ مولانا عبدالخالق دہلویؒ، مولانا اخوند شیر محمد قندھاریؒ اور مولانا جلال الدین ہرویؒ سے پڑھیں۔ اصول فقہ کو مولانا کرامت علی اسرائیلی مصنف سیرت احمدیہ سے پڑھا۔ مولانا محمد بخش دہلویؒ سے علم ہیئت اور علم حساب سیکھا۔ مولانا عبدالقادر رامپوریؒ سے علم ادب[1] حاصل کیا۔ ان علوم کی تحصیل سے پانچ سال میں فارغ ہو گئے پھر مولانا عبدالخالق دہلویؒ کی دختر سے آپ کا نکاح ہوا۔ اس کے بعد آپ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے ۱۲۵۸ھ میں دہلی سے ہجرت کرتے وقت آپ کو سند حدیث عطا[2] فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے درس، تذکیر اور افتاء میں اپنے اوقات کو صرف کیا۔ خصوصیت کے ساتھ فقہ اور اصول فقہ کا درس دیا۔ یہ سلسلہ ۱۲۷۰ھ تک جاری رہا۔ آپ کو فقہ حنفی میں ذوق عظیم حاصل تھا۔ اس کے بعد آپ پر حُبّ قرآن وحدیث کا غلبہ ہو گیا اور آپ نے فقہ حنفی کے علاوہ تمام دیگر علوم کو ترک کر کے قرآن وحدیث پر توجہ مرکوز کر دی۔

حکیم سید عبدالحئ حسنیؒ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں لکھتے ہیں کہ میں آپؒ کے دروس میں ۱۳۱۲ھ میں حاضر ہوا ہوں اور انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میاں نذیر حسین رات دن درس میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کثیر الصلوات اور کثیر التلاوت بھی تھے۔ خشوع اور گریہ وزاری بھی بہت تھی۔ جو شخص مخالف مسلک ہوتا اس کے حق میں شدید تھے۔

---

۱ تکملہ تذکرہ علمائے ہند مولفہ محمد ایوب قادری میں حکیم نیاز احمد سہسوانی کو بھی آپ کے اساتذہ میں لکھا گیا ہے

۲ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی، قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ کا بیان نقل کرتے ہوئے اس طرح لکھتے ہیں: جس روز شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوئے تو اس روز میاں نذیر حسین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اول کی ایک ایک حدیث پڑھی اور کل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ مقالات شروانی (فریدی)

طبیعت میں مزاح بھی تھا۔ متواضع اور حلیم تھے اور بڑی جرأت و ہمت والے تھے۔ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر طویل عطا کی اور ان کے علوم سے عرب و عجم کے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

آپ نے ۱۳۰۰ھ میں سفرِ حج و زیارت کیا۔ ہمارے شیخ حسین ابن محسن انصاری یمانی محدث ان سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی تعریف بھی کرتے تھے۔

آپ کی تصنیفات میں بہت سے رسائل تھے جن میں زیادہ مشہور ''معیار الحق'' ہے جو اردو میں ہے اس کے علاوہ فلاح الولی باتباع النبی (اردو) مجموعہ فتاویٰ (بزبان فارسی) رسالہ فی ابطال عمل المولد (بزبان عربی) وغیرہ رسائل بھی مشہور و معروف ہیں۔

آپ کے تلامذہ بڑی تعداد میں تھے کتاب ''حیات بعد الممات'' میں آپ کی سوانح حیات درج ہیں۔

آخر میں حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے شہر دہلی میں رہ کر کئی دن تک ان کی صحبت اٹھائی انھوں نے ۱۳۱۲ھ میں مجھے اپنے ہاتھ سے اجازت حدیث لکھ کر مرحمت فرمائی تھی۔ آپ کی وفات ۱۰ر رجب ۱۳۲۰ھ کو دہلی میں ہوئی۔

تراجم علمائے اہل حدیث میں ابو یحییٰ نوشہروی نے ص ۱۳۱ سے ۱۶۰ تک آپ کا ایک مبسوط تذکرہ کیا ہے۔ ان صفحات میں سے چند معلومات درج کی جاتی ہیں۔

(۱) میاں صاحب نے شوال ۱۲۵۸ھ کو حضرت شاہ محمد اسحاق محدثؒ دہلوی سے سند حدیث لی جبکہ وہ حجاز کو ہجرت کر رہے تھے۔ (ص ۱۳۲)

(۲) معیار الحق کی تردید میں مولانا ارشاد حسین مجددی رامپوریؒ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام انتصار الحق ہے۔ (ص ۱۴۸)

(۳) میاں صاحب مرحوم علمائے متقدمین کی بہت عزت کرتے تھے۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کو شیخ اکبر اور اکثر خاتم الولایۃ المحمدیہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ قاضی بشیر

الدین قنوجیؒ جو ابن عربی کے شدید ترین مخالف تھے اور کسی طرح ان کی بزرگی و برتری کو سننے کے لیے تیار نہ تھے، میاں صاحب سے صرف شیخ اکبر پر مناظرہ کرنے کے لیے دہلی تشریف لائے۔ دو ہفتے متواتر گفتگو جاری رہی مگر میاں صاحب نے شیخ اکبر کا احترام ہاتھ سے نہ دیا اور آخرکار قاضی صاحب بھی آپ سے متفق ہو گئے۔ اسی طرح علامہ شمس الحق دیانویؒ نے بھی کئی روز تک شیخ اکبر پر آپ کے ساتھ مناظرہ کیا اور دورانِ گفتگو میں ''فصوص الحکم'' پیش کرتے رہے۔ میاں صاحب نے پہلے تو اور طریقوں سے سمجھایا مگر جب دیکھا کہ آپ کسی طرح نہیں مانتے تو فرمایا کہ ''فتوحات مکیہ'' شیخ اکبر کی آخری تصنیف ہونے کی وجہ سے ان کی تمام کتابوں کی ناسخ ہے۔ یہ سن کر مولانا شمس الحق صاحب خاموش ہو گئے۔ (ص ۱۴۶)

(۴) آپ کا انتقال ۱۰؍رجب ۱۳۲۰ھ بروز دوشنبہ (۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۲ء) کو بعد نماز مغرب ہوا۔ دوسرے روز صبح ۹ بجے جنازہ اُٹھا ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہمراہ تھا جس میں شہر کے تمام اہل علم، صوفیا اور عمائدین شامل تھے۔ آپ کے پوتے مولوی عبدالسلام نے عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھائی اور شیدی پورہ کے قبرستان میں اپنے صاحبزادے مولوی شریف حسین کے پاس مدفون ہوئے۔ آپ کی وفات کی بہت سی تاریخیں نکالی گئیں ان میں سے دو یہ ہیں: (۱) بجھ گیا اب چراغ دہلی کا (۲) رفت اے وائے محدث دہلوی ۱۳۲۰ھ

شاہ عبدالغنی صدیقی مہمیؒ: ''مآثر الاجداد'' مؤلفہ و مرتبہ پروفیسر منظور الحق صدیقی مطبوعہ لاہور میں ص ۱۲۳ سے ۱۲۶ تک آپ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ ان ہی صفحات کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ آپ شاہ محمد اسماعیل صدیقی شہید مہمیؒ[1] کے سات بیٹوں میں سے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۲۲۸ھ میں پیدا ہوئے تاریخی نام ذوالفقار علی ہے۔ آپ نے

---

[1] آپ کو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے پھانسی دی تھی۔ روزنامہ الجمعیۃ دہلی بابت ۱۹۵۷ء میں احقر نے آپ کے کچھ حالات شائع کرائے ہیں۔ (فریدی)

منجملہ بہت سے اساتذہ کے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجرؒ سے بھی فیض علم حاصل کیا۔ شاہ احمد سعید مجددی دہلوی مہاجرؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجرؒ اور شاہ اللہ بخش تونسویؒ سے آپ کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔ آپ شاہ محمد غوثؒ[1] گنگوہیؒ ابن شاہ عبدالکریم چشتی نبیرۂ شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ زہد و اتقاء، صبر و شکر، حلم و میانہ روی، علم و فضیلت جیسے اخلاق درویشانہ کے حامل تھے۔ جے پور، جاورہ، دوجانہ اور فرخ نگر کے والی اور حاکم آپ کے معتقدین میں سے تھے۔ آپ کے تعمیری کاموں میں مہم کے مدرسہ رمضانیہ کا قیام بھی تھا۔ آپ کے بہت سے خلفاء تھے جن سے تشنگان معرفت کو بہت کچھ فیض پہنچا۔

آپ کا انتقال ۲۶ ر رجب ۱۳۰۸ھ کو بمقام دوجانہ ہوا۔ اپنے خسر اور تایا شاہ محمد رمضانؒ[2] ہادیٔ ہریانہ کی خانقاہ واقع مہم میں دفن ہوئے۔ رشید الرحمٰن صاحب نے آپ کا قطعہ تاریخ وفات اس طرح کہا:

شمع بزمِ معرفت حضرت شہ عبدالغنی ☆ رونہادہ از قضائے ایزدی سوئے عدم
روشنی نورِ عرفاں گشت پنہاں از نظر ☆ خاک برسر ریخت ہر اہل ارادت از الم
زانکہ پرسیدند ہر یک سال ترحیل از رشید ☆ او پئے تفہیم گفتہ بلبل باغِ ارم
۱۳۰۸ھ

مولانا سبحان بخش شکار پوریؒ: آپ شکار پور ضلع مظفرنگر کے باشندے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن کتب حدیث کا درس حضرت شاہ محمد

---

[1] شاہ محمد غوث گنگوہیؒ شاہ محمد رمضان شہید مہمیؒ (ہادیٔ ہریانہ) کے خلیفۂ مجاز تھے۔ مآثر الاجداد ص ۱۲۴

[2] آپ شاہ عبدالعظیم صدیقی مہمیؒ کے صاحبزادے اور شاہ محمد اسماعیل صدیقی شہیدؒ کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کے نام سے آپ کی تاریخ ولادت (۱۱۸۳ھ) نکلتی ہے۔ آپ بسلسلہ تعلیم دہلی میں ۱۴ سال تک رہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے پورا پورا استفادہ کیا۔ تذکیر و تبلیغ میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ ہادیٔ ہریانہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ۲۸ ر جمادی الاول ۱۲۴۰ھ میں مخالف مسلک بوہروں کے ہاتھوں مندسور میں شہید ہوئے۔ مہم ضلع رہتک میں مزار ہے۔ (ماخوذ از مآثر الاجداد) فریدی

اسحاق محدث دہلویؒ سے لیا۔ جمادی الاخر ۱۲۵۰ھ (۱۵/اکتوبر ۱۸۳۴ء) کو دہلی کالج میں عربی کے مدرس دوم مقرر ہوئے اور تمام زندگی اسی عہدے پر بسر کی۔

اپنی کتاب ''محاورات ہند'' میں لکھتے ہیں: بندۂ ہیچ میرز سبحان بخش ساکن شکار پور ضلع مظفر نگر کہ غدر سے پہلے کالج دہلی میں مدرس دوم عربی اور بعد غدر پھر کالج دہلی میں مدرس عربی فارسی وار دو تھا اور اب پنشن دار ہے۔

مولانا محمد احسن نانوتویؒ کو ان سے اجازت ''حصن حصین'' حاصل تھی جس کا ذکر مولانا محمد احسن نانوتویؒ نے ''خیر متین'' میں کیا ہے۔ اس میں مولانا سبحان بخشؒ کے شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کا تلمیذ ہونے کی تصریح ہے: آپ نے دہلی کالج کی طرف سے متعدد کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان کے علاوہ آپ کی اور کئی تالیفات بھی ہیں جن میں تذکرۃ الحکماء، تذکرۃ المفسرین اور ترجمہ تاریخ ابن خلکان کا ذکر گارسان وتاسی نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔ (خطبات اشاعت اول ص ۱۰۹، ۱۷۲)

ڈاکٹر عبدالحق نے ان کی تالیفات میں ترجمہ تزک تیموری کو بھی بتایا ہے۔ (مرحوم دلی کالج ص ۱۶۱ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء)

محاورات ہند مولانا سبحان بخش کی مشہور تالیف ہے جو ۱۳۰۲ھ میں مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا ہے۔ آپ نے کتاب منہبات کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو مطبع مجتبائی سے ۱۲۸۸ھ میں شائع ہوا۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ ترمذی شریف کی دوسری اشاعت کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی ہے۔ ترمذی شریف کے شروع میں فرماتے ہیں:

يَقُوْلُ الْعَبْدُ الضَّعِيْفُ الرَّاجِىْ اِلىٰ رَحْمَةِ رَبِّ الْعَرْشِ سُبْحَانْ بَخْشْ السَّاعِىْ فِىْ انْطِبَاعِ هٰذَا الْكِتَابِ الْمُسْتَطَابِ ثَانِياً وَ تَصْحِيْحِهٖ وَ مُقَابَلَتِهٖ بِالطَّبْعِ الاَوَّلِ:

اِنِّی سَمِعْتُ اَکْثَرَ هٰذَا الْکِتَابِ مِنَ الشَّیْخِ الْمُکَرَّمِ الْمُضَخَّمِ الْمُشْتَهِرِ بَیْنَ الْآفَاقِ الْمَرْحُوْمِ الْمَغْفُوْرِ مولانا محمد اسحاق وَ اَجَازَنِیْ بِهٖ الخ.....

اس کی طباعت شوال ۱۲۶۹ھ میں شروع ہو کر ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ میں مکمل ہوئی اور مطبع فخر المطابع دہلی سے حافظ نیاز احمد کیرانویؒ کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

مولانا سبحان بخشؒ کے مفصل حالات و تالیفات اور سنہ وفات کا اس سے زیادہ پتہ نہیں چل سکا۔

مولانا عبدالرزاق باغپتیؒ: مولانا عبدالرزاق باغپتیؒ نے ''ملتقی الابحر'' کی تصحیح کی اور اس پر حاشیہ لکھا جو فخر المطابع دہلی سے باہتمام حافظ عبداللہ کیرانویؒ شائع ہوا۔ اس کے آخر میں آپ کا شاگرد شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی ہونا بیان کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے حالات نہیں ملے۔

حضرت حاجی حکیم مولانا محمد طاہر ابن شیخ پیر محمدؒ: ۱۲۲۴ھ میں پورہ معروف (ضلع اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے (پورہ معروف مئو سے بجانب شمال مغرب ۵،۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اب مئو ہی اس کا صدر مقام ہے)

ابتدائی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کی، اس کے بعد جونپور جا کر ہادیٔ بنگال حضرت مولانا کرامت علی جونپوریؒ (المتوفی ۱۲۹۰ھ) سے حفظ و قرأت کی تحصیل کی اور

۱ اس تحریر سے بھی مولانا سبحان بخشؒ کا تلمیذ حضرت شاہ محمد اسحاق ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ (فریدی)

۲ مولانا باغ پتیؒ پر کاروانِ اہل فضل و کمال کا تذکرہ مکمل ہو چکا تھا جس کا ذکر مولانا فریدیؒ نے مولانا باغ پتیؒ کے تذکرہ کے بعد کر دیا تھا۔ احقر تذکرہ علماء اعظم گڑھ مؤلفہ مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری حال ایڈیٹر ماہنامہ دار العلوم حاصل کر کے لایا تو مولانا فریدیؒ نے فہرست مضامین سن کر فرمایا کہ مولانا محمد طاہر کے حالات پڑھو۔ مولانا محمد طاہرؒ نے ۱۲۵۸ھ میں ''حرمین شریفین'' کا مقدس سفر کیا اور وہاں شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ سے حدیث کی تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ مولانا طاہرؒ کے حالات کو سن کر مولانا فریدیؒ کے چہرے پر خوشی و انبساط کے آثار نمایاں ہوئے اور اس حقیر کو بہت ہی دعائیں دیں۔ (محب الحق)

ساتھ ہی مولانا کرامت علی جونپوریؒ سے فن کتابت وخطاطی اور بنوٹ سیکھا۔ مولانا کرامت علی جونپوریؒ فن خطاطی اور بنوٹ میں یگانہ روزگار تھے۔ چنانچہ آگے چل کر مولانا معروفیؒ بھی ان فنون میں نادرہ روزگار ہوکر اطراف و جوانب میں مشہور ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ عربی تعلیم کی جانب بھی متوجہ رہے اور اس وقت کے شہرہ آفاق عالم حضرت مولانا سخاوت علی جونپوریؒ[۱] (متوفی ۱۲۷۴ھ) سے فنون متداولہ کی تعلیم پائی۔ حضرت مولانا سخاوت علیؒ آپ کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر بڑے اہتمام اور محنت و شفقت سے پڑھاتے تھے۔ مولانا معروفیؒ نے یہیں درس نظامیہ کے اکثر حصہ کی تحصیل کی اور بقیہ کتابیں مدرسہ غفاریہ رسڑا ضلع بلیا میں مولانا تراب علی لکھنویؒ (متوفی ۱۲۸۱ھ) سے پڑھ کر فراغت حاصل کی۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت[۲] کے بعد ۱۲۵۸ھ میں ''حرمین شریفین'' کا مقدس سفر فرمایا اور وہاں رہ کر علمی و روحانی فیوض سے اپنے دامن مراد کو بھرا اور جمادی الاولی ۱۲۶۰ھ میں وطن مالوف کی جانب مراجعت فرمائی۔ اس مبارک سفر میں انھوں نے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ سے مکہ معظمہ میں حدیث کی تحصیل کی اور سند و اجازت حاصل کی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے اس موقع پر مولانا معروفیؒ کو مندرجہ سند عطا فرمائی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین و الصلاۃ علی سیدالمرسلین محمدٍ و آلہ و صحبہٖ اجمعین، اما بعد! فَیَقُوْلُ خَادِمُ عُلَمَاءِ الآفاقِ محمد اسحاق عفااللہ عنہ و تَجَاوَزَ عَنِ السَّیِّاٰتِ: اِنَّ المولوی محمد ظاھر – طَھَّرَہُ اللہُ فِی الْبَاطِنِ وَالظَّاھِرِ – قَدْ قَرَأَ عَلَیَّ الْاَحَادِیْثَ النَّبَوِیَّۃَ – عَلٰی صَاحِبِھا اَلْفُ اَلْفُ تَحِیَّۃٍ وَّ

[۱] نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں مولانا سخاوت علی کا سال وفات ۱۲۶۴ھ لکھا ہے۔ تذکرہ علمائے ہند میں سال وفات ۱۲۷۴ھ ہی ہے۔

[۲] اسی سال حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے دہلی سے ''مکہ معظمہ'' کو ہجرت فرمائی تھی۔ (فریدی)

صَلاةٍ زَكِيَّةٍ- فَعَلَيْهِ اَنْ يَّشْتَغِلَ بِقِرَاءَةِ عِلْمِ الْاَحَادِيْثِ وَ تَعْلِيْمِهٖ، بِشُرُوْطِهِ الْمُعْتَبَرَةِ عِنْدَاَهْلِهٖ، وَ اُوْصِيْ لَهٗ بِتَقْوَى اللهِ وَ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ، وَ اَنْ يُّدَاوِمَ عَلٰى طَاعَةِ اللهِ وَ ذِكْرِهٖ فِي الْخَلَوَاتِ وَالْجَلَوَاتِ، وَ اَنْ يَّجْتَنِبَ عَنِ الْمَعَاصِيْ وَالْبِدْعَاتِ وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

حَرَّرَهٗ فِي الثَّانِيْ مِنْ شَهْرِ جُمَادَى الْاُوْلٰى سَنَةَ سِتِّيْنَ بَعْدَ الْاَلْفِ وَالْمِأَتَيْنِ.

(ترجمہ) : بسم الله الرحمن الرحیم

الحمدلله رب العالمین و الصلاة علی سیدالمرسلین محمدٍ و آله و صحبه اجمعین، اما بعد !

خادم علمائے آفاق محمد اسحاق عفا اللہ عنہ کہتا ہے کہ مولوی محمد طاہر (معروفی) نے اللہ تعالیٰ ان کے باطن اور ظاہر دونوں کو پاک و صاف کرے........احادیث نبویہ علی صاحبها الف الف تحیة و صلاة زکیة مجھے سنائیں۔ پس ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اُن شروط کے ساتھ جو عندالمحدثین معتبر ہیں قراۃ علم احادیث اور تعلیم احادیث کا شغل رکھیں۔ میں ان کو تقوی اللہ، پابندیٔ سنت رسولُ اللہ اور دوام طاعت و ذکرُ اللہ کی وصیت کرتا ہوں۔ خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی۔ اور اس بات کی بھی وصیت کرتا ہوں کہ وہ معاصی اور بدعات سے اجتناب اور پرہیز کریں۔ و آخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین .

تحریر بتاریخ ۲؍جمادی الاولی ۱۲۶۰ھ

آپ نے ''حرمین شریفین'' سے واپسی کے بعد اپنے ابائی وطن کو اپنی دینی و علمی خدمات کا مرکز بنایا اور تقریباً نصف صدی تک درس کلام اللہ اور دینی تعلیمات میں سرگرم عمل رہے۔ ساتھ ہی اہل بستی کی عمومی اصلاح کی غرض سے ہر جمعہ کو وعظ فرماتے۔ جس میں بدعات اور غلط رسم و رواج کی برائیاں موثر انداز میں بیان کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے اصلاحی وعظوں کا یہ اثر ہوا کہ پورہ معروف میں اب تک بدعات کا نام و نشان نہیں ہے۔

مولانا معروفیؒ کو قرآن حکیم سے اس درجہ شغف تھا کہ طلباء کو قرآن خود پڑھاتے اور ایک پارہ کی روزانہ کتابت کرتے تھے۔ مولانا فن کتابت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کے دست خاص کے لکھے ہوئے قرآن حکیم کے چند نسخے اور بخاری، مسلم، موطا امام مالک، الجامع الصغیر، مشکاۃ، مسند امام اعظمؒ، مجالس الابرار، حصن حصین، مواہب الحکم کے نسخے اب بھی موجود ہیں۔ سہ رنگ و ہفت رنگ کے بیل بوٹے بھی بہت خوب بناتے تھے جو آج بھی اسی چمک دمک کے ساتھ آپ کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا علم ظاہر کے ساتھ سلوک و طریقت میں بھی اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور حضرت مولانا کرامت علی جونپوریؒ کے مجاز تھے۔ راتوں کو بہت کم سوتے تھے۔ رات کے پچھلے پہر بستر سے الگ ہو جاتے اور نماز تہجد کے بعد قرآن کریم کی تلاوت میں منہمک ہو جاتے۔

دس پاروں کی تلاوت نہایت انشراح و انبساط سے کرتے۔ بعد ازاں نماز فجر با جماعت ادا فرماتے اور پھر اوراد و ظائف میں مشغول ہو جاتے۔

چونکہ آپ ایک ماہر طبیب بھی تھے۔ اس لیے اوراد و ظائف سے فارغ ہو کر مریضوں کو دیکھتے اور نسخہ لکھتے تھے۔ غریب اور نادار مریضوں کو دوائیں مفت دیتے تھے۔ ان جملہ امور کے بعد زائرین و متوسلین سے ملتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ مولانا علمی و روحانی کمال کے علاوہ جسمانی طاقت میں بھی نادرہ روزگار تھے اور اس سلسلے میں ان کے ایسے ایسے واقعات مشہور ہیں جن کو لوگ مشکل سے باور کریں گے۔ پہلوان ہونے کی بنا

پر روزانہ ورزش کا بھی معمول تھا۔

مولانا محمد طاہرؒ مقامی اصلاح کے ساتھ حسب موقع اطراف و جوانب کا بھی اصلاح وتربیت کے سلسلے میں دورہ فرماتے تھے، جس سے خلق خدا کو بہت نفع پہنچتا تھا۔

۲۴ / ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو ۲۷ سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوا۔ اسی دن اپنے آبائی مقبرے متصل محلّہ بلوہ میں بجانب مشرق املی کے درخت کے زیر سایہ دفن کیے گئے۔

آپ کے جنازہ میں اتنا بڑا اجتماع تھا کہ پورہ معروف میں شاید ہی کسی کے جنازہ میں اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو۔ مرورِ ایام کی وجہ سے آپ کی قبر کا نشان اب موجود نہیں ہے۔

آپ کا مادہ تاریخ وفات ''حافظ محمد طاہر'' ہے۔ آپ کے مزید اور مفصل حالات کے لیے حیات طاہر کا مطالعہ کیا جائے۔ (ماخوذ از تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۲۸۳، ۲۸۶)

الحمدللہ کاروان اہل فضل و کمال منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ تلامذہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجرؒ کا تذکرہ اوران کے حالات جس جس کتاب سے مل سکے ان کو قسطوار ہدیہ ناظرین کیا گیا۔ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی سلمہ نے اس سلسلے میں بہت مدد دی۔ اگر وہ تلاش وجستجو کے بعد حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے تلامذہ کی فہرست ارسال نہ کرتے تو شاید میں چند نامور شخصیات پر ہی اکتفاء کرتا۔ مولانا راشد سلمہ نے مولانا سبحان بخش شکارپوری اور مولانا عبدالرزاق باغ پتی کے مختصر حالات تحریر کر کے بھیجے۔

میں نے اس سلسلے میں جن کتابوں سے فائدہ اُٹھایا وہ یہ ہیں:

نزہۃ الخواطر (جلد ۷، ۸) الروضۃ الممطورہ مؤلفہ مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی، تذکرہ علمائے ہند مترجمہ محمد ایوب قادری، تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرہ رحمانیہ مؤلفہ قاری محمد عبدالحلیم انصاری پانی پتی، تذکرہ کاملان رام پور مؤلفہ احمد علی شوق رام پوری، مقالات طریقت مؤلفہ محمد عبدالرحیم ضیاء، تاریخ مظاہر جلد اول مؤلفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم، سرگزشت مجاہدین مؤلفہ غلام رسول مہر، تذکرہ مولانا فضل

رحمٰن گنج مرادآبادی مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی زید مجدہم[1]، تذکرہ مشاہیر کاکوری مؤلفہ مولانا حافظ محمد علی حیدر علوی کاکوروی، اتحاف النبلاء مؤلفہ نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی، تراجم علمائے اہل حدیث مؤلفہ ابویحییٰ نوشہروی، حالات مشائخ کاندھلہ مؤلفہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، تذکرۃ الکرام مؤلفہ محمود احمد عباسی امروہی، دہلی اور اس کے اطراف مؤلفہ حکیم سید عبدالحیؒ حسنی رائے بریلوی، ماثر الاجداد مؤلفہ ومرتبہ پروفیسر منظور الحق صدیقی لاہور، مزارات اولیائے دہلی مؤلفہ شاہ عالم فریدی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی، تذکرہ علمائے اعظم گڑھ مؤلفہ مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری۔

---

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بقید حیات تھے آپ کا وصال ۲۲؍رمضان ۱۴۲۰ھ موافق ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء میں ہوا اور دائرہ تکیہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی ابدی آرام گاہ بنی۔ (محب الحق)

مقالہ (۵)[1]

شاگردِ نظام رامپوری[2]

ابوالحسن ساکتؔ امروہوی اور ان کا کلام

تاجور اقلیم فصاحت و بلاغت حضرت ابوالحسن ساکتؔ امروہوی مولوی حکیم عبدالصمد صاحب طبیب خاص ''مہارانا اُودے پور'' کے صاحبزادے اور ہندوستان کے بہترین اہل قلم اور مشہور محقق و مفکر حکیم محمد حسن صاحب چشتی نظامی (صاحب تفسیر شاہی و مقدمہ غایۃ البرہان) کے بھتیجے تھے۔ حکیم عبدالصمد صاحب مرحوم حکیم محمد حسن صاحب نظامی مغفور کے بڑے بھائی تھے۔ انھوں نے حافظ سید غلام نبی رامپوری اور مولوی جلال الدین رامپوری سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ حکیم امام الدین خاں دہلوی سے طب پڑھی اور مہارانا اُودے پور کے یہاں خصوصی طبیب کی حیثیت سے رہے۔ حکیم محمد حسن صاحب خود اپنے خاندانی شجرے میں (جو رسالہ شجرہ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے) تحریر فرماتے ہیں:

> ''سید کرامت علی مرحوم کے ایک (فرزند) مولوی سید عبدالصمد طبیب خاص مہارانا اودے پور، دوسرے محمد حسن (خود) ہیں اور سید عبدالصمد کے فرزند سید ابوالحسن متخلص بہ ساکتؔ تھے۔ شاعر، واقف فنون و علوم شاعری ہیں (رسالہ شجرہ قلمی)۔''

مولانا آل حسن نخشبی مؤلف نخبۃ التواریخ حکیم محمد حسن اور حکیم عبدالصمد صاحب

---

[1] یہ مقالہ مہر نمروز کراچی اور رضا لائبریری رامپور کے جرنل سے لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ پہلے مہر نمروز کراچی میں شائع ہوا تھا بعدہٗ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مرحوم نے کچھ اضافہ کر کے جرنل رضا لائبریری رامپور سے شائع کرایا۔

[2] سید نظام شاہ نظام رامپوری شیخ علی بخش بیمارؔ رامپوری کے شاگرد تھے اور ساکتؔ امروہوی نے بھی بیمارؔ سے اصلاح لی۔ (بحوالہ دیوان شیخ علی بخش بیمارؔ، مؤلفہ عصمت پروین) (محبّ الحق)

دونوں بھائیوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''پسرش (پسر حکیم عبدالصمد) سید ابوالحسن ساکتؔ امروہوی ناطقۂ زکیّہ ودرّاکۂ قویّہ میدارد واستعارہ وکنایہ وہم درصنائع وبدائع شعریہ علماً وعملاً بے بدل است واستاد اکثر شعرائے باامتیاز است ومحاورہ پاکیزۂ شعراء دہلی می دارد ودر التزام معاملہ بندی درشعر گوئی ہمتائے ندارد۔'' (نخبۃ التواریخ)

لالہ سری رام دہلوی خمخانۂ جاوید میں ان الفاظ کے ساتھ ساکتؔ کے حالات شروع کرتے ہیں:

''ماہر رموز سخن دانی، واقف اسرار نکتہ دانی مولوی ابوالحسن صاحب ساکن امروہہ ضلع مرادآباد[1]، امروہہ کے قدیم شرفاء میں تھے۔ آپ عربی، فارسی دونوں میں دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی اساتذۂ رامپور اور اپنے عم حکیم محمد حسن مرحوم سے حاصل کی تھی۔ معانی، بیان، عروض وقوافی مین کامل تھے۔ حافظے کی یہ حالت تھی کہ کوئی مضمون ہو عرصے تک سلسلے کلام کو جاری رکھتے تھے اور ہر مسئلہ کے متعلق بیسیوں مثالیں نوکِ زبان تھیں۔ اُن کی پھڑکتی ہوئی تقریر زندہ دلی اور ظرافت کی جان ہوتی تھیں۔ دوست نواز اور وضع داری میں فرد تھے۔'' (خمخانہ جاوید جلد چہارم ردیف س صفحہ ۳۴)

تفصیل سے معلوم نہ ہوسکا کہ رامپور میں کس کس سے درسی تعلیم حاصل کی۔ اتنا معلوم ہوسکا کہ مولانا جمال رامپوری ان کے ایک استاذ کا نام ہے۔ مگر تذکرہ کاملان رامپور میں اس نام کے کئی حضرات ہیں جو تعلیم وتدریس کا مشغلہ رکھتے تھے۔ پتا نہیں ان میں سے

---

[1] جب لالہ سری رام دہلوی نے خمخانۂ جاوید لکھی تھی تو اس وقت امروہہ کا صدر مقام مرادآباد تھا۔ اب امروہہ خود صدر مقام ہے۔ (محبّ الحق)

کون سے مولانا جمال ساکتؔ کے درسی استاذ ہیں۔ ساکتؔ صاحب فن شعر میں حضرت نظام رامپوری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نظامؔ معاملہ بندی میں بے نظیر و بے عدیل تھے۔ یہ دو شعر ان کے بہت مشہور ہیں:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ ☆ دیکھا مجھے تو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

انداز اپنا آئینے میں دیکھتے ہیں وہ ☆ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

نظامؔ کے چند اشعار اور پڑھ لیجیے جو مجھے استاذ محترم منشی عبدالرب صاحب شکیبؔ[1] امروہوی کے سنائے ہوئے یاد رہ گئے ہیں:

الٰہی قاصدا بھی نہ آئے کہ اک توقع تو لگ رہی ہے
کیا جو انکار صاف اس نے تو دل کی تسکیں کو کیا کریں گے

جاتا ہوں اس کی بزم سے میں اس طرح نظامؔ
مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہوں کوئی اب پکار لے

فکر ایذا تمہیں اُمید ترحّم مجھ کو ☆ میں تمہیں دیکھتا ہوں دیکھتے ہو تم مجھ کو

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بُت ہمیں نظامؔ
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

''نگار'' کا نظام نمبر نکل چکا ہے وہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے ورنہ اس میں سے چند اشعار اور انتخاب کر کے لکھتا۔ ہمارے ساکتؔ کے کلام میں اپنے استاذ کا پورا پورا رنگ جھلکتا ہے۔ میں نے اپنے ایک شعر میں ساکتؔ و نظامؔ کے متعلق لکھا ہے:

فریدی ساکتِ مرحوم خوب شاعر تھے ☆ شہِ معاملہ بندی تھے وہ نظام کے بعد

ساکتؔ کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لالہ سری رام دہلوی تحریر

---

[1] منشی عبدالرب صاحب شکیب ولد شبیر علی صدیقی محلہ چاہ غوری شیش محل امروہہ کے رہنے والے اپنے وقت کے ماہر فارسی تھے۔ نورالمدارس امروہہ میں فارسی کے مدرس تھے۔ وہیں مولانا فریدیؒ نے ان سے فارسی پڑھی تھی۔ شاعری میں ابوالحسن ساکت سے تلمذ تھا۔ ۲۶ رمئی ۱۹۰[illegible]ء میں انتقال ہوا۔ (محب الحق)

کرتے ہیں:

''استاد کا انداز بیان اختیار کرنے میں ان کو کامیابی حاصل تھی۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ کے انقلاب سے ہمیشہ زاویہ گمنامی میں رہے اور کلام کی شہرت نہ ہوئی۔ مرحوم غزل گوئی میں یکتا تھے۔ حسن و عشق کی گھاتوں کو نہایت خوبی سے نظم کرتے۔ ادائے بیان بے تکلفانہ تھی، دلی واردات کو تخیل کا جامہ پہناتے ہوئے مضمون کو ہاتھ سے نہ کھوتے۔''

ساکت کا حلیہ اور لباس:۔ خوبصورت چہرہ، معتدل ورزشی جسم، سینہ چوڑا، داڑھی ٹھوڑی سے کھلی ہوئی، سارے سر پر بال، مانگ نکلی ہوئی، رامپور کی زری کی ٹوپی، پاؤں میں دہلی کا کامدار جوتا، آڑھا پاجامہ، بائیں ہاتھ میں بانڈی، پان بہت کھاتے تھے، ہر وقت منھ رچا رہتا تھا، لبوں پر مسکراہٹ رہتی، ململ کا خفیف سا رنگ دیا ہوا کرتا، اس پر بندھوں کا انگرکھا۔ بہ قول بیدار صاحب سجیلے اور خوش وضع آدمی تھے۔ بنوٹ اور لکڑی کے ماہر تھے۔ استاد کرار حسین امروہوی کے اس فن میں شاگرد تھے۔

ساکت کی نشست گاہ: محلہ کوٹ میں حکیم حکمت اللہ صاحب صدیقی مرحوم کے مکان کے قریب ایک دیوان خانہ میں (جس کی شکل اب مرور ایام سے کچھ کی کچھ ہو گئی ہے) ساکت صاحب کی نشست رہتی تھی۔ وہاں ہر قسم کا مجمع رہتا تھا اور جلسہ ہائے عیش و نشاط منعقد رہتے۔ حکیم حکمت اللہ صاحب مرحوم آپ کے ماموں اور محبّ علی خاں صاحب مؤلف آئینہ عباسی آپ کے خالو تھے۔ ان دونوں بزرگوں کا بہت احترام فرماتے تھے اور اس امر کی انتہائی کوشش کرتے تھے کہ بزرگوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ مل سکے۔

ساکت صاحب کی آزاد مزاجی اور وضعداری:۔ باوجود علم و فضل رندی و آزادی کی طرف میلان تھا مگر بقول حالی مرحوم

بے ریائی تھی زُہد کے بدلے ☆ زُہد اس کا مگر شعار نہ تھا

عجیب کمال کی بات ہے اپنے علم وفضل کی وجہ سے ''مولوی'' کہلاتے تھے اور ''قبلۂ رندان روہیلکھنڈ'' بنے ہوئے تھے۔ دلؔ شاہجہانپوری نے شاید ایسے ہی کسی صاحب کے متعلق کہا ہے ؎

اک رند ابھی اے دل کہتا ہوا گزرا ہے ☆ صد زُہد بیک جرعۂ نذرِ مے و میخانہ

اصغرؔ گونڈوی کسی وقت اس مقام سے گزرتے ہیں تو چیخ اٹھتے ہیں ؎

صنم خانہ میں کیا دیکھا کہ جا کر کھو گیا اصغرؔ ☆ حرم میں کاش رہ جاتا تو ظالم شیخِ دیں ہوتا

ساکتؔ صاحب کے چچا حکیم محمد حسن صاحب (جو کہ ایک زبردست صوفی اور عالم تھے) اس رندانہ زندگی پر بہت کڑھتے اور ناراض رہتے تھے۔ ایک دن چچا نے بھتیجے سے کہا کہ: ''تو نے باوجود قابلیت کے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے۔'' ماتھے پر ہاتھ مار کر بولے ''تقدیر ہی یوں ہے چچا میں کیا کروں۔'' حکیم صاحب خاموش ہو گئے۔

در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند ☆ گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

حافظ بخود نپوشید ایں خرقہ مے آلود ☆ اے شیخ پاکدامن معذور دار مارا

خم خانہ جاوید میں ہے:

''اپنے ساتھ اپنی جائداد کا بھی خاتمہ کر گئے۔ دیگر فنون کے علاوہ آپ کو مرغ بازی میں دلچسپی تھی اور اس شوق میں ہر سال امروہہ سے بدایوں جاتے تھے۔''

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ساکتؔ مرحوم میں ایسی خوبیاں بھی تھیں جن کا آج کل کے ثقہ لوگوں میں بھی کم نشان ملتا ہے۔ ایثار، سخاوت و بہادری، غریب کی حمایت، ہر مذہب وملت کے افراد کی پوری رعایت، پڑوسی کی عزت وآبرو کا پاس ولحاظ، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا احترام، وعدے کا ایفا، عہد کی استواری، طبیعت میں قناعت وتوکل، خدا پر پورا یقین۔ یہ اخلاق عالیہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ تمام مجلسی و معاشرتی

اچھائیوں سے آراستہ پیراستہ تھے۔ حکام وقت ان سے گھبراتے تھے اور کسی پر دست ظلم دراز نہ کر سکتے تھے۔ غریبوں کو ستانے والے بدمعاش ان کے سامنے کان ٹیکتے تھے اور اپنی بدمعاشیوں کا غلط مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب کہاں ساکتؔ جیسے متضاد کیفیات کے آئینہ دار پیدا ہوتے ہیں! خدا بخشے ان میں بہت سی اچھائیاں تھیں، اتنی بات بھی ان کی خصوصیاتِ زندگی ظاہر کرنے کے لیے میں نے لکھ دیں ورنہ وہ میرے استاذ الاستاذ ہیں۔ میرا قلم اس موقع پر بہت رُک رُک کر چلا ہے۔

ساکتؔ صاحب کی والدہ ان کی عمر کے قریب قریب آخری حصہ تک حیات رہیں۔ روزانہ صبح کو زنانے مکان میں اُن کے پاس جانا اور گردن جھکائے کھڑے رہنا یہ ان کا دستور تھا۔ میں نے ساکتؔ صاحب کی وضعداری کے متعدد واقعات سنے ہیں جن کا ذکر کرنا طوالت سے خالی نہیں۔

اولاد:۔ ساکتؔ صاحب کی ایک صاجبزادی تھیں جو حکیم مظفرالہادی سہیلؔ عباسی صاحب سے منسوب ہوئیں۔ یہ انجمن ترقی اردو شاخ امروہہ کے سکریٹری قاضی عزیز احمد عباسی[1] کے نانا تھے۔

مرض اور وفات:۔ آخر عمر میں آکلہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے ۱۳۱۴ھ (۹۷،۱۸۹۶ء) میں انتقال ہوا۔ سنہ عیسوی خمخانہ جاوید میں ۱۸۹۵ء ہے جو تسامح یا کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حکیم عبدالرب[2] نظامی جو کہ ساکتؔ صاحب کے حقیقی چچا کے لڑکے ہیں اس تاریخ کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ساکتؔ صاحب کے انتقال کے وقت میری عمر تین چار سال کی تھی۔ مجھے ان کا شب برأت کی انارکلیاں لا کر دینا اچھی طرح یاد

[1] قاضی عزیز احمد عباسی مرحوم بانی انجمن سیرت النبی نہایت شریف، بااخلاق، بامروت انسان تھے۔ ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ مدرسہ اسلامیہ چلہ میں فارسی کے استاد تھے۔ ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔

[2] حکیم منشی عبدالرب نظامی امروہہ کے نامور لوگوں میں تھے۔ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ ۱۹۷۴ء میں انتقال ہوا۔ (محب الحق)

ہے۔ان کی عمر کا حساب لگایا اور یہ تین چار سال جوڑے گئے تو تقریباً ۱۸۹۸ء سنہ انتقال قرار پاتا ہے۔مگر سنہ ہجری میں کوئی کلام نہیں (اس پر حکیم سید حسن مثنیٰ رضوی ندوی مرحوم نے حاشیہ لکھا ۱۳۱۴ھ سنہ ۹۷،۱۸۹۶ء کے مطابق ۱۸۹۸ء صحیح نہیں ہے۔ممکن ہے عبدالرب کی ولادت آخر سنہ ۱۳۱۰ھ یا ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء، ۱۸۹۲ء میں ہو)

مصرعہ تاریخ وفات یہ ہے:　　سید ابوالحسن سوئے کوثر رواں (۱۳۱۴ھ)

تلامذہ:۔ساکت کے مشہور اور نمایاں تلامذہ جو معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں: غلام نبی خاں شاعر مؤلف مثنوی مطلع نور، رشک دبیر و انیس میر جواد حسین شمیم امروہوی، کرامت علی خلش اجمیری، منشی عبدالرب شکیب امروہوی، منشی ناظر الحق سکوت عباسی۔

شمیم وساکت میں وقتی اَن بَن:۔شمیم صاحب مسلم الثبوت شاعر تھے۔پہلے فرقتی صاحب کے شاگرد ہوئے۔ جب ساکت صاحب راجواڑے سے امروہہ آئے اور مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تو انھوں نے ساکت صاحب کو اپنا کلام سنایا۔فرقتی صاحب کو اس بات پر ناگواری ہوئی اور انھوں نے ایک موقع پر فرمایا: ’’خوشبو کہاں تھی ہم نے بسایا شمیم کو، اب دوسرے استاذ کے یہاں بھی کچھ عرصہ کے بعد بھی در پردہ نوک جھونک ہونے لگی۔آخر میں صلح صفائی ہو گئی۔ شمیم صاحب نے چونکہ غزل گوئی کے میدان سے ہٹ کر مرثیہ نگاری کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا اس لیے بھی ساکت سے مناسبت نہ رہی ہو گی لیکن اس میں کوئی شک نہیں شمیم جیسا قادر الکلام شاعر ساکت کا فیض یافتہ ہے۔

بیدار اور ساکت:۔فاضل خاں بیدار فرماتے ہیں کہ میں نے بھی ساکت صاحب سے اصلاح لی ہے۔اصلاح کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

بیدار

ہیں نشاں دشت میں کچھ کچھ تیرے دیوانوں کے
چاک دامن کے کہیں ٹکڑے گریبانوں کے

ساکت کی اصلاح

ہیں نشاں دشت میں کچھ کچھ تیرے دیوانوں کے
چاک دامانوں کے ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

بیدار نے ساکت صاحب کا بہت سا کلام جمع کیا تھا۔ ٹگری کی ملازمت کے زمانہ میں وہ مجموعہ نذر سیلاب ہو گیا۔ بیدار نے ساکت کی ایک مشہور غزل پر تضمین بھی لکھی تھی۔ ساکت صاحب نے براہِ راست اس کو ملاحظہ فرمایا تھا۔ اس کے ایک دو بند پڑھ لیجیے:

ہم تو تقدیر پہ قانع ہیں بہ فضل یزداں ☆ وصل گر بخت میں لکھا ہے تو بن کر مہماں
گھر میرے آپ چلا آئے گا وہ آفت جاں ☆ پاؤں میں جن کے ہو چکر وہ پھریں سرگرداں
ہم تو یاں نقطہ پرکار بنے بیٹھے ہیں

بیدار صاحب کہتے ہیں کہ ساکت مرحوم نے یہ بند دیکھ کر فرمایا ''ابے تو نے میرا شعر چھین لیا''

صوفی نوراللہ عیش کا مشاعرہ: ۱۸۹۳ء، ۱۸۹۴ء، ۱۸۹۵ء میں صوفی نوراللہ عیش مرحوم (جن کا انتقال ابھی چند سال ہوئے ہوا ہے) محلّہ قریشی میں اپنے مکان پر ماہانہ مشاعرہ کرایا کرتے تھے۔ ہر ماہ مصرعہ طرح دے دیا جاتا تھا اور یہ مشاعرہ ان کے رسالہ ''گلشن سخن'' میں شائع ہوتا تھا۔ مشاعرہ میں ساکت، تحّی برادرِ[1] صفؔی امروہوی، یاور، شیخ علیم اللہ[2] صوفی شاگرد ذوق، مولوی اصغر علی ثابت رامپوری شاگرد منیر شکوہ آبادی، حکیم راحت علی خان[3] حاذق،

---

[1] محسن حسین تحّی شاعری میں اپنے برادر بزرگ صفی امروہوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔
[2] صوفی علیم اللہ صوفی امروہوی جراحی و خوش نویسی میں یگانہ روزگار تھے۔ عرصہ تک دہلی میں قیام رہا۔ ذوق دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ [3] حکیم راحت علی خاں حاذق کنبوہ آپ نے فارسی کی تحصیل خلیفہ شمس الدین صدیقی وانی سے کی۔ طب میں بھی ماہر تھے۔ کچھ عرصہ نواب حامد علی خاں رامپور کے طبیب خاص رہے۔ امروہہ کے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ شاعری میں اولاد حسن سلیم اور امیر مینائی سے تلمذ تھا۔ دیوان حاذق یادگار ہے۔ ۲۰ر رمضان ۱۳۴۹ھ موافق ۹ فروری ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ (محب الحق)

سید فضل حسین[1] سعید شاگرد ذکی مرادآبادی، مولوی ولایت حسین عارف، میر علی مستحسن سکتہ شاگرد شمیم (محلّہ بگلہ)، منشی ناظر الحق[2] سکوت، منشی عبدالرب شکیب، سید حسن ضیاء خلف[3] فرقتی امروہوی، سید علی مجتبیٰ خاں مجتبیٰ[4]، سید علی مہتدیٰ خاں[5] ناظم (گھڑیال والے) تلمذان امیر لکھنوی، حکیم اسرار[6] الحق شوق، شبیر خاں[7] شبیر، خلیفہ مہدی علی ریاض، ہندو شعراء میں منشی موہن لال[8] مشتاق فرق امین تحصیل امروہہ، لالہ بھوکن سرن[9] شبنم امروہوی پسر گوکل چند وغیرہ اچھے

[1] سعید امروہوی فارسی کے ماہر تھے۔ شاعری میں مہدی حسن ذکی مرادآبادی کے شاگرد تھے علم عروض اور قواعد شاعری پر عبور تھا۔ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ موافق جنوری ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا۔ [2] سکوت صاحب نے عربی فارسی کی تحصیل کے بعد فن طب حاصل کی۔ شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ ساکت صاحب کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد تھے۔ بعمر ۲۵ سال ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوا۔ [3] ابوالحسن فرقتی امروہوی صاحب دیوان شاعر تھے۔ "عقیقِ جگری" کلام کا مجموعہ ہے۔ شاعری میں میر عشق لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ کے صاحبزادوں میں حسن ضیاء ضیاء بھی شاعر تھے۔ فرقتی کا انتقال ۱۳۳۰ھ موافق ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ [4] مجتبیٰ معروف بہ چاند عربی فارسی میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ عرصہ تک امام المدارس کے منیجر رہے۔ شاعری میں اولاد حسن سلیم کے شاگرد تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انتقال ہوا۔ [5] ناظم امروہوی عربی فارسی اور اردو ادبیات میں اچھا درک رکھتے تھے۔ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے بیعت، شاعری میں امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ شروع میں شید ابعدۂ ناظم تخلص اختیار کیا۔ [6] مولانا حکیم اسرار الحق صدیقی شوق قاضی نظام الدین کی اولاد میں تھے۔ جن کا سلسلہ نسب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے متصل ہوتا ہے۔ آپ نے علوم متداولہ کی تحصیل وتکمیل جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ سے کی۔ فن طب اپنے والد اور عم حکیم عبدالسلام سے حاصل کی۔ بعدۂ طب کی بعض کتابیں حکیم عبدالمجید خاں وحکیم محمد واصل خاں دہلوی سے پڑھیں۔ شاعری میں مولوی قطب الدین امروہوی اور مولوی اصغر علی ثابت رامپوری سے تلمذ تھا۔ ۱۳ رمضان ۱۳۴۹ھ موافق ۲ فروری ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ [7] شبیر احمد خاں شبیر امروہوی کی ولادت کرنیل گنج میں ہوئی۔ وہاں آپ کے والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائیوں سے حاصل کی پھر امروہہ آکر فارسی وعربی کی تحصیل کی۔ اپنے بھائی محمد عثمان خاں کے ساتھ رنگون گئے۔ محکمۂ بندوبست میں ملازم ہوئے۔ بعدۂ امین ہوئے اور بارہ سال تک اس عہدے پر رہے۔ پھر چاٹگام اور ارکان میں انسپکٹر بندوبست ہوئے۔ قدرت نے شعر گوئی کا اچھا ملکہ عطا کیا تھا۔ شاعری میں ابوالحسن ساکت امروہوی اور صفی امروہوی کے شاگرد تھے۔ بزم شبیر، نظم شبیر اور مثنوی آشوبِ ریل وغیرہ شعری مجموعے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں انتقال ہوا۔ [8] موہن لال مشتاق اچھے قادرالکلام شاعر تھے۔ ساکت صاحب کے شاگرد تھے۔ [9] لالہ بھوکن سرن شبنم زردوزی کا کارخانہ تھا۔ شاعری میں جواد حسن شمیم کے شاگرد تھے۔ (محب الحق)

باکمال شعراء شریک ہوتے تھے۔ ذی فہم اور ذی استعداد سامعین مشاعرے کی سماعت کرتے تھے۔ تہذیب، شائستگی کا پورا نمونہ نظر آتا تھا۔ آج کی طرح نہیں کہ الّھڑ مزاج نوجوانوں نے مشاعروں کو اپنی تفریح کا اڈا بنا رکھا ہے کہ جہاں ان کے کان میں کسی مشاعرے کی بھنک پہنچی یہ اپنی خاص ٹولی لے کر مشاعرے میں پہنچے اور ادھم مچا دیا۔ کسی جانب سے آواز آئی ترنم سے پڑھیے، کسی نے کہا بس مقطع پڑھ دیجیے۔ یہ بدتمیزیاں اس وقت نہ تھیں۔ ہائے وہ محفلیں اور وہ تہذیب و شائستگی اب کہاں! بزرگوں سے جب گزری ہوئی ادبی مجلسوں کا تذکرہ سنتا ہوں تو ماضی کی محفلیں دماغ میں فانوسِ خیال کی طرح گھومنے لگتی ہیں۔

ساکت کی ریختی:۔ منشی راحت[۱] علی تلمیذ حضرت حاذق (جو اس وقت بقید حیات ہیں) فرماتے تھے کہ: عیشؔ صاحب نے مجھ سے فرمایا: ساکتؔ صاحب کی ''ریختی'' کی بہت شہرت سنی ہے۔ اگر وہ ہمارے مشاعرے میں ریختی بھی پڑھ دیا کریں تو مشاعرے کو چار چاند لگ جائیں گے۔ راحت صاحب ساکتؔ صاحب کے ہم زلف ہوتے ہیں۔ اس پیغام کو پہنچانے کے لیے یہ زیادہ موزوں معلوم ہوئے۔ چنانچہ یہ ساکتؔ صاحب کے دیوان خانہ میں پہنچے۔ ساکتؔ صاحب نے حسب عادت فرمایا آؤ میاں! کیسے آئے؟ میرے کرنے کا کوئی کام ہے؟ راحت صاحب نے فرمایا: جی ہاں! ایک درخواست لے کر آیا ہوں وہ یہ کہ آپ محلّہ قریشی کے مشاعرے میں ریختی پڑھ دیا کریں۔ لوگ بہت مشتاق ہیں اور اس سے مشاعرہ بھی ترقی پائے گا۔ کہنے لگے اچھی بات ہے۔ اس مرتبہ مشاعرہ کب ہوگا؟ تاریخ بتلائی گئی۔ اس طرح ریختی کے سننے سنانے کا ایک موقع ہاتھ آیا۔ ریختی پڑھتے وقت دوپٹہ استعمال ہوتا تھا۔ آرسی پہن لیتے تھے۔ تالیاں بجاتے تھے اور ایک عجیب انداز میں پڑھتے تھے۔ خود لکھتے ہیں:

کہے گر ریختی کوئی تو کچھ مشکل نہیں بندی ☆ مگر پڑھنا نہیں آساں کہ بجانا ہے تالی کا

۱۔ جب یہ مقالہ لکھا گیا تھا تو منشی صوفی راحت علی صاحب بقید حیات تھے۔ ۱۹۹۱ء میں انتقال ہوا۔ (محب الحق)

مجھے کتّے نے کاٹا ہے کہ گاؤں گاؤں میں جاؤں ☆ نگوڑا ایسا کیا میٹھا ہے آغا پور سہالی کا

ریختی زیادہ تر دوسرے نام سے لکھتے تھے۔ اس میں بندیؔ تخلص ہوتا تھا۔ گلشن سخن میں ان کی ریختیاں دوسرے نام سے ہی چھپی ہوئی ہیں۔ ریختی میں بہت زیادہ شوخی ہوتی تھی۔ دو تین شعر ریختی کے بھی پڑھ لیجیے:

سَوت کو وہ ساتھ لائے ہیں منانے کے لیے ☆ اور مجھ جلتی ہوئی کو وہ جلانے آئے

مجھ سے خانم نے کہا اوئی بوا خاک پڑے ☆ بند محرم کے بھی تم سے نہ لگانے آئے

ایک مشاعرہ کی ''طرح'' نکلی۔ فرقتیؔ نے یا کسی اور شاعر نے اس طرح کو غیر شگفتہ بتایا اُس طرح پر ریختی لکھی اور آخر میں لکھا:

بندیؔ نے اس زمیں میں بھی گل کھلا دئے ☆ کہتے تھے مردوئے کہ شگفتہ زمیں نہیں

ساکت کا دیوان کیا ہوا؟:۔ ساکتؔ صاحب کے دیوان کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنا دیوان جلا دیا تھا۔ اس جلانے کی توجیہات میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس لیے جلا دیا کہ ان کے بعد اگر کسی نے ان کے کلام پر اعتراض کیا تو جواب کون دیگا؟ لہٰذا نذرِ آتش کرنا مناسب ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں اس لیے جلایا کہ کہیں اُن کے بعد کوئی شاعر ان کے کلام کو اپنی طرف منسوب کرنے لگے لیکن بعض واقفین ساکتؔ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ کلام جلایا نہیں بلکہ بعد کو تلف ہو گیا۔ خیر جو صورت بھی ہو آج دیوانِ ساکت کہیں موجود نہیں اور یہ اتنا بڑا ادبی نقصان ادبائے امروہہ کے حصہ میں آیا ہے کہ اس کی تلافی ممکن نہیں۔ خمخانہ جاوید میں ہے:

> ''آپ (ساکتؔ صاحب) کسی رنگ میں بند نہ تھے۔ غزل، قصیدہ، مخمس، مسدس کے سوا ریختی بھی کہتے تھے۔ آج ان کا پورا دیوان میسر نہ ہونے کی وجہ سے ادب و شعر کے ایک بڑے خزانے سے محروم ہو گئے۔''

مجھے کلام کس طرح دستیاب ہوا؟:۔ ابھی بیان کر چکا ہوں کہ ساکتؔ کا جمع

کردہ کلام تلف ہو گیا تھا لیکن ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے طور پر بھی ان کا کلام جمع کیا ہوگا۔ اسی قسم کا ایک مجموعہ جو نہایت خوش خط لکھا ہوا تھا اور جو ان کے دیوان کا بدل قرار پا سکتا تھا۔ بد ذوقی، زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے ایک پنساری کی دکان پر ردّی کے کاغذات کے ہمراہ بیچ دیا گیا اور اس کی پڑیاں بندھیں۔ حکیم صیانت اللہ صاحب[1] کو خدا خوش رکھے! کہ یہ کسی طرح دو ورق بچا کر لے آئے۔ وہ میرے پاس ہیں، اس میں ردیف نون کی دو تین مکمل غزلیں اور چند شعر ملے اور ساکتؔ کی وہ مشہور غزل جس کا مقطع ہے:

بال بکھرے ہوئے اور حال پریشاں ساکتؔ ☆ خود تماشا سرِ بازار بنے بیٹھے ہیں

پوری انھیں ورقوں میں دستیاب ہوئی۔ گلشن سخن امروہہ میں ساکتؔ صاحب کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا لیکن وہ بھی پورے شہر میں ایک جگہ سے دستیاب ہوئے۔ چند پرچے فائل میں نہیں تھے ان کی ہر چند تلاش کی نہ ملنا تھا نہ ملے۔ خمخانہ جاوید میں ستائیس شعر تذکرہ ساکتؔ کے آخر میں درج ہیں۔ ان میں سے سترہ اشعار ایسے تھے جو مجھے نہ ملے تھے۔ باقی دس میرے پاس پہلے سے موجود تھے۔ ایک غزل بیدار صاحب نے مجھے اپنی یادداشت سے لکھوائی اور ایک شعر محلہ قریشی کے ایک معمر بزرگ سے نوٹ کر لیا۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ سو اشعار اس مقالے میں درج کر رہا ہوں۔

خصوصیات کلام ساکتؔ: ۔ حکیم مومن خاں مومنؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے آثرؔ لکھنوی نے لکھا ہے:

”انھوں نے اپنے دائرہ تخیل کو بہت محدود کر دیا ہے۔ مسائل تصوف و

---

[1] مولوی حکیم صیانت اللہ صدیقی امروہہ کیا بلکہ روہیلکھنڈ کے معروف اطباء میں سے تھے۔ آپ کے اجداد میں سے نواب رامپور کے طبیب خاص تھے۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ چلہ امروہہ کے مہتمم بھی رہے۔ آپ کا وصال یکم ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ موافق ۲۴ رمئی ۱۹۹۳ء میں ہوا۔ اس وقت آپ کے صاحبزادے حکیم شعیب اختر صدیقی اور شعیب اختر کے صاحبزادے صباحت اللہ صدیقی نہ صرف روہیلکھنڈ بلکہ بیرون ہند میں مشہور و معروف ہیں اور حکیم شعیب اختر فنون طب اور معالجہ میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دست شفا بھی عطا فرمائی ہے۔ (محب الحق)

سائنس و فلسفہ کی کہنا چاہیے کہ جھلک بھی نہیں ہے۔ صرف ایک متلوّن مزاج شاہد مجازی سے محبت ہے اور اسی کے تمام لوازم ہیں۔ ادا و ناز و کرشمہ و غمزہ کی مصوّری ہے۔ اپنے یا غیر کے جذبۂ رشک و حسد و رقابت کی نقاشی ہے۔ ادا بندی اور معاملہ نگاری ہے۔ واردات حسن و عشق کا تذکرہ و تجزیہ ہے مگر سب مجاز کا پہلو لیے ہوئے۔ تاہم اس محدود دائرے میں ایسے حیرت انگیز جدّت اور تنوع سے کام لیا ہے کہ جو شعر ہے نیا ہے اور اسی کے ساتھ بیحد دلکش۔ (نگار مومن نمبر ص ۸۱)"

بعینہ یہی شان ہمارے ساکتؔ صاحب میں پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں کسی فلسفے کا تلاش کرنا بالکل بے سود ہے۔ وہ بالکل سادہ اور "انفسی"، "آفاقی" باتیں کہتے ہیں، ان کی غزل میں حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ ہے۔ وہ اسی دنیا میں بسنے والے مادّی محبوب کا تذکرہ مختلف عنوانات سے اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔ جتنے اشعار مجھے مل سکے ہیں وہ سب قریب قریب اسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سر دست چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

غصے میں بھی تو ہائے غضب لطف ہے تیرے ☆ پھر کہہ لے کچھ مجھے ذرا آنکھیں نکال کے

دم میں ہنس دیتے ہیں دم بھر میں خفا ہوتے ہیں ☆ کبھی کیا ہوتے ہیں وہ اور کبھی کیا ہوتے ہیں

آ کر صفِ ماتم میں میری بیٹھے ہیں وہ آج ☆ سچ پوچھیے تو غیر کے مر جانے کی جا ہے

غیر سے بات نہیں کرتے ہیں گو محفل میں ☆ آنکھوں آنکھوں میں اشارے تو ہوا کرتے ہیں

ظاہری ان کی بناوٹ کا یہ پردہ دیکھو ☆ سامنے میرے عدو سے بھی حیا کرتے ہیں

وہ اس انداز سے آئے شبِ وعدہ میرے گھر میں ☆ چمن میں جیسے آتی ہے بہار آہستہ آہستہ

نیا انداز دیکھو آئینہ رکھ کر مقابل میں ☆ اشاروں سے وہ باتیں کر رہے ہیں اپنے جوبن سے

واہ کیا بات تری لغزشِ گفتار کی ہے ☆ بات اقرار میں ملتی ہوئی انکار کی ہے

نہ مر جاؤں تو لاؤں ایسے صدمے کو جگر کس کا ☆ رکھا ہے غیر کے زانو پہ دیکھیں آپ سر کس کا

بات کرنا نہیں منظور جو ان کو مجھ سے ☆ سر جھکائے ہوئے بیمار بنے بیٹھے ہیں
کل برا کہتے تھے وہ جن کو ہمارے آگے ☆ آج خلوت میں وہی یار بنے بیٹھے ہیں
حیلے مرے اٹھانے کو ہوتے ہیں کس لیے ☆ کیا جاؤ گے کہیں مجھے محفل سے ٹال کے
الٰہی وہ بھی تو اک دن نصیب ہو مجھ کو ☆ عدو کو میری طرح اُن کا انتظار ہے

ساکتؔ نے اپنے اندازِ نگارش پر خود ہی ایک شعر میں روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:

کبھی ساکتؔ سے ادا ہوتے ہیں انداز کے شعر ☆ کبھی مضمون کے اشعار نکل جاتے ہیں

مضمون کے مقابلے میں ''انداز'' کا لانا بتا رہا ہے کہ وہ انداز سے زبان اور معاملہ بندی مراد لے رہے ہیں۔ ایک اور شعر میں فرماتے ہیں:

ہے غزل دوسری ساکتؔ کی بہ تبدیل ردیف ☆ میرے انداز کے شعر اس میں ادا ہوتے ہیں

اول انداز کے کچھ شعر پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے:

غیر جب بزم میں مختار بنے بیٹھے ہیں ☆ آپ کس بات کے سرکار بنے بیٹھے ہیں

زبان کا لطف اور بے ساختہ پن دیکھیے:

وہ یہ کہتے ہیں کہ تو کیا اور تری توقیر کیا ☆ میں یہ کس منہ سے کہوں کرتے ہو یہ تقریر کیا
دل پہ دزدیدہ نظر کی چوٹ کیا کاری لگے ☆ اے مرے ناوک فگن ٹوٹی کماں کا تیر کیا
میں جھوٹ بولتا ہوں تو پھر اس طرح سہی ☆ آپ جو کہتے جائیں میں اس کو بجا کہوں
جاتی رہے گی عشق کی لذت یہ خوف ہے ☆ پھل کھا کے تیغِ یار کا اور بے مزہ کہوں
تم نہیں آتے شب ہجر بلا سے مت آؤ ☆ موت کے واسطے کیا راہ مرے گھر میں نہیں
یاد ہے کہنا نہ یاد آیا انھیں لے کر پان ☆ شرط وہ ہار گئے مجھ سے فراموشی میں
کوچۂ عشق میں کیوں ٹھوکریں کھائیں ساکتؔ ☆ منہ پہ کیا آنکھیں نہ تھیں دیکھ کے چلنے کے لیے
صورت ہی میری دیکھ کے مطلب سمجھ گئے ☆ قربان جاؤں آپ کے نازک خیال کے
اب تو آبیٹھیں ہیں ہم کوچے میں تیرے قاتل ☆ اب بلا کھائیں کہیں تیغ کا پھل جاتے ہیں

جوڑا پنے گر اس بزم میں چل جاتے ہیں ☆ بات کی بات میں اغیار نکل جاتے ہیں
بات کچھ غیر سے کہنے کو ہیں سرگوشی میں ☆ حیلہ یہ ہے کہ گرے پڑتے ہیں بیہوشی میں
کس لیے کرتے ہیں آپ ایک ہی ساغر میں نہیں ☆ زہر کا گھونٹ تو کوئی مئے احمر میں نہیں

اب ''مضمون'' کے شعر پڑھیے:

سایۂ زلف جو پڑتا ہے شکم پر ان کے ☆ گدگدی ہوتی ہے ایسی کہ اچھل جاتے ہیں
آ کے ابرو میں تو رہ جاتے ہیں قسمت سے مری ☆ گر طبیعت سے تمہاری کبھی بل جاتے ہیں
ضعف میں ہم کو جو پڑ جاتی ہے امید وصال ☆ گرتے گرتے ترے کوچے میں سنبھل جاتے ہیں
گرمیِ عشق نے یہ خون سکھایا میرا ☆ عشق آنکھوں میں میری آتے ہی جل جاتے ہیں
اللہ رے شوخی کہ جدھر کو وہ گیا ہے ☆ نقشِ کفِ پا میں اثرِ رنگ حنا ہے
شفق نے رنگ اڑایا ترے دستِ حنائی کا ☆ شعاعِ مہر نے پرتو لیا گوری کلائی
گیا ہے ہلکے ہلکے اس طرح عالم جوانی کا ☆ نشے کا جیسا ہوتا ہے خمار آہستہ آہستہ
رنگ شوخی کے سبب کوئی ٹھہر سکتا نہیں ☆ صفحہ قرطاس پر کھینچوں تری تصویر کیا
ہاتھ عارض کو لگانے نہیں دیتے گیسو ☆ دولتِ حسن پہ یہ مار بنے بیٹھے ہیں
چلنے پھرنے کی جو عادت نہیں تنہا ہم کو ☆ گور کے گھر کو بھی ہمراہ اجل جاتے ہیں
جادہ عشق میں وحشت کی ترقی دیکھو ☆ میں جو چلتا ہوں خیالات بھی چل جاتے ہیں
جو کوئے یار میں جا کر مرا غبار رہے ☆ عدو کے نقش قدم کی نظر میں خار رہے

ضرب الامثال:۔ ضرب الامثال اس خوبی سے نظم کی ہیں کہ خود ان کا شعر ضرب المثل بننے کے قابل ہو گیا ہے۔ دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

ایک چپ سو کو ہراتا ہے مثل ہے ساکت ☆ فائدہ ہم نے یہی سوچا ہے خاموشی میں
خود اپنی آنکھ سے عارض نظر نہیں آتا ☆ مثل یہ سچ ہے اندھیرا چراغ کے نیچے

محاکات:۔ تصویر کشی اور منظر نگاری کا کمال ان اشعار میں دیکھیے:

بال بکھرے ہوئے اور حال پریشاں ساکتؔ ☆ خود تماشا سرِ بازار بنے بیٹھے ہیں
سوتوں میں جان ڈال کے لیتے ہیں کروٹیں ☆ سوتا ہی کہہ سکوں نہ انھیں جاگتا کہوں
قتل گہ میں آج اندر کے اکھاڑے کا ہے لطف ☆ رقصِ بسمل دیکھیے قاتل کی ٹھوکر دیکھیے
دبے پاؤں وہ آئے فاتحہ خوانی کو مرقد پر ☆ چھوا پھر ناز سے میرا مزار آہستہ آہستہ
چلنا اکڑ کے اور کبھی گردن کو ڈال کے ☆ انداز کیسے کیسے نکالے ہیں چال کے

جوانی کی یاد: ساکتؔ کا اصلی رنگ نشاط انگریزی اور سرور آمیزی ہے لیکن کبھی کبھی ان کے دل سے جوانی کے غم میں آہ بھی نکل جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

خانۂ دل میں نہ ارماں ہیں نہ حسرت کا ہجوم ☆ ایک جانے سے جوانی کے یہ ویرانی ہوئی

زوالِ شباب سے انسان کے اطوار میں فرق آجاتا ہے اس بات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے:

جب کہ آجاتا ہے انساں کی جوانی کو زوال ☆ سائے کی طرح سے اطوار بھی ڈھل جاتے ہیں

ساکتؔ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا محبوب وہ نہیں جس کے سبزۂ خط کو کاکل مشکیں سے ٹکرایا جائے۔ وہ مومن خاں مومنؔ کی طرح سے اپنے محبوب کے انتخاب میں فطرت صحیحہ کے پیرو ہیں۔ ان کے استاد نظامؔ رامپوری کے یہاں بھی یہی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ نظامؔ کا مشہور شعر ہے:

بولے وہ میرا ہاتھ دوپٹے سے باندھ کر ☆ اب بھی دعائے وصل کروگے اٹھا کے ہاتھ

اب میں ساکتؔ صاحب کے دو تین شعر آپ کو پڑھواتا ہوں جس سے ان کی اس خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے:

کچھ سینہ ہاتھا پائی میں کھل کھل جو جاتا تھا ☆ لڑتے تھے بار بار دوپٹا سنبھال کے

داغؔ دہلوی کے اس شعر کی بجا طور پر تعریف کی گئی ہے جس میں محاکات اس مقام پر ہے جہاں مصور کے پر جلتے ہیں:

بادِ صبا بھی کر نہ سکی اس کو بے حجاب ☆ سینے پہ ہاتھ آ گیا ہو پلّو جو اُڑ گیا

(اس پر حکیم حسن مثنّی رضوی مرحوم نے یہ نوٹ لکھا تھا: داغؔ کا یہ شعر عربی کے مشہور شاعر نابغہ

ذبیانی کے اس شعر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے

سَقَطَ النَّصِیفُ وَلَمْ تُرِدْ اِسْقَاطَهٗ ☆ فَتَنَا وَلَتْهُ وَالْتَقَطْنَا بِالْیَدَا

کیا داغ کے ہم عصر اس باکمال شاعر کے شعر میں محاکات کی کچھ کمی ہے؟ کیا سلامت طبع کا تقاضا نہیں ہے کہ ساکت کے مندرجہ بالا شعر کو بے سوچے سمجھے سُوقیانہ کہہ دینے کی بجائے مطابق فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ محاکات کا نمونہ قرار دیا جائے؟

چور چھلّے کا بناتے ہو بیٹھا کر اپنے پاس ☆ اپنی چادر دیکھیے یا اپنا بستر دیکھیے

مات کرتی ہے تری سادگی آرائش پر ☆ سادہ پن میں جو ترے زیب ہے زیور میں نہیں

تمہارے حسن کا پھولوں بھرا سنگھار رہے ☆ رہے جو ہاتھ میں گجرا گلے میں ہار رہے

تخلص سے استفادہ:۔ ساکت صاحب کبھی کبھی اپنے تخلص سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں:

ایک چپ سو کو ہراتی ہے مثل ہے ساکت ☆ فائدہ ہم نے یہی سوچا ہے خاموشی میں

وہ آپ کو خموش تھے میں آپ کو خموش ☆ ساکت شب وصال کا کیا واقعہ کہوں

اب میں بقیہ اشعار بغیر کسی عنوان کے درج کیے دیتا ہوں، خود پڑھیے اور لطف اندوز ہوجیے۔ طول مضمون کے خوف سے ان اشعار کی تشریح نہیں کروں گا۔

کاٹ دیتے ہیں ہر اک بات مری جھنجلا کر ☆ آج وہ غصے میں تلوار بنے بیٹھے ہیں

بات کوئی بھی ٹھکانے کی نہیں ہوتی ہے ☆ اپنی دانست میں ہشیار بنے بیٹھے ہیں

دیکھیے کتنے گرفتار نئے ہوتے ہیں ☆ آج بے ڈھب سرِ بازار بنے بیٹھے ہیں

آپ ہی قتل کیا پھر یہ تماشا دیکھو ☆ آپ ہی میرے عزادار بنے بیٹھے ہیں

مجھ کو جانے نہیں دیتے ہیں تری محفل میں ☆ غیر در پر ترے دیوار بنے بیٹھے ہیں

ناکامیِ وصال کا کیا ماجرا کہوں ☆ اپنی خطا بتاؤں کہ ان کی خطا کہوں

کھلتی نہیں جو گانٹھ ترے دل کی وصل میں ☆ کیا اس گرہ کو عقدۂ بندِ قبا کہوں

دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں میری آنکھیں ☆ کوئی روزن تری دیوار کے پتھر میں نہیں

کچھ ایسی آ سنائی کہ دم ہی نکل گیا ☆ قاصد ترے بیان کو پیک قضا کہوں
بانکپن ہے تری تلوار میں گر اے قاصد ☆ کون سی نوک ہے وہ جو ترے خنجر میں نہیں
چونک اٹھا فتنۂ محشر یہ تماشا دیکھو ☆ بختِ خفتہ کو مرے جب وہ جگانے آئے
ربط باہم تھا کبھی اب ہے یہ رنجش پیارے ☆ وہ زمانے تو گئے اور یہ زمانے آئے
بعد رنجش وہ مرے پاس جو بیٹھے مل کر ☆ یاد دونوں کو بہت پچھلے فسانے آئے
میرے مرنے میں جو کچھ شک ہوا ان کو ساکتؔ ☆ وہ مرے پاس عیادت کے بہانے آئے
غیر کا عیب نظر آتا ہے ان کو جوہر ☆ کوششیں سیکڑوں کرتے ہیں خطاپوشی میں
یہ دعا ہے کہ الٰہی یہ انھیں یاد رہے ☆ وعدۂ وصل تو کرتے ہیں وہ مے نوشی میں
سر کٹا کر میں تقاضے سے اجل کے چھوٹا ☆ خوب اب اپنی بسر ہوگی سبکدوشی میں
آج ارماں مرا نکل کے رہے ☆ بزم ساقی میں دور چل کے رہے
ہم کو نشے میں کر دیا بے خود ☆ اور وہ قائم سنبھل سنبھل کے رہے
غیر کا جوڑا چل گیا آخر ☆ ساکتؔ اس بزم سے نکل کر رہے
آپ کے سامنے حاضر ہیں مرے قلب وجگر ☆ ایک مَلنے کے لیے ایک مَسلنے کے لیے
وہ بھی کمسن ہے ابھی دل بھی ہے ناداں میرا ☆ ایک سے ایک زیادہ ہے مچلنے کے لیے
جل بجھی شمع دم صبح یہ ماتم کر کے ☆ کل پھر آنا ہے اسی بزم میں جلنے کے لیے
جس قدر مجھ پہ ترے جور وجفا ہوتے ہیں ☆ حوصلے مجھ کو محبت کے سوا ہوتے ہیں
اک نہ اک کوئے عدو میں ہمیں مل جاتا ہے ☆ تم نہیں ہوتے ہو نقش کفِ پا ہوتے ہیں
مرتے دم آنکھ تری سمت کو وا کرتے ہیں ☆ ہم ترا قرض ادا کر کے قضا کرتے ہیں
شرم آئی نہ انھیں پیش خدا بھی ساکتؔ ☆ الٹے شکوے وہ ترے پیش خدا کرتے ہیں
بادہ نوشی میں کسی دن جو وہ چل جاتے ہیں ☆ نگہِ شوق کے ارمان نکل جاتے ہیں
ہوا بے باک کھلتے کھلتے یار آہستہ آہستہ ☆ اتارے وصل میں پھولوں کے ہار آہستہ آہستہ

ان کے پیغام چلے آتے ہیں ساکتؔ پیہم ☆ کبھی خنجر کی زبانی کبھی تلوار کے ہاتھ

کہا یہ گریہ نے چشم پُر آب سے میری ☆ جدا جدا مرے اشکوں کا تار تار رہے

مرا دل لے کے مٹھی میں وہ بولے ☆ ہمارے ہاتھ میں بتلاؤ کیا ہے؟

خبر سن کر مرے مرنے کی بولے ☆ کہ ساکت مر گیا بیمار کیا تھا؟

بھول جاتے ہیں خدا کو بھی بتوں سے مل کر ☆ بُت نہیں ہوتے تو ہم یاد خدا کرتے ہیں

یہ بُت بھی آپ سے مل جائیں حضرت ساکتؔ ☆ خدا کی ذات پہ گر آپ کا مدار رہے

اُن کے آنے کی یہاں ٹھہری تو ہے پر دیکھئے ☆ کس طرح ٹوٹے گی شرم آئیں گے کیوں کر دیکھئے

آپ اپنی بے نیازی بندہ پرور دیکھئے ☆ یاں تو کچھ کہتا نہیں واں روز محشر دیکھئے

بیڑی منّت کی وہاں اور یاں یہ زنجیر جنوں ☆ اُن کا زیور دیکھئے اور میرا زیور دیکھئے

ہوں وہ دیوانہ کہ وحشت نے کیا جو عرصہ تنگ ☆ پھاڑ ڈالا حشر میں دامانِ محشر دیکھئے

سخت جانی سے مری دشنہ گلو پر کب رکا ☆ آپ کا تار نظر ہے زیر خنجر دیکھئے

بزم میں سنتا ہے وہ بھی کرتے تھے تم جس کا ذکر ☆ دائیں بائیں دیکھئے پیچھے کو مُڑ کر دیکھئے

میری باتوں کا اڑانا ہے فقط مد نظر ☆ دیکھئے دیوار کو یا جانب در دیکھئے

حضرت دل اُن کی صورت دیکھ کر حیراں ہو گیا ☆ جن کے پہلو میں ہیں وہ ان کا مقدر دیکھئے

میرے مرقد پر عزیزوں نے رکھا تعویذ سنگ ☆ بعد مردن بھی رہا سینے پہ پتھر دیکھئے

قتل گہ میں آج اندر کے اکھاڑے کا ہے لطف ☆ رقصِ بسمل دیکھئے قاتل کی ٹھوکر دیکھئے

چور چھلّے کا بناتے ہو بٹھا کر اپنے پاس ☆ اپنا بستر دیکھئے یا اپنی چادر دیکھئے

حضرت ساکتؔ کے سر میں خاک اور ہاتھوں میں سنگ
دیکھئے گر اُس طرف کیا خاک پتھر دیکھئے

حکیم حسن مثنیٰ صاحب نے یہ ایک شعر ساکتؔ کا استاد حامد حسن وفاؔ سے سنا ہوا مجھے سنایا

قبر میں بھی ترے دیوانے کی وحشت نہ گئی ☆ سر پہ کم بخت نے دنیا کو اُٹھا رکھا ہے

مقالہ (۶)

مآثر شیخ الہندؒ[۱]

بنالیتا ہے موجِ خوں دل سے ایک چمن اپنا ☆ وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

حضرت شیخ الہندؒ کے مختصر حالات زندگی: شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نے سوانح شیخ الہندؒ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجدؒ کا نام مولانا ذوالفقار علیؒ تھا جو ایک بڑے فاضل اور متبحر عالم تھے اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ بریلی میں محکمہ تعلیمات میں ملازم تھے۔ وہیں حضرت شیخ الہندؒ ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل جب کہ عمر پانچ چھ سال تھی آپ کے والد کا میرٹھ کو تبادلہ ہوا۔ آپ ان کے ہمراہ میرٹھ رہے۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں آپ کبھی دیوبند اور کبھی میرٹھ رہے۔ قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم ایک دین دار بزرگ میاں جی منگلوری سے پائی اور کتب عربیہ اپنے چچا مہتاب علی سے پڑھنی شروع کی۔ جب آپ تہذیب و قدوری وغیرہ پڑھ رہے تھے کہ ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ اس کے سب سے پہلے طالب علموں میں داخل ہوئے۔ اکثر کتب درسیہ مدرسہ کے مشہور استاذ ملا محمود دیوبندیؒ سے پڑھ کر اپنے مخصوص استاذ قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے دیوبند اور میرٹھ رہ کر صحاح ستہ اور دیگر علوم کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ بعض کتب اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں۔ ۱۲۹۰ھ میں آپ کو فراغت حاصل ہوئی۔ اور ۱۲۹۲ھ میں مدرسہ دیوبند کے مدرس چہارم مقرر ہوئے۔ ہر قسم کی متوسط اور اعلیٰ کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ ۱۲۹۴ھ میں مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ اور دیگر اکابر کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے اور

---

[۱] یہ مقالہ ''مقامِ محمود'' (سیمنار حضرت شیخ الہندؒ منعقدہ یکم جنوری ۱۹۸۶ء میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ) سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے شرف بیعت حاصل کی اور استاذ الاستاذ حضرت شاہ عبدالغنی فاروقی مجددیؒ سے بھی کسب فیض کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں جب کہ حضرت مولانا نانوتویؒ کا وصال ہوا تو آپ ان کے غم والم میں عزلت گزیں ہو گئے۔ ایک ماہ کے بعد حاجی رفیع الدین عثمانیؒ مہتمم مدرسہ دیوبند کے اصرار وارشاد پر سلسلہ تدریس جاری کیا اور جذبہ سلوک طریقت بھی اسی زمانہ میں غالب آیا اور آپ نے حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر اس کی جد و جہد شروع کی۔ تدریسی مشاغل کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل میں بھی مشغول رہتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مقاماتِ طریقت طے کر کے مستحق خلافت ہو گئے۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے حضرت حاجی صاحبؒ کو لکھا کہ مولوی محمود حسن کو ملکہ یادداشت حاصل ہو گیا۔ آپ ان کو اجازت دیدیں۔ چنانچہ وہاں سے اجازت آ گئی۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی وفات اور مولانا سید احمد دہلویؒ کے بھوپال چلے جانے کے بعد ۱۳۰۵ھ میں باتفاق اراکین شوریٰ آپ صدر مدرس تجویز ہوئے اور علی الاتصال چالیس سال تک نشر و اشاعت علوم فرماتے رہے۔ تمام کتب علوم عقلیہ ونقلیہ کی تدریس میں عموماً اور کتب حدیث کی تدریس میں خصوصاً یدِ طولیٰ رکھتے تھے جس کی وجہ سے اقطار ہندوستان اور ممالک بعیدہ سے طلباء علوم کشاں کشاں آتے تھے۔ ''مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، موصل، بصرہ، بلخ، بخارا، ہرات، قندھار، کابل، ترکستان'' ہر جگہ کے طلباء آپ کے درس میں نظر آتے تھے۔ متعدد منتہی طلباء جو مختلف اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اپنے شکوک وشبہات کے تسلی بخش وکامل جواب پانے کے بعد آپ کے تبحر علمی کے معترف ہو جاتے تھے۔ آواز صاف وبلند تقریر نہایت سلیس اور رواں تھی۔ کلام میں خاص اثر تھا جو کہ مضمون کو سامع کے دلنشین کر دیتا تھا۔ تواریخِ عالم بالخصوص تاریخ اسلام پر خصوصی نظر تھی۔ اساتذۂ شعر وسخن کے عربی وفارسی واُردو اشعار کثرت سے یاد تھے۔ خود آپ کے اندر بھی ملکہ سخن گوئی نہایت اعلیٰ تھی۔ طبیعت نہایت سادہ اور متواضع تھی، فخر وتکبر کا نام تک نہ تھا، وضع و

قطع میں ریا ونمود، تعلّی اور بڑائی کا شائبہ بھی نہ تھا۔قدرت نے عزم راسخ اور یقین صادق عطا فرمایا تھا۔ایک عظیم قومی وملی تنظیم کی جدوجہد میں اپنی عمر کا آخری حصہ سخت مصائب میں گزار کر جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے ۸۰ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے دار بقا کو سِدھارے۔(ماخوذ: ازنقش حیات جلد دوم)''

حضرت شیخ الاسلامؒ اپنی کتاب ''نقشِ حیات جلد دوم'' میں انگریز کی آمد ہند اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم اور ۱۸۵۷ء کے واقعات بیان فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

'' آئینی انقلاب کی تحریک ۱۸۸۵ء میں بصورت کانگریس جاری کی گئی۔اس کی رفتار نہایت دھیمی تھی اور بالمقابل انگریز ہر قسم کے توڑ کی کاروائی کر رہا تھا۔تا ایں کہ نوبت تقسیم بنگال کی آ گئی۔لارڈ کرزن نے افتراق کا سیلاب چاروں طرف بنگال میں پھیلا دیا۔مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑا کر حکومت برطانیہ نے اپنا خوب مقصد حاصل کیا۔مگر پھر مجبور ہو کر دربار کے موقع پر تقسیم کے منسوخ کر دینے کا اعلان کر دیا۔یوپی میں ۱۹۰۰ء میں ناگری کا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اور مہاسبھا کا فتنہ برپا کر دیا۔اُدھر ٹرکی جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کا قبلہ توجہ اور خلیفۂ دینی چلا آرہا تھا اس کے ساتھ مظالم اور دردناک ناانصافیوں ؛خصوصاً جنگ طرابلس اور بلقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے ایسے واقعات لگاتار پیش آئے جنھوں نے انتہائی بے چینی عالم میں پیدا کر دی۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ جن کی گہری نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور ٹرکی پر زیادہ مرکوز رہتی تھی ان واقعات سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ ان کے لیے آرام و چین تقریباً حرام ہو گیا اور گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔تاریخ دانی اور گزشتہ واقعات ہند و ممالک اسلامیہ ایشاء، افریقہ اور یورپ وغیرہ پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ انگریز کے خلاف سرگرمی کا مظاہرہ کریں۔مولاناؒ کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور پھر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے حاصل

تھا۔ سالہا سال ان کی خدمت عالیہ میں انتہائی اخلاص اور شغف بلکہ عاشقانہ جذبات کے ساتھ رہنا ہوا تھا اور ان حضرات کی وہ مکمل ہستیاں تھیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ پر سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ سلگتی رہی تھی۔ اس لیے حضرت شیخ الہندؒ میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی امر ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ حضرتؒ کو قدرت کی فیاضیوں سے ایسا قلب عطا ہوا تھا جس میں انسانی غیرت، وطنی اور قومی حمیت، اخلاص اور للّٰہیت، اسلامی ہمدردی وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ دماغ ایسا قوی الحافظہ عطا کیا گیا تھا جس میں نہ صرف علوم عقلیہ ونقلیہ کے بے شمار مسائل محفوظ رہتے تھے بلکہ واقعات تاریخیہ اور ادبیہ اردو، فارسی، عربی کے بے شمار خزانے بھی جمع رہتے تھے۔ ذکاوت اور سمجھ ایسی اعلیٰ درجہ کی عطا ہوئی تھی کہ مشکل سے مشکل مسائل ادنیٰ توجہ میں حل فرما دیتے تھے۔ اس لیے بیرون ہند کے مذکورہ بالا واقعات خصوصاً بلقان، طرابلس کے دل گداز اور ہولناک مظالم اور اندرونِ ہند کی انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں اور شرمناک بربریت، لوٹ کھسوٹ کی فراوانی نے انتہائی درجہ میں مایوس اور مضطرب کر دیا اور آمادہ کر دیا تھا کہ عواقب اور نتائج سے بے نیاز ہو کر میدانِ انقلاب میں سر بکف، کفن بردوش نکل پڑیں، زمانہ کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں، رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور وخوض میں گزرا مگر چونکہ پانی سر سے گزر چکا تھا اس لیے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادر مطلق پر بھروسہ اور اعتماد کر کے کام شروع کر دیا۔

شروع شروع میں بہت زیادہ مشکلات قیاس سے زیادہ سامنے آئیں۔ سخت اور تُند آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا، بادسموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے۔ احباب واقارب مار آستین بن گئے۔ ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بن کر سدِّ راہ بنا اور کیوں نہ

ہوتا۔ انگریز نے اس قدر پیش بندی کر دی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اُٹھانا ۱۸۵۷ء کا سماں باندھتا تھا۔ آزادی اور انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھ لیتا تھا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا! ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برقِ جہاں سوز سے زیادہ تباہ کُن شمار کی جاتی تھی! برطانی تشددات اور مظالم کے ہونے نے اس قدر قلوب اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا۔ خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن پر شبہ کرنا بھی بے دینی سمجھا جا سکتا تھا............ چاروں طرف سی آئی ڈی کا جال بچھا ہوا تھا پھر کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ہم خیال اور ہم زبان یا ہم عمل ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے بھی کان پر ہاتھ رکھتا ہو۔ بہر حال حضرتؒ نے تمام خطرات سے قطع نظر کرنا ضروری سمجھا............ اور اللہ کا نام لے کر اس بحرِ ذخار اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے........ اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھدار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے۔ (ماخوذ: از نقش حیات جلد دوم)

وہ رفقاء اور رجال کار جو براہِ راست حضرت کے تلامذہ تھے اور وہ جو تلامذہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اس جگہ چند مخصوص حضرات کی فہرست پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مالٹا کے رفقاء کار کا مختصر تذکرہ اسارتِ مالٹا کے ضمن میں آجائے گا۔

مختصر فہرست رفقاء ورجالِ کار: (۱) مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری (۲) مولانا نواب محی الدین خاں صاحب فاروقی مراد آبادی قاضی بھوپال (۳) مولانا عبیداللہ صاحب سندھی (۴) مولانا انور شاہ صاحب کشمیری (۵) مولانا احمد علی صاحب لاہوری (۶) مولانا سیف الرحمٰن صاحب (۷) مولانا محمد میاں صاحب عرف محمد منصور انصاری (۸) مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب دین پوری (۹) مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب امروٹی (۱۰) مولانا محمد صادق صاحب (۱۱) مولانا محمد مبین صاحب دیوبندی خطیب انبالہ (۱۲) ظہور

محمد خاں صاحب سہارنپوری (۱۳) مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی (۱۴) مولانا ابومحمد احمد صاحب لاہوری (۱۵) مولانا فضل ربی صاحب (۱۶) مولانا فضل محمود صاحب (۱۷) حاجی ترنگ زئی صاحب (۱۸) خاں عبدالغفار خاں صاحب عرف بادشاہ خاں (۱۹) مولانا ابوالکلام صاحب آزاد (۲۰) حکیم عبدالرزاق صاحب انصاری (۲۱) ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری (۲۲) مولانا محمد علی صاحب جوہر رامپوری (۲۳) پیر رشید اللہ جھنڈے والے (۲۴) محمد علی صاحب قصوری بی.اے. (۲۵) محمد علی صاحب سندھی (۲۶) سید نورالحسن صاحب رتھیڑی

آزادیٔ ہند کا منصوبہ: انگریزوں کے پنجے سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کی رہنمائی میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ایک ایسا منصوبہ تیار کیا تھا کہ اگر بروقت برطانیہ کے جاسوسوں اور خفیہ پولیس کی تحقیقات کی بنا پر اس منصوبے کا انکشاف نہ ہوا ہوتا تو یقیناً برطانیہ کا ہندوستان میں تختہ اُلٹ جاتا۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں تفصیل درکار ہو تو حضرت شیخ الاسلامؒ کی کتاب ''نقشِ حیات'' جلد دوم سے اس کی کما حقہ تفصیل مل جائے گی۔ علاوہ ازیں تحریک شیخ الہندؒ میں بھی اس سلسلے میں بہت کچھ معلومات ملتی ہیں۔

رولٹ کمیٹی رپورٹ میں اس تحریک کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی اس عبارت سے اس تحریک کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ ''اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا کہ یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمالی مغربی سرحدات پر گڑ بڑ پیدا کرنے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش سے اُسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔''

رپورٹ کی اس عبارت میں صرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ چلائی جا رہی تھی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے رپورٹ کے اس جملہ پر تحریر فرمایا ہے: ''اگر فقط مسلمانوں کے لیے یہ منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر سنگھ پرتاب کو صدارت کیوں دی جاتی اور حکومت متوقعہ (ہند) میں غیر مسلم کے

لیے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی؟''

مولانا عبید اللہ سندھیؒ ۱۹۱۵ء میں بحکم حضرت شیخ الہندؒ افغانستان پہنچ گئے تھے اور انھوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ جن میں راجہ مہندر پرتاب اور دیگر مسلم بھی تھے ایک زبردست تحریک چلائی۔ سات سال تک مولانا سندھی کا کابل میں قیام رہا۔ ماسکو، استنبول اور انقرہ (انگورہ) بھی گئے۔ رفقاء نے قیدوبند کے مصائب اُٹھائے اور انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق پیدا کر کے آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں خوب سرگرمی دکھائی۔ منصوبہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو براہِ ایران یاغستان لایا جائے۔ جرمن، ٹرکی فوجوں کے ساتھ افغانستان بھی شریک ہو۔

اور یہ سب مل کر برطانیہ حکومت پر حملہ آور ہوں اور اندرون ملک میں بغاوت پیدا کر دی جائے، یہ راز فاش ہو گیا اور حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز پہنچ کر غالب پاشا گورنر حجاز سے ملاقات کی اور ان سے ایک تحریر حاصل کی جس کو غالب نامہ کہا جاتا ہے۔ نیز انور پاشا اور جمال پاشا سے بھی ملاقات کر کے اس بات پر امادہ کیا کہ وہ آزادیٔ ہند کے لیے اپنی فوج سے مدد دیں۔ اس سلسلے کی جو کوششیں تھیں ان کے راز بھی برطانیہ کے علم میں آ گئے اور اس نے شریف مکہ کو مجبور کیا کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرے۔ چنانچہ ان کو مع رفقاء گرفتار کر کے پہلے جدہ پھر قاہرہ اور سب سے آخر میں مالٹا پہنچایا گیا۔ سوا تین سال تک مالٹا میں نظر بند رہے۔ کل مدت قید و نظر بندی جدہ سے لے کر آخر تک تین سال سات مہینے ہے۔ ہندوستان کو واپسی پانچ سال کے بعد ہوئی۔ کابل میں امیر حبیب اللہ اپنی مصلحت ملکیہ کی بنا پر دل سے اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ برطانیہ سے بگاڑ پیدا کریں۔ ان کے بعد امیر امان اللہ خاں مرحوم سریرآرائے مملکت افغانستان ہوئے۔ امیر امان اللہ خاں نے حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد ایک تقریر فرمائی تھی جس کا ایک جملہ یہ تھا:

''مولانا محمود حسن یک کار را شروع کردند من اورا پورا می کنم۔'' (مولانا سندھیؒ کی ذاتی ڈائری)

حضرت شیخ الہندؒ حجاز کو ستمبر ۱۹۱۵ء میں روانہ ہوئے تھے۔ عدن پہنچ کر آپ نے جو مکتوب گرامی نواب محی الدین خاں قاضی بھوپال کو بھوپال روانہ کیا تھا یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہ مکتوب گرامی مجھے حکیم محمد عمر صاحب مرحوم سے دستیاب ہوا تھا۔

''مطاع معظم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

حضرت سے رخصت ہو کر مع الخیر عدن کے کنارے آ لگا[1]۔ سب رفقاء خیریت سے ہیں۔ مولوی محمد حسن صاحب، مولوی محمد فاروق صاحب اور سب حضرات سے سلام مسنون عرض کر دیجیے۔

مولوی سعید الدین صاحب سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ عرصہ سے ملنا نہیں ہوا۔ ان سے سلام فرمادیں اور فرمادیجیے کہ چلنا ایسے وقت قرار پایا کہ کوئی صورت ملنے کی نہ ہوسکی۔ میرے سب رفقاء سلام عرض کرتے ہیں۔ جناب کو معلوم ہے کہ میرا چلنا ایسی عجلت میں ہوا کہ امور ضروریہ متعلقہ کا بندوبست پورا نہیں کر سکا اور ادھر دل چاہتا ہے کہ ہو سکے تو کچھ دن عرب میں گزار دوں۔ اس لیے جناب میرے امور متعلقہ پر نظر فرما کر اگر کسی ذریعہ سے مجھے اطلاع دے سکیں تو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ میں یہ بات طے کر سکوں کہ عرب میں رہنے کی مجھ کو گنجائش ہے یا مجھ کو جلد واپس ہو کر اپنے متعلقہ امور کی خبر لینی ضروری ہے۔ آپ کی توجہ سے یہ بات حل ہو سکے تو بہتر ہے اور جناب بھی اپنے احوال سے مطلع فرمادیں تو موجب اطمینان

---

[1] گورنر یو. پی. نے مرکزی حکومت کے واسطے سے عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن کو جہاز سے اتار لو مگر تار دینے والے ڈاکٹر انصاری کے آدمی تھے۔ انھوں نے تار دینے میں اتنی تاخیر کر دی کہ جہاز عدن سے روانہ ہو گیا۔ پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا کہ مولانا کو جہاز پر گرفتار کر لو۔ جہاز سے اترنے نہ دو۔ مگر اس وقت گورنمنٹ حجاز کا انتظام یہ تھا کہ جدہ پہنچنے سے پہلے تمام حجاج کو جزیرۂ سعد میں اتار لیا جاتا تھا اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچایا جاتا تھا۔ یہ تار کپتان کو اس وقت ملا جب کہ حضرت شیخ الہندؒ عام حجاج کے ساتھ جزیرۂ سعد میں اتر چکے تھے۔ بہرحال گرفتاری کی کوششیں پیچھے پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہندؒ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آگے آگے اسی طرح محفوظ ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ (اسیران مالٹا بحوالہ نقش حیات) فریدی

ہو۔ عزیر گل سلام کے بعد طالب دعا ہیں مولوی سہول صاحب[۱] کا سلام۔ والسلام فقط

اسیرانِ مالٹا: شیخ الہندؒ کے ہمراہ زندانِ مالٹا میں چار رفقاء تھے۔ جن میں حضرت شیخ الاسلامؒ بھی تھے۔ ان کا تعارف کرانا اس موقع پر چنداں ضروری نہیں ہے۔ ان کی ایک مشہور و معروف شخصیت ہے اور ان پر بہت کچھ لکھے جانے کے بعد بھی بہت کچھ لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ بقیہ تین شخصیتوں کے مختصر احوال یہ ہیں:

(۱) مولانا عزیر گل صاحب: قصبہ زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے خاص خادم ہیں۔ مشن کے ابتدا سے ممبر رہے اور نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقے (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیمہ انھوں نے بہت انجام دی ہیں۔ عموماً حضرت شیخ الہندؒ ان پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کے پاس ان ہی کو بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گزار اور خطرناک راستوں کو قطع کر کے نہایت رازداری اور ہمت و استقلال کے ساتھ یہ بار بار آتے جاتے رہے ہیں۔ پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی صاحب اور علماء سرحد و یاغستان اور دیگر خوانین[۲] کو تحریک کا ممبر بنایا۔ اور ان کے پاس پیغام اور خطوط پہچانا ان کو ہموار کرنا ان کا اور مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا فریضہ تھا جس کو ان دونوں حضرات نے اوقات مختلفہ میں انجام دیا۔ (نقشِ حیات جلد دوم)

بفضلہ تعالیٰ اب بھی بقید حیات[۳] ہیں اور اسیران مالٹا میں صرف یہی شخصیت باقی ہے۔

(۲) مولانا حکیم نصرت حسین صاحب: کوڑہ جہاں آباد، ضلع فتحپور ہسوہ

---

۱ مفتی محمد سہول صاحب بھاگلپوریؒ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور حضرت گنگوہیؒ کے مرید تھے۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ میں بھی ان کا نام آتا ہے۔ ۲ خوانین خان کی جمع ہے۔ (فریدی) ۳ جب یہ مقالہ لکھا گیا تھا تو مولانا عزیر گل صاحب بقید حیات تھے۔ تحریک شیخ الہندؒ کی آخری یادگار مجاہد حریت کا ۱۴/ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ موافق ۱۵/نومبر ۱۹۸۹ء میں اپنے وطن "میاں گاؤں کیل" سخاکوٹ آزاد قبائل پاکستان میں وصال ہو گیا۔ (محب الحق)

ان کا وطن تھا۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب نے دیوبند میں تعلیم پائی تھی اور حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے تھے۔ خاندانی زمیندار تھے اور ایک کامیاب طبیب تھے۔ حج بیت اللہ کے ارادے سے اپنے وطن سے روانہ ہوئے اور ''مکہ معظّمہ'' پہنچے۔ حضرت شیخ الہندؒ پہلے ہی ''مکہ معظّمہ'' پہنچ چکے تھے۔ حکیم صاحب حضرتؒ کے ساتھ ''مکہ معظّمہ'' سے ''مدینہ منورہ'' پہنچے اور حضرتؒ کے ساتھ ہی وہاں اقامت اختیار کر لی۔ بالآخر حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق اسارت مالٹا ہوئے اور ۹ رذی قعدہ ۱۳۳۷ھ کو وفات پائی۔ مالٹا ہی میں قبر ہے۔

(۳) مولانا وحید احمد مدنی: مولانا وحید احمد مدنی ابن سید صدیق احمد مدنی فیض آبادی مہاجر مدینہ شیخ الاسلامؒ کے برادر زادہ تھے۔ آپ بھی اسیرانِ مالٹا میں سے ایک نوجوان اسیر تھے۔ مولانا سید محمد میاں رقم طراز ہیں: (ان کا) حافظہ قوی تھا۔ مالٹا میں اور مالٹا کے علاوہ جن ساتھیوں کے ساتھ رہنا ہوا ان کی زبان سیکھ لیں۔ عربی اور اردو مادری زبانیں تھیں فارسی، انگریزی سبقاً حاصل کیں۔ ترکی، فرانسیسی مالٹا کے مصاحبین سے۔ پشتو، بنگلہ اور کچھ دوسری زبانیں احباب کی مجلسوں میں اس طرح ہفت زبان نہیں بلکہ شاید دہ (دس) زبان ہو گئے تھے۔ اپنے آبائی وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ۴۵ سال کی عمر میں ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا۔ (ماخوذ از اسیرانِ مالٹا) مولانا فرید الوحیدی، مولانا ڈاکٹر رشید الوحیدی اور ڈاکٹر سعید الوحیدی آپ کے فرزند ہیں۔

مالٹا میں حضرت شیخ الہندؒ کے مشاغل حضرت شیخ الاسلامؒ کے قلم سے:

(۱) جملہ رفقاء بخیریت ہیں حضرت مولانا دام مجدہم خارق العادت استقامت کے ساتھ نہایت صابر و شاکر ہیں۔ اشغال و اوراد میں مشغول رہتے ہیں۔ ایسی تنہائی کہاں ملی تھی۔ (یکم صفر ۱۳۳۷ھ)

(۲) مولانا دام مجدہم بھی مرضیِ مولیٰ میں خوش و خرم شاکر و صابر ہیں۔ باطنی مشغولی نہایت بڑھ گئی ہے۔ ترجمہ ختم ہو گیا ہے۔ نظر ثانی فرما رہے ہیں۔ حاشیہ یعنی فوائد کو بوجہ نہ

ہونے کتب تفسیر کے موخر فرمایا ہے۔ اس وقت ماہِ رمضان میں احقر روزانہ ڈھائی پارے نوافل میں سناتا ہے اور ایک شخص مصری حافظ ڈیڑھ پارہ پڑھتے ہیں۔ تراویح بوجہ اور لوگوں کے سورت کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہم سب بہر حال صابر و شاکر ہیں خوش ہیں ''مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ''۔ (۳؍رمضان ۱۳۳۷ھ)

(۳) ہم کو اپنی آزادی (رہائی) کی ابھی تک کوئی خبر معلوم نہیں۔ عموماً اُسراء (قیدیوں) کو سرکاری طور پر آزادی کی خبر دی جا چکی ہے۔ فقط آ گبوٹ کا انتظار ہے۔ مولانا دامت برکاتہم بخیر و عافیت ہیں۔ وہ اور مولوی عزیر گل و وحید سلام کہتے ہیں۔ (۲۰؍محرم ۱۳۳۸ھ)

(۴) مولانا دامت برکاتہم بخیر و عافیت ہیں سلام مسنون فرماتے ہیں۔ تراجم ابواب بخاری شریف کے متعلق مختصر یادداشت خود ہی تحریر فرمایا کرتے ہیں۔ (۲۱؍شعبان ۱۳۳۸ھ)

یہ چاروں اقتباسات مکتوبات حضرت شیخ الاسلام جلد ثانی سے لیے گئے ہیں۔ چاروں مکتوب حضرت شیخ الاسلامؒ نے مالٹا سے حافظ زاہد حسن صاحب امروہیؒ کے نام بھیجے ہیں۔

مالٹا سے واپسی: ۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نقش حیات جلد دوم میں ارقام فرماتے ہیں:

''۲۲؍جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً تین برس دو مہینے مالٹا میں رہ کر ہم مالٹا سے روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت رخصت کرنے کے لیے تمام ترکی آفیسر (جو کہ اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے) صدر اعظم ترکی سے لے کر نیچے کے عہدوں تک سب کے سب خود جمع ہو گئے اور بہت زیادہ محبت و شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور سے ہاتھ اُٹھا کر آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور تمام آفیسروں نے ان کی موافقت کی۔ آمین آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہات تپاک سے آب دیدہ ہو کر رخصت کیا۔ یہ مجمع اور سماں نہایت عجیب و غریب تھا۔ بہت سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹا سے اس سے پہلے روانہ ہوئے مگر ایسا بڑا مجمع اور اتنے بڑے رُتبوں والوں کا اجتماع اور اتنی محبت و اخلاص کا مظاہرہ اور اس ہیئت دعائیہ اور آمین کا اظہار

کسی کے لیے نہیں ہوا تھا۔ انگریزی آفیسر بہت سے وہاں موجود تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کرتے تھے۔

۲۵؍جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵؍مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہنچا اور ۲۶؍جمادی الثانی سیدی بشر میں جو کہ قرارگاہ اُسراءِ مصر میں تھا داخل کر دیے گئے۔ تقریباً ۱۸ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳؍رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۲؍اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کیے گئے۔ سویس میں بھی ہم سنگینوں کے پہرے میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کیے گئے۔ یہاں پونے دو مہینے کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۵؍رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲؍مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہنچایا گیا۔ ۱۲؍رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا۔ ۲۰؍رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸؍جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔ بارش اور طوفان کی وجہ سے حضرت شیخ الہندؒ ۲۱؍رمضان کو جہاز سے اُتر سکے۔

مولانا شوکت علی اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کمیٹی نے زوردار استقبال کیا اور نعرہ ہائے تکبیر سے فضا گونجا دیا اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کار میں سوار کر کے اپنی قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تھے لے گئے... مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام کھتری مسجد میں جلسۂ عام کیا گیا۔ اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا..... بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت سے گفتگو کی.... ۲۳ اور ۲۴؍رمضان کی درمیانی شب میں ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے اور ۲۵؍رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۳؍جون ۱۹۲۰ء) کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶؍رمضان کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچ گئے......

دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، مظفر نگر، دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا عوام کو زیارت کرانے کے لیے لوگوں کو سروں پر اُٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے اور انگشت بدنداں تھے۔

حضرت کی مالٹا سے واپسی پر مدینہ اخبار بجنور کی ۱۳ر جون ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں یہ خبر درج ہے:

''حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا سے واپسی ہوئی تو بمبئی میں استقبال کے لیے ایک بڑی جماعت پہنچی تھی جن میں مولانا حافظ محمد احمد صاحب قاسمی، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی، اور مولانا شوکت علی صاحب، مولانا حسرت موہانی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں[1]۔''

حضرت کی آمد پر مولانا مظہرالاسلام مدرس ہائی اسکول رہتک کی ایک نظم ۱۳ر جون ۱۹۲۰ء کو مدینہ[2] بجنور میں شائع ہوئی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

آئے شیخ الہند ہو تجھکو مبارک دیوبند ☆ خوش ہو کنعاں لوٹ کر یوسف ترا آیا ہے آج
ہیں حسین احمد، وحید احمد، عزیز گل بھی ساتھ ☆ ساتھ ساتھ اک قافلہ کا قافلہ آیا ہے آج
وہ محدث وہ جہاں استاد محمود حسن! ☆ یعنی شیخ الہند اسیر مالٹا آیا ہے آج
ڈھونڈھتا تھا جس کو شمع مہر و مہ لیکر فلک ☆ لعل اس کے ہاتھ وہ کھویا ہوا آیا ہے آج

---

[1] شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نقش حیات جلد دوم ص ۲۳۶ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ان حضرات کی فہرست جنھوں نے دور دراز سے بمبئی پہنچ کر پورٹ پر حضرتؒ کا استقبال کیا بہت طویل ہے۔ خاص خاص اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت مولانا حافظ محمد احمد مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند مع صاحبزادگان، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری مرحوم، جناب حکیم محمد حسن مرحوم برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمد حنیف مرحوم خواہرزادہ و داماد حضرت شیخ الہندؒ، حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر کلاں ڈاکٹر انصاری مرحوم، نواب محی الدین خاں فاروقی مرادآبادی قاضی بھوپال مرحوم، مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم مہتمم و صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی، ڈاکٹر مختار احمد عرف ڈاکٹر انصاری مرحوم (فریدی)

[2] یہ ہفت روزہ اخبار مدینہ بجنور کے نام سے مشہور و معروف تھا اور آزادی میں بڑا اہم کام کیا۔ اس کے مالک منشی مجید حسن بجنوری تھے۔ قاضی عدیل عباسی بستوی اور بہت سے اہل قلم نے اس اخبار کی ادارت کی خدمت انجام دی اور مجید حسن صاحب مرحوم ہی نے حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ قرآن پہلی مرتبہ مدینہ پریس سے شائع کرایا (محب الحق)

مدینہ، ۷؍شوال ۱۳۳۸ھ یوم جمعہ کے اداریے میں مرقوم ہے۔

''اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) کے مریدین اور شاگردوں کی دعا آخر کار مقبول ہوئی... حضرت خیریت سے دیوبند پہنچ گئے جہاں لوگ کثرت سے زیارت کے لیے ہر جگہ سے آرہے ہیں اور دیوبند اس وقت مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ حضرت مولانا کے رفقاء بھی بخیریت حضرت کے ہمراہ دیوبند پہنچ گئے ہیں لیکن سخت افسوس اور حسرت کا مقام ہے کہ ایک رفیق اس وقت ساتھ نہیں (یعنی) جناب مولوی نصرت حسین صاحب مرحوم ومغفور زمیندار کوڑہ جہاں آباد ضلع فتح پور ہسوہ[1] جو حضرت کے مالٹا میں رفیق اسیری تھے وہیں علیل ہوئے اور آخر کار انتقال فرمایا اور مالٹا کے اس مقبرے میں ان کا جسم مبارک سپردخاک کیا گیا جو سلاطین عثمانیہ کے زمانہ میں وہاں تیار کیا گیا تھا۔ سنا گیا ہے کہ حضرت والا کا یہ ارادہ تھا کہ بمبئی سے براہِ راست اپنے مرحوم رفیق کے وطن پہنچ کر ان کی والدہ ماجدہ اور اہلیہ محترمہ سے تعزیت فرمائیں لیکن جو حضرات (دیوبند) بغرض استقبال بمبئی پہنچ گئے تھے۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر حضرت پیشتر دیوبند تشریف لے آئے اب چونکہ ہر مقام سے اصحاب کثرت سے بغرض زیارت تشریف لارہے ہیں اس لیے یہ ارادہ ہے کہ ۱۰؍شوال المکرّم کو حضرت فتح پور تشریف لے جائیں۔ سنا گیا ہے کہ واپسی کے وقت مرادآباد، بجنور کو بھی حضرت اپنے قدوم میمنت لزوم سے مفتخر فرمائیں گے۔ مالٹا اور مصر میں پانچ سال بحیثیت اسیر جنگی قیام فرما کر حضرت تشریف لائے اور سن مبارک ۸۰؍سال کے قریب ہے۔ دیوبند میں تشریف آوری کے پہلے روز بیس پارے تراویح میں سنے اور اس رمضان مبارک میں حضرت کے ۳۱ روزہ ہوئے کیونکہ مصر میں بدھ کو پہلا روزہ ہوا۔ آج کل مہمانوں کی خاطر مدارات، ملاقات اور سفر کی وجہ سے حضرت مولانا کو مطلق فرصت نہیں۔

[1] حضرت شیخ الہندؒ نے ہمشیرہ عبدالقادر یعنی حکیم محمد صدیق صاحب قاسمی مرادآبادی کے نام جو مکتوب گرامی ۱۸؍جون ۱۹۲۰ء کو لکھا ہے اس میں ارقام فرماتے ہیں۔ عید کی دوسری تاریخ کو فتح پور جانے کی ضرورت تھی اس لیے عزم کرتا ہوں وہاں سے فارغ ہو کر دیوبند آجاؤں۔ (فریدی)

مسلمانانِ میرٹھ نے حضرت شیخ الہند کو سلسلہ آمد کی خوشی میں تہنیت نامہ بھیجا تو اس کے جواب میں حضرت نے ارقام فرمایا:

''بعدہٗ حمد و صلاۃ، بندۂ ضعیف و ناچیز اپنے برادران کی خدمت میں نیازمندانہ عرض کرتا ہے کہ آپ حضرات نے جو سچی توجہ اور شفقت اس ناچیز کے حال پر غائبانہ و حاضرانہ وقتاً فوقتاً ظاہر اور بیان فرمائی ہیں وہ اس قابل ہرگز نہیں کہ میں اس کا شکریہ زبانی ادا کر کے سبکدوش ہوسکوں، حق سبحانہ وتعالیٰ اس کا نعم البدل دارین میں آپ کو عطا فرمائے، جو تکالیف کہ اس عرصہ میں بندۂ حقیر کو اور میرے مخلص رفقاء کو پیش آئیں وہ اول تو مقدرات الٰہیہ تھیں جو ہم غرباء بلکہ عالم کی آفرینش سے پہلے مقرر ہو چکی تھیں۔ دوسرے ارشاد بعض اکابر کہ: ''بحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے'' میری تسکین کے لیے ایک مضبوط ذریعہ تھا۔ تیسرے جو تکلیف کہ گزر چکی اس کے یاد کرنے کی ضرورت نہ حاجت۔ بقول غالب ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ ☆ خدا سے کیا ستم و جَور ناخدا کہیے

چہارم آپ حضرات مکرمین نے جو اپنے قدوم سے ہم ناچیز بندوں کی عزت افزائی کی وہ سب تکالیف کا پورا کفارہ ہے۔ بایں وجوہ آپ حضرات کو کسی امر پر ملال نہیں ہونا چاہیے۔ والحمدللہ..... اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً. (۱۳/جون ۱۹۲۰ء مدینہ بجنور)

مالٹا سے واپسی پر حضرت شیخ الہندؒ کو سندھ کانفرنس حیدر آباد سندھ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس بارے میں مدینہ اخبار ۲۵/جولائی ۱۹۲۰ء میں یہ تحریر شائع ہوئی کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اس امر پر اظہار تاسف کرتے ہیں کہ وہ سندھ خلافت کانفرنس حیدر آباد سندھ میں شریک نہ ہوسکیں گے۔ ان کے گھر میں (اہلیہ محترمہ) سخت علیل ہیں۔ لیکن مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے شریک جلسہ ہونے کی امید واثق ہے۔

اخبار مدینہ بجنور کو بتاریخ ۳۱/جولائی ۱۹۲۰ء بمبئی سے مولانا شوکت علی کی یہ تحریر وصول ہوئی:

مشہورِ آفاق عالم دین و ماہرِ دینیات مولانا محمود حسن صاب دیو بندی نے جو حال ہی میں پانچ سال کی نظر بندی کے بعد مالٹا سے واپس تشریف لائے ہیں خلافت اور ترکِ موالات کے متعلق جس کی تحریک مرکزی خلافت کمیٹی نے کی ہے حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمایا ہے:

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرمِ ضعیف ☆ آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

آج جب کہ شرق و غرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جب کہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امنڈتے ہوئے طوفانوں کی موجوں سے ٹکرا کر خدانخواستہ پاش پاش ہو جائے۔ جب کہ ہر فردِ مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے۔ بلکہ اگر عافیت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی حریت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرے کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو مسلم ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پائمال نہ ہونے دے۔ جو فرد، شرعی، قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے اس کے ادا کرنے میں ذرہ برابر تقصیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے۔ میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لیے کسی ایسی مفید تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کے فوز و فلاح سے ہو یا وہ دشمنانِ اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔ مالٹا سے واپس آ کر مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بست و کشاد نے آخری طریقہ کار اپنے فرائض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا یہ قرار دیا ہے کہ وہ قرآن حکیم کی ایک صریح تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع و ضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف و خطر انجام تک

پہنچائیں اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون وموالات کو اعتقاداً وعملاً ترک کردیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت نا قابل انکار ہے اور صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ وہ (۱) سرکاری اعزازوں اور سرکاری خطابوں کو واپس کر دے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے (۳) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے، اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کرے بشرطیکہ (۱) اتباع احکام شریعت کی جائے اور عمل درآمد میں خلاف شرع حکم کا ارتکاب پیش نہ آئے (۲) نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقض امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال مد نظر رہے (۳) ارشاد عثمانی: ''اِذَا اَحْسَنَ النَّاسُ فَاَحْسِنْ مَعَهُمْ وَ اِذَا اَسَاءَ فَاجْتَنِبْ اِسَاءَ تَهُمْ'' (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے کام میں شریک رہو اور جو برا کام کریں تو برائی سے پرہیز کرو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جاوے۔ واللہ الموفق والمعین۔

اخبار مدینہ بجنور اگست ۱۹۲۰ء کے ایک پرچہ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ: حضرت مولانا محمود حسن کی زوجہ محترمہ کا انتقال بروز سہ شنبہ ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۳ اگست ۱۹۲۰ء کو ہوا۔

اخبار مدینہ بجنور یکم ستمبر ۱۹۲۰ء کے شمارے میں یہ خبر شائع ہوئی کہ: مولانا محمود حسن صاحب مدظلہ خلافت کانفرنس کے آئندہ اجلاس کلکتہ میں تشریف لائیں گے اور اس اجلاس کی صدارت بھی فرمائیں گے۔

خلافت کانفرنس کلکتہ کے اجلاس میں جو ۵ ستمبر ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا مسٹر شوکت علی نے ایک مختصر تقریر میں حاضرین کو بتایا کہ مولانا محمود حسن صاحب جن کو اس جلسہ کا صدر منتخب کیا گیا تھا اپنی علالت اور پیرانہ سالی کی نقاہت کے باعث رونق افروز نہیں ہو سکے جس کا ہم کو سخت افسوس ہے لیکن مولانا نے اپنے دو رفقاء کو ایک خط دے کر روانہ کیا ہے ان میں ایک

مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری ہیں۔ اس کے بعد مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری نے چند مناسب الفاظ کے ساتھ مولانا کا خط پڑھ کر سنایا۔ وھو ھٰذا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! بندۂ ناچیز وضعیف اپنے مکرمین ومخلصین حضرات کی خدمت میں تسلیماتِ مسنونہ کے بعد ملتمس ہے: سب سے پہلے یہ عاجز آپ حضرات کی ان مساعی جمیلہ کا شکریہ واجب سمجھتا ہے جن کو آپ حضرات اپنی لگاتار کوششوں سے اپنے ملک اور قوم کی بہبودی کے لیے بے دریغ مبذول فرمارہے ہیں اور سوتے ہوؤں کو خواب غفلت سے جگاجگا کر اور کمزوروں کو چونکا چونکا کر مفید باتیں دکھا اور سنا رہے ہیں۔ فَجَزَاکُمُ اللّٰہُ عَنَّا اَحْسَنَ الْجَزَاءِ وَاَفْضَلَ الْجَزَاءِ.

اس وقت تمام ملک میں جو آثار بیداری کہیں زیادہ کہیں کم نظر آتے ہیں وہ آپ ہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے اور آپ ہی کی جان توڑ مسلسل محنت اور ہمت کا ثمرہ ہے۔ ''اللھم زِدْ فَزِد'' اس کے بعد یہ عرض ہے کہ آپ حضرات نے جو اس ناتواں وناکارہ کو یاد فرما کر عزت واکرام کے ساتھ مکرر، سہ کرّر اپنی شرکت سراسر برکت کے لیے طلب فرمایا اس کا جواب بجز لبیک کے کچھ نہ تھا۔ مگر کیا کروں ہجوم عوارض اور کمزوری طبیعت ایسی سدّ راہ ہوئی کہ باوجود عزم واشتیاق شرکت کسی طرح حرکت نہ کرسکا اور افسوس کے ساتھ آپ حضرات کی تعمیل سے بالکل قاصر رہا۔ آپ کے اخلاق کریمانہ سے بوجہ اپنی معذوریٔ قویٰ کے معافی کا مستحق ہوں، اب بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ آپ کی نیّات ومساعی میں برکت عطا فرماوے اور اہل اسلام اور تمام ملک کو اس کی خیر وبرکت سے مستفیض کرے، یہ دور افتادہ باوجود ضعف وناتجربہ کاری آپ کی ہمدردی وشرکت میں باذن اللہ ہرگز قاصر نہیں۔ فالحمدللہ! یہ ضرور ہے کہ ترک موالات وغیرہ جملہ امور میں انجام بینی اور احتیاط سے کام لیا جائے۔ کسی جوش اور جذبہ کی اتباع بغیر تامل ومشورہ کے ہرگز نہ کی جاوے۔ واللہ الموفق والمعین۔

بندہ محمود عفی عنہ ۱۸؍ذی الحجہ یوم جمعہ (اخبار مدینہ بجنور ۱۳؍ستمبر ۱۹۲۰ء)

علی گڑھ کالج خلافت کمیٹی کی ایک عرضداشت کے جواب میں حضرت شیخ الہندؒ نے یہ ارقام فرمایا:

''میں آج کل بیمار ہوں اس لیے مفصل جواب نہیں دے سکتا۔ ۲۹/ اکتوبر سے پہلے پہلے عدم تعاون کی کامل تائید میں مفصل جواب عرض کروں گا۔ مختصر یہ ہے کہ ہر ایک فرزند اسلام کو اپنی تمام طاقت وقوت سے عدم تعاون کی تائید کرنی چاہیے۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار پہلے ہی کر دیا ہے، میں اب بھی عدم تعاون اختیار کرنے پر زور دیتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ برادرانِ اسلام اتحاد واتفاق اور اخوت ویگانگت کو ہاتھ سے نہ دیں گے تا کہ اعداء اسلام کو ہمارے نفاق سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع نہ ملے اور آپ اس طرح سے ذلیل ورسوانہ ہوں۔ (دستخط محمود) ۲۸/ اکتوبر ۱۹۲۰ء مدینہ بجنور

جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد:۔ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے جب ہندوستان آئے تو خلافت کا بڑا زور شور تھا۔ ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریک بڑے پیمانے پر چل رہی تھی۔ خلافت کمیٹی کے رہنماؤں اور ملی سربراہوں کا یہ فیصلہ ہوا کہ ایک آزاد نیشنل کالج قائم کیا جائے۔ بالآخر علیگڑھ میں ایسے ادارے کا قیام مناسب سمجھا گیا اور اس ادارہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کو تجویز کیا گیا۔ حضرتؒ نے بعد نمازِ جمعہ ۱۶/صفر ۱۳۳۹ھ کو سنگ بنیاد رکھا۔ اس وقت آپ سخت علیل تھے۔ بہ دقت علیگڑھ تک سفر کر سکے تھے۔ آپ کے خطبۂ صدارت کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ یہ خطبہ اپنے مضامین کے لحاظ سے دیدنی وشنیدنی ہے۔ اس خطبہ میں یہ چند جملے بہت زیادہ وجدانگیز اہم اور بصیرت افروز ہیں:

''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرمارہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اُٹھو اور اس امت

مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچالو تو ان کے دلوں پر خوف ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا۔ حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاع قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

اس کے بعد چند آیات تحریر فرمائی ہیں جن میں دنیا کی حقارت اور آخرت کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ بعدہٗ تحریر فرمایا اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علیگڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علیگڑھ) کا رشتہ جوڑا کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف فرمائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علیگڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علیگڑھ میری طرف آیا ہے"۔ (خطبۂ صدارت جلسۂ افتتاح جامعہ ملیہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اپنے رسالہ "جامعہ کے پچیس سال" میں اس جلسہ افتتاحیہ کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ یہ جلسہ مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں منعقد کیا گیا تھا۔ حاضرین کی جس میں عوام وخواص سب شامل تھے ایک بڑی تعداد تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ جامع مسجد کی ایک دیوار سے سہارا لگائے بیٹھے تھے اور علالت ونقاہت حد درجہ کی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس موقع کی تصویر کشی اپنے دل آویز الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

"۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم ومغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دار العلوم کی جامع مسجد میں اس کام کا افتتاح ہوا۔ مجھے وہ وقت یاد

ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب علیگڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس قید، جلا وطنی، علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگر چہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مَردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کرسکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔

صاحبو! یاد رہے کہ وہ (درحقیقت) جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ میں یعنی عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔

برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام: نقش حیات جلد دوم ص ۲۵۶ پر حضرت شیخ الاسلام تحریر فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تقاضا تھا کہ حضرتؒ کو دہلی لے جایا جائے تا کہ میں پوری توجہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل الرائے سے بھی مشورہ کرسکوں مگر چونکہ علیگڑھ کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں اس لیے قرار پایا کہ علیگڑھ کے جلسے سے فارغ ہو کر براہِ راست دہلی روانہ ہو جائیں گے اور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمائیں گے۔ چنانچہ حضرتؒ کی واپسی علیگڑھ سے براہِ راست دہلی کو ہوئی اور ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے علاج جاری فرمایا، بالآخر ۷ ربجے صبح کے بعد ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ مطابق ۳۰ رنومبر ۱۹۲۰ء کو بہت تغیر ہو گیا۔ اسی تاریخ کو استغراق اور ذکر لسانی میں مشغول رہ کر رفیق اعلیٰ سے

جا[1] ملے۔ نصف گھنٹہ کے بعد منزل اول قبر کا فکر ہوا۔ یہ رائے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا چاہیے، دیوبند کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مضمون کا تار روانہ کیا کہ حضرت کی وفات ہوگئی۔ جنازہ شام کو دیوبند پہنچے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اطلاع دینے، کفن، تابوت اور ریل کے انتظام میں مصروف ہوئے۔ اِدھر خدام نے غسل کا انتظام کیا۔ حکیم محمد حسن صاحب نے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا اور کفن پہنا کر تابوت میں رکھا جو کہ نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کرایا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہوگئے۔

دہلی میں آناً فاناً وفات کی خبر مشہور ہوگئی، مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی دوکانیں فوراً بند کر دیں۔ ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ کے متقاضی ہوئے۔ حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرتؒ نے فرمایا: کہ تم لوگوں کی خواہش اور اصرار ہے تو تم نمازِ جنازہ پڑھ لو، میں شریک نہ ہوں گا تاکہ بعد کو نماز کے دہرانے کا اختیار رہے اور میں دیوبند میں پھر نماز اعزاء و اقارب کے ساتھ پڑھ سکوں؛ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے ایک مرتبہ بہت بڑے مجمعے کے ساتھ نماز ادا کی گئی۔ اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا لوگ بڑھتے جاتے تھے اندازہ کیا جاتا تھا اسٹیشن کے

---

[1] وفات سے ایک عشرہ پہلے جمعیۃ علماء مرکزیہ کا دوسرا سالانہ اجلاس دہلی میں ہوا اس کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کو منتخب کیا گیا تھا اور حضرت نے اس صدارت کو منظور بھی کر لیا تھا۔ اجلاس کی تاریخیں بھی خود مقرر فرمائی تھیں مگر بوجہ شدت علالت اجلاس میں شرکت نہ ہو سکی۔ حضرتؒ نے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو تحریر خطبہ صدارت پر مامور فرمایا اور مضامین ضروریہ ذکر فرما دئے۔ چنانچہ مفتی صاحبؒ نے مسودہ تحریر فرما کر حضرتؒ کو سنایا۔ بعض ضروری اصلاحات و ترمیم کے بعد حضرتؒ نے اس کے چھپوانے کا حکم صادر فرمایا۔ جلسہ میں خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اگرچہ اپنی حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے مگر علماء ملت کی یہی آرزو تھی کہ جمعیۃ علماء حضرت شیخ الہندؒ کی صدارت کا امتیاز حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کرے جس پر کار بند ہو کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ (ماخوذ از نقشِ حیات جلد دوم) فریدی)

قریب پہنچ کر بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ وہاں پھر دوسری دفعہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ ڈھائی بجے کے بعد دہلی سے وہ گاڑی جس میں تابوت تھا روانہ ہوئی۔ پھر میرٹھ شہر اور چھاؤنی میرٹھ پر نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا۔ اژدہام نہایت عظیم الشان تھا، بمشکل تمام جنازہ اسٹیشن سے نکلا اور بہت دیر میں مکان پر پہنچا۔

جنازہ نماز صبح کے بعد دارالعلوم میں پہنچایا گیا نو درہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، بمشکل تمام صف بندی ہوئی اور حضرتؒ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب جنھوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی بقلب مضطر و چشم تر نمازِ جنازہ پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک پُر کیف سکوت طاری تھا۔ چاشت کا وقت تھا ۹ بجے تھے کہ حضرتؒ کو لحد میں اُتار دیا گیا۔ ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا:

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو ☆ گنجینہ علوم ہے یہ گنج زر نہیں!

انالله و انااليه راجعون!

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کا سانحہ ایک نہایت ہی دل گداز اور المناک سانحہ تھا۔ ابھی مالٹا سے آئے ہوئے تقریباً چھ ماہ ہوئے تھے کہ یہ حادثہ جانکاہ پیش آیا، تمام اہل ملک عموماً اور مسلمانان عالم خصوصاً اس سے متاثر ہوئے، مدینہ اخبار بجنور اور ہمدم دہلی وغیرہ نے جو مرثیے اور قطعات تاریخ وفات شائع کیے ان میں سے چند یہ ہیں۔ مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مدرس دارالعلوم دیوبند کے قطعہ تاریخ وفات کے چند اشعار یہ ہیں:

دور تھا ساغر تحدیث کا ہر شام و پگاہ ☆ واہ واہ صل علی شُرب مُدام محمود
ان کے شاگرد ہیں پھیلے ہوئے دنیا بھر میں ☆ واقعی زندۂ جاوید ہے نام محمود
بولتے کچھ نہیں اور لب پہ تبسم ہے عیاں ☆ موت ہے؟ یقظہ ہے؟ یا ہے یہ منامِ محمود
سالِ رحلت یہ ہوا غیب سے دل میں القاء ☆ خلد اعلیٰ طرب افزا ہے مقام محمود

۱۳ ھ ۳۹

جناب نورالحسن ذہین کرت پوری نے ایک طویل مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

حرمان و رنج و حسرت و غم کا ہجوم ہے ☆ جو فخر دیوبند تھا وہ چل بسا ہے آج
یہ ذات تھی کہ زینت دارالحدیث تھی ☆ در مدرسہ کا دیدۂ حسرت بنا ہے آج
دنیا میں آج کس لیے شور نشور ہے ☆ محمود حسن جہان سے کیا چل بسا ہے آج

(مدینہ بجنور)

مولانا حکیم عبدالعزیز ملک نوساروی شاگرد حضرت شفق امروہوی لکھتے ہیں:

عالم خوش سیر کی رحلت سے ☆ آج وقف خزاں ہے باغ ہند
غیب سے آرہی ہے یہ آواز ☆ ہائے اب بجھ گیا چراغ ہند
۱۳ ھ ۳۹

مولانا ناصر دہلوی لکھتے ہیں:

کیا سبب ہے اہل علم و فضل کیوں مغموم ہیں ☆ کس لیے ہندوستان پر یہ اُداسی چھا گئی
اس قدر غم اہل دنیا کو نہ ہوتا تھا کبھی ☆ جانے کو دنیا سے یوں تو آخر اک دنیا گئی
غم یہ شاید ہے وصالِ حضرت محمود کا ☆ ہر ادا جن کی دلوں کو اہل دیں کے بھا گئی
درحقیقت یہ الم دلدوز ہے جانکا ہے ☆ واقعی اس غم سے دنیا میں قیامت آ گئی
جاں نثارِ ملک ہے اب ملک کی حالت خراب ☆ ناخدائے قوم! اب کشتی بھنور میں آ گئی
دیکھتے ہیں اب بھی ہم پرتو فگن جلوے ترے ☆ اے کہ تیری زیست موتی صدق کے برسا گئی
اب بھی جاری ہے جہاں میں فیض روحانی ترا ☆ اے کہ تیری یاد میری روح کو تڑپا گئی
ہے تسلی کے لیے کافی ترا نقش قدم ☆ اے تری ذاتِ گرامی ذوق حق پھیلا گئی
ایک ناصر ہی نہیں اس حادثہ میں مبتلا ☆ ہر مسلماں پر گھٹا اندوہ و غم کی چھا گئی

(۲۱ر دسمبر ۱۹۲۰ء مدینہ بجنور)

رسالہ ''ہمدم دہلی'' میں چودھری حافظ محمد مختار احمد خاں صاحب متین سیوہاروی کا

یہ قطعہ شائع ہوا:

رحلت کرد آں فخرِ عالم ☆ ارض و سما شد صرفِ ماتم
گفتم سالش از آزادی ☆ فوت العالِم فوت العالَم

(ہمدم ۲۰/جنوری ۱۹۲۱ء) ۱۳۳۹ھ

طالب گورکھپوری نے تاریخ وفات اس طرح کہی:

سالِ رحلت چوں جستم اے طالب ☆ گفت ہاتف، برفت در جنت

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا سے روانہ کیے ہوئے چند مکاتیب پیش کر دیے جائیں۔ یہ مکاتیب ایک عظیم شخصیت کی نسبت کی وجہ سے بڑی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں پانچ خطوط درج کیے جاتے ہیں، ان میں پہلا خط حکیم محمد حسن کے نام ہے جو حضرت شیخ الہندؒ کے برادر خورد تھے۔ دوسرا خط مولانا نواب محی الدین خاں صاحب فاروقی مرادآبادی کے نام ہے، تیسرا اور چوتھا خط حافظ زاہد حسن امروہی کے نام[1] ہے، آخری خط حضرت شیخ الہند کے دونواسوں کے نام ہے یعنی مولانا محمد رفیع صاحب عرف بھولو ابن مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی استاذ اعلیٰ مدرسہ عبدالرب دہلی اور مولانا محمد عثمان سابق چیئرمین دیوبند و مدرس و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ابن مولانا محمد حنیف صاحب دیوبندی خواہرزادہ و داماد حضرت شیخ الہندؒ۔ یہ مکتوب گرامی دونوں نواسوں کے نام مشترک طور پر مدرسہ کے پتے پر دیوبند بھیجا گیا پھر روابط کی بنا پر یہ مکتوب حکیم محمد صدیق صاحبؒ کے پاس پہنچا ہے۔ وہیں سے اس کو میں نے حاصل کیا۔ پہلے اس خط کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے ایک ٹکڑا امرادآباد میں حکیم محمد عمر صاحب صدیقی نبیرۂ حکیم محمد صدیق صاحب کے پاس تھا اور دوسرا ان کے بھائی پروفیسر محمد عثمان صاحب[2] صدیقی کے پاس تھا جو علیگڑھ میں

۱؎ نواب محی الدین خاں فاروقی مرادآبادی اور حافظ زاہد حسن امروہی کے نام خط مقالاتِ فریدی جلد اول تبرکات اور آثار شیخ الہندؒ کے عنوان میں ملاحظہ کریں۔ ۲؎ جب یہ مقالہ لکھا گیا تھا تو محمد عثمان صاحب بقید حیات تھے۔ ۲۲/جون ۱۹۸۶ء میں آپ کا وصال ہوا۔ (محب الحق)

مقیم ہیں۔ مجھے ایک جگہ سے آدھے ٹکڑے کی نقل ملی اور دوسری جگہ سے آدھے خط کا عکس دستیاب ہوا۔ پھر دونوں ٹکڑے جب علیگڑھ میں جمع ہو گئے تو میں نے پورے خط کا عکس لیا۔ ان خطوط کے علاوہ بھی مالٹا سے آئے ہوئے بہت سے خطوط کوشش سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

(۱) حکیم محمد حسن صاحب دیوبندی برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ کے نام:

الحمدللہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین

اخ معظم اکرمکم اللہ وسلّم

کل انتظار مزید کے بعد آپ کا خط ساتویں جمادی الاولیٰ کو لکھا ہوا ہم کو مالٹا میں ملا۔ سب کی خیریت مجمل معلوم ہو کر مسرت ہوئی۔ الحمدللہ عزیز مسعود کے بعد چھ ماہ میں آپ کا خط آیا بہت غنیمت معلوم ہوا۔ بقول ذوق دہلویؒ:

یوں اسیرانِ قفس تک کوئی پہنچا گلبرگ ☆ جیسے غربت میں شفیقانِ وطن کا کاغذ

چند خطوط اور بھی بعض رفقاء نے روانہ کیے ہیں، غالباً پہنچے ہوں گے۔ بالجملہ ہم سب خیریت سے ہیں اور راحت سے ہیں، آپ کو خط لکھنے کے پندرہ بیس روز بعد یہ ہوا کہ ہم لوگ مصر سے کچھ ترقی کر کے مالٹا آ گئے۔ مسافت تو کچھ بڑھ گئی مگر تکلیف کچھ نہیں بلکہ یہاں راحت زیادہ ہے۔ الحمدللہ! گو اس عرصہ میں حالات وطن سے بے خبری رہی مگر دور و دراز کے وہ حالات معلوم ہوئے جو خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ آدمی جب تک زندہ ہے حرکت زمانی تو کسی وقت رکتی نہیں مگر حرکت زمانی اور مکانی دونوں مل کر بہت سے انکشافات جدیدہ کی موجب ہو گئیں۔

سَتُبۡدِیۡ لَکَ الۡاَیَّامُ مَا کُنۡتَ جَاهِلاً ☆ وَ یَأۡتِیۡکَ بِالۡاَخۡبَارِ مَنۡ لَمۡ تُزَوِّدِ

ترجمہ: عنقریب زمانہ تم پر بہت سی نامعلوم باتیں ظاہر کر دیگا اور تجھے وہ شخص خبر دیگا جسے تو نے کوئی توشہ اور اجرت نہیں دی۔

متعدد اسباق و دیگر مشاغل میں اچھی طرح گزر رہی ہے۔ اِدھر "وَتَرۡجُوۡنَ مِنَ

اللہِ مَا لَا یَرْجُوْنَ" کا مبارک سلسلہ بھی ایسا نہیں کہ جو کسی وقت منقطع ہو جائے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ گھر میں سب کو اور مکان میں بچوں کو سلام کہہ دینا۔ فقط والسلام بندہ محمود عفی عنہ ۲۲۱۹ء

(۲) مولانا محمد رفیع عرف بھولو و مولانا محمد عثمان کے نام:

میاں بھولو، پیارے عثمان السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

کئی مہینے ہوئے تمہارا کوئی خط نہیں (آیا) تعجب ہے کہ متعدد خطوط سب کے نام روانہ ہو چکے ہیں مگر کسی کا خط نہیں آیا۔ میرا خط پہنچے یا نہ پہنچے مگر لازم ہے کہ ہر ہفتہ خیریت کا خط بھیج دیا کرو۔ اگر چہ خطوط میں چند خدشہ ہیں اس لیے ہر ایک خط کا پہنچ جانا ضروری نہیں مگر یہ بھی نہیں کہ سب کے سب تلف ہو جاویں اور ایک بھی نہ پہنچے۔ میں اور تمام رفیق بالحمد للہ خیریت اور راحت سے ہیں سب پڑھنے لکھنے وغیرہ مشاغل میں مصروف ہیں۔ خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔ اپنی بڑی اماں[1] اور سب کی خیریت سے بتفصیل اطلاع دو حکیم صاحب[2] اور محمد محسن[3] سلمہما سے بعد سلام کہہ دو کہ اپنی خیریت سے مطلع کرو۔ سب بھائیوں کو سب چھوٹے بڑوں کو دعا و سلام پہنچا دو۔

تمام واقف کاروں اور پوچھنے والوں کو جس کو چاہو سلام کہہ دینا، اللہ تعالیٰ جلد مع الخیر آپ سے ملاوے! اور سب رفیقوں کا سلام پہنچے۔ عزیزم محمد[4] نبی وغیرہ طلباء کو سلام۔

والسلام فقط مالٹا سینٹ کلیمنٹ براکس ۲۲۱۹ء

بندہ محمود عفی عنہ

۱۔ حضرت شیخ الہندؒ کی اہلیہ محترمہ مراد ہیں۔

۲۔ حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ

۳۔ برادر حضرت شیخ الہندؒ

۴۔ غالباً مولانا محمد نبی خان جہانپوری مرحوم مراد ہیں۔ (فریدی)

مقالہ (۷)

ملتان جیل میں حضرت مفتی صاحب کا علمی شاہکار[1]

مفتی اعظم نمبر کے لیے سوچتا تھا کہ کچھ لکھوں مگر مجھے حضرتؒ کی ذاتِ اقدس سے ایسی نزدیکی حاصل نہ تھی کہ میں ان کی سیرت کا تفصیلی مطالعہ کر سکتا۔ نہ براہِ راست معتد بہ عرصہ تک علمی استفادہ کا موقع مل سکا کہ میں ان کی زندگی کے کسی پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈال سکوں۔ ہاں! جمعیۃ علماء کے کئی اجلاسوں میں حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھا، مجلس مضامین میں ان کی باتوں کو سنا۔ ان کے متعدد فتاویٰ نظر سے گزرے اور ان کی ذکاوت و ذہانت، تقویٰ و امانت اور معاملات کی صفائی کے واقعات دوستوں اور بزرگوں سے سنتا رہا۔ جس کی وجہ سے میرے قلب میں ہمیشہ ان کی عظمت و محبت جاگزیں رہی۔ سب سے پہلے ۱۳۴۸ھ میں[2] مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کے دستار بندی کے جلسہ میں ان کو دیکھا، حضرت مولانا احمد سعید صاحب[3] مدظلہ کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔

دستار بندی کے جلسے میں حضرتؒ نے عام مجمع کے اندر بھی تقریر فرمائی تھی، میں اس وقت ابتدائی تعلیم پا رہا تھا لیکن میں نے اس وقت حضرتؒ کی تقریری خصوصیت کا جو اندازہ لگایا تھا آخر تک درست نکلا اور وہ یہ کہ اگر ان کی تقریر کو من و عن لکھ لیا جائے تو قلمبند ہونے کے بعد وہ ایک مستقل مضمون کی شکل میں نظر آئے۔ حشو و زوائد کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ یہ

---

[1] مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلوی متوفی ۱۳؍ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ موافق ۲۱؍دسمبر ۱۹۵۲ء مراد ہیں۔ اور یہ مقالہ روزنامہ الجمیۃ دہلی کے مفتی اعظم نمبر سے لیا گیا ہے۔ [2] ۱۳۴۸ھ موافق ۱۹۳۰ء جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ کے مہتمم مولانا سید معظم حسنین مرحوم امروہی تھے اور آپ ہی کی تحریک پر جمعیۃ علماء کا نواں اجلاس جامع مسجد، امروہہ میں منعقد ہوا۔ [3] جب یہ مقالہ لکھا گیا تھا تو سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ بقید حیات تھے۔ ۴؍دسمبر ۱۹۵۹ء (۳؍جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ) میں انتقال ہوا۔ درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ میں اپنے استاذ مفتی اعظم کے پہلو میں دفن ہوئے۔ (محب الحق)

بات مقررین میں بہت کم حضرات کو نصیب ہوتی ہے۔

دستار بندی کے جلسے میں چونکہ جمعیۃ علماء کے صدر و ناظم دونوں تشریف لائے تھے اس لیے اہل امروہہ نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس نہم[1] کی بات چیت ابتدائی درجہ میں ان حضرات سے کر لی تھی۔ بالآخر درخواست منظور ہوئی اور امروہہ کی سرزمین پر ایک تاریخی اجلاس حضرتؒ کی آمد کے طفیل میں منعقد ہوا۔ ایک مرتبہ جب ایک کتاب ''نفحۃ العرب[2]'' کی طباعت کے سلسلے میں دہلی گیا، کتاب کا نام کس طرز کا ہو، آیا سادہ رسم الخط میں یا طغریٰ کے طریقہ پر؟ حضرتؒ نے کئی طریقے پر نام اپنے دست خاص سے لکھ کر جس طرز کو تجویز فرمایا اسی کے مطابق عمل درآمد کیا گیا۔ کتاب کی کاپیاں میرے ہمراہ تھیں۔ اپنی ایک نظم کی کتابت کو ملاحظہ فرمایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے یہ کمال مشاہدہ کیا کہ حضرتؒ نے ایک سرسری نظر تمام صفحے پر ڈال کر فوراً ایک زبردست غلطی کا پتہ چلا لیا اور اس غلط لفظ کو کاٹ کر حاشیہ پر صحیح لفظ بنایا اور فرمایا کاتب نے اس مصرعہ میں ''ینا غی'' غلط لکھ دیا ہے۔ ''یغانی'' ہونا چاہیے۔ مصرعہ یہ ہے: وَكَمْ بَيْنَ حُرِاذُ يُغَانِىْ غَزَالَةً....

میری معلومات بہت محدود ہیں لیکن اس ناقص اور محدود معلومات کے مطابق اگر تمام اوصاف قلم بند کروں تو ایک مستقل رسالہ بن جائے۔ فی الحال مفتی اعظم نمبر میں شرکت کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ کی عربی نظم کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ نظم خود ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ نظم ملتان سینٹرل جیل کی یادگار[3] ہے۔ یہ نظم عید کے موقع پر ملتان

---

[1] یہ تاریخی اجلاس ۳، ۴، ۵، ۶/ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ موافق ۳، ۴، ۵، ۶/مئی ۱۹۳۰ء ہفتہ، اتوار، پیر، منگل کو منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا معین الدین خیر آبادی سیتاپوریؒ صدر المدرسین مدرسہ معینیہ اجمیر نے فرمائی۔ خطبہ استقبالیہ مولانا حکیم سید طفیل حسن ابوالنظر رضوی مرحوم امروہی نے پڑھا۔ اس اجلاس میں مکمل آزادیٔ ہند کا ریزولیوشن باتفاق رائے پاس ہوا تھا اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے علاوہ تقریباً پانچ سو علماء نے شرکت کی تھی۔ مولانا فریدیؒ اس کے ڈیلی گیٹ تھے۔ اور مجالس مضامین میں بھی شریک ہوتے تھے۔ [2] ملتان جیل میں مفتی صاحبؒ کے علاوہ مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم اور دیگر اہل وطن بھی تھے۔ [3] نفحۃ العرب مؤلفہ مولانا اعزاز علی امروہیؒ کا پہلا ایڈیشن مولانا فریدی امروہیؒ کے اہتمام سے شائع ہوا۔ (محب الحق)

سینٹرل جیل میں لکھی گئی ہے۔ میجر فضل الدین اس نظم کے مخاطب ہیں۔ میجر فضل الدین کے متعلق خود حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ عربی سے خوب واقف اور بہت قابل آدمی تھے۔ اس نظم کا جواب انھوں نے عربی نثر میں حضرت مفتی صاحبؒ کو لکھا تھا۔

ترجمہ سے پہلے اتنا اور عرض کر دوں کہ اس نظم میں حضرت مفتی صاحبؒ نے جس فصاحت و بلاغت کو استعمال فرمایا ہے اور جس مؤثر اسلوب سے اپنے جذبات کو ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اصلی نظم سے ہی ہوسکتا ہے۔ میں اپنے ترجمہ میں وہ تاثیر کہاں سے لاؤں جو عربی نظم میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ اصل نظم ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا صحیح صحیح مصداق ہے۔ ع

سچ ہے: دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس نظم کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ ملتان جیل میں ہیں۔ عید آئی ہے پوری رعنائی کے ساتھ، مسرت اس کے جلو میں ہے۔ عیش و سرور اس کے ہمرکاب ہے لیکن تمام مسرت پاشیاں جیل کے باہر ہی ہیں۔ جیل میں ایک ضعیف اور بیمار انسان اہل و عیال سے دور اعزا و اقربا سے مہجور بیٹھا ہوا ہے۔ نہ وہ عید کی نماز با جماعت ادا کر سکتا ہے، نہ اپنے بیوی بچوں سے مل سکتا ہے۔ ایسی حالت میں دل پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے قید و بند کے مصائب جھیلے ہیں۔ قید کی حالت میں راحت کہاں! لیکن اگر راحت کے ظاہری سامان مہیا بھی کر دئے جائیں تب بھی قلب کا وہ چین کہاں نصیب ہوسکتا ہے جو گھر بار کی یاد آوری میں برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہزار اسباب راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
قفس میں آ ہی جاتا ہے خیال آشیاں پھر بھی

حضرت مفتی صاحبؒ میجر فضل الدین (جو کہ جیل کے افسر تھے) کو تہنیت عید بھیجتے ہیں اور اس میں اپنے سچے جذبات کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی حمیت اسلامی، حریت طلبی اور اپنے بلند نصب العین کو ظاہر فرما رہے ہیں اور اسی ضمن میں یہ

بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ ''الدین النصیحۃ'' کو پیش نظر رکھ کر میجر فضل الدین کو بھی ضروری نصیحت فرمائیں۔ میں پچیس اشعار میں سے صرف چودہ کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ شروع میں بطور تمہید چند اشعار ہیں جن میں میجر فضل الدین کو عید کی مبارک باد پیش کی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

اِذَا الْعِیدُ یَأْتِی الْمَرْءَ وَالْمَرْءُ مُحْتَظٍ ☆ بِاَھْلٍ وَمَغْنیً اَوْرَثَ اللُّطْفَ وَ الْھَنَا

جب عید آتی ہے ایسی حالت میں کہ انسان اہل وعیال اور گھر بار سے بھی محظوظ ہو رہا ہو تو بڑی خوشگوار و مسرت بخش ہوتی ہے۔

وَلٰکِنَّہُ اِنْ حَلَّ وَالسِّجْنُ مُؤْصَدٌ ☆ عَلَی الْمَرْءِ لَمْ یُوْرِثْ سِوَی الْحُزْنِ وَالشَّجیٰ

لیکن جب کہ عید اس حال میں آئے کہ انسان قید خانے میں محبوس و مقید ہو تو عید سوائے رنج وغم کے اور کچھ نہیں پہنچاتی۔

وَ کَمْ بَیْنَ حُرٍّ اِذْ یُغَانِی غَزَالَۃً ☆ وَ بَیْنَ الْمُعَانِی مِحْنَۃَ السِّجْنِ وَالْعَنَا

بہت بڑا فرق ہے اس شخص میں جو بیوی بچوں میں آزادانہ زندگی بسر کر رہا ہو اور اس شخص میں جو قید خانے کی مصیبت جھیل رہا ہو۔

وَ کَمْ بَیْنَ حُرٍّ قَرَّ عَیْنَاہُ بِالْھَویٰ ☆ وَ بَیْنَ اَسِیْرٍ یَصْطَلِیْ ضَرَمَۃَ النَّویٰ

بہت بڑا فرق ہے اس شخص میں جو من بھاتی چیزوں سے اپنے آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے اور اس شخص میں جو جدائی کی آگ سے ہاتھ تاپتا ہے۔

وَلٰکِنَّا قَومٌ نُلَاعِبُ بِالظُّبیٰ ☆ وَ نَقْلِیْ ظِبَاءً اِذْ تَدَاعَتْ اِلَی الْوَنیٰ

لیکن ہم تلوار کی دھار سے کھیلنے والی قوم ہیں ہم بگڑ جاتے ہیں غزالہ صفت بیویوں سے جب کہ وہ مداہنت کی دعوت دیتی ہیں۔

وَ نَحْنُ کِرَامٌ نَمْلِکُ الْخَیْرَ فِی النَّدیٰ ☆ وَ نَحْنُ لُیُوْثٌ نَحْسِمُ الشَّرَّ فِی الْوَغیٰ

اور ہم شریف و نجیب ہیں داد و دہش کے وقت مال ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے اور شیر ہیں جو

جنگ میں شر و فساد کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔

اَبَیۡنَا اِبَاءَ اللَّیۡثِ ذُلَّ التَّعَبُّدِ ☆ فَلا سُبَّۃَ اَخۡزیٰ مِنَ الذُّلِّ لِلۡعِدیٰ

ہم نے غلامی کی ذلت قبول کرنے سے شیر کی طرح انکار کر دیا۔ دشمن کے سامنے جھکنے سے زیادہ عار کی کوئی بات نہیں۔

حُبِسۡنَا وَ اُوۡذِیۡنَا بِغَیۡرِ جَرِیۡمَۃٍ ☆ فَمَا ذَنۡبُنَا اِلَّا الدِّفَاعُ عَنِ الۡحِمیٰ

ہم بلا کسی جرم کے قید کئے گئے اور ایذا دئے جا رہے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ وطن عزیز سے دشمن کو نکالنا چاہتے ہیں۔

بلوحِ تربت ما یافتند از غیب تحریرے ☆ کہ ایں مظلوم را جز بے گناہی نیست تقصیرے

وَ اِنۡ غَاشِمٌ عَدَّ الدِّفَاعَ جَرِیۡمَۃً ☆ فَاِنَّا نَریٰ ھٰذَاکَ مِنۡ سُؤۡدَدِ الۡفَتیٰ

اگر ظالم (انگریز) نے دفاع کو جرم قرار دیا ہے تو ہم اس کو عین عزت خیال کرتے ہیں۔

وَ اِنۡ خَانَنَا الدَّھۡرُ الۡغَشُوۡمُ فَلا تَکُنۡ ☆ یَداً لِخَؤُوۡنٍ وَاقِفُ حَقًّا اِذَا انۡجَلیٰ

اگر ظالم اہل زمانہ نے ہمارے ساتھ خیانت کی ہے تو اے فضل الدین جب حق تمہارے سامنے واضح ہو گیا ہے تو خائن کے مددگار نہ بنو۔

فَاَنۡتَ کَرِیۡمُ ابۡنُ الۡکَرِیۡمِ وَلَمۡ نَجِدۡ ☆ کَرِیۡماً مُعِیۡناً لِلَّذِیۡ جَارَ وَاعۡتَدیٰ

تم کریم ابن کریم ہو اور ہم نے کسی کریم شخص کو ظالم و جابر کا معین و مددگار بنتے نہیں دیکھا۔

نَریٰ الۡاَسۡرَ لِلۡحُرِّ الۡوَفِیِّ کَرَامَۃً ☆ وَ اِنۡ کَانَ رِجۡزاً لِلۡمُوَاقِعِ فِی الۡخَنَا

ہم قید کو احرار کے لیے کرامت تصور کرتے ہیں اگرچہ اخلاقی مجرم کے لیے قید عذاب ہوتی ہے۔

وَمَا السِّجۡنُ لِلۡمَظۡلُوۡمِ اِلَّا عَطِیَّۃٌ ☆ یَمُنُّ بِھَا الۡمَوۡلیٰ عَلیٰ عَبۡدِ اصۡطَفیٰ

جیل خانہ مظلوم کے لیے ایک عطیہ ربانی ہے جس کو وہ اپنے کسی منتخب بندے کو ہی عطا کرتا ہے۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں ☆ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

شہپر زاغ و زغن زیبائے قید و بند نیست ☆ ایں سعادت از پے شہباز و شاہیں کردہ اند

فَیَا رَبِّ تَثْبِیْتاً وَ صَبْراً عَلَی الْبَلاءِ ☆ وَ یَا رَبِّ عَوْناً وَ انْتِصَاراً مِنَ الْعِدیٰ

اے اللہ! ہمیں ثابت قدم رکھ اور بلاؤں پر صبر نصیب فرما ہماری مدد فرما اور دشمنوں سے ہماری طرف سے خود ہی انتقام لے لے۔

مقالہ (۸)

اعزاز العلماء کی عنایتیں[1]

اپنے ایک حقیر ترین خادم پر

استاذ العلماء، اعزاز الملّۃ والدین، شیخ الادب والفقہؒ کی خبر وفات اخبار سے پہلے مجھے میرٹھ کے ایک خط سے ملی، پڑھ کر پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ اس کا تصور بھی نہ تھا کہ وہ ہمارے درمیان سے ایک دم اُٹھا لیے جائیں گے۔ اللہ اللہ!! قیام دار العلوم (دیوبند) کا ایک وہ زمانہ تھا کہ ان کا دیدار ہر وقت نصیب تھا۔ یہ شیخ الادب نودرہ میں بلند اور پُر رعب آواز سے پڑھا رہے ہیں۔ اب شیخ الادب سبق ختم کر کے اپنے مکان جا رہے ہیں۔ مکان سے جلدی جلدی چلے آ رہے ہیں۔ اپنے حجرے میں پہنچ گئے۔ جماعت کے اوقات میں اپنے حجرے کو بند کر کے مسجد میں آ رہے ہیں۔ ان کے قدموں کی آہٹ اور ان کے حجرے کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں تک کانوں میں بسی ہوئی ہیں۔ وفات کے بعد دیوبند پہنچا تو نمازِ مغرب کے بعد صحن مسجد میں لیٹ گیا۔ ایسا محسوس ہوتا رہا کہ جیسے حضرت شیخ الادب اب آئے اور اپنا حجرہ کھولا۔ لیکن ان کا حجرہ مقفل تھا۔ ہائے آج ہم ان کی ملاقات سے محروم ہو گئے۔ اس سے پہلے تو ایسا نہ ہوتا تھا اوقات مقررہ میں ان کا حجرہ غیر مقفل ہوتا تھا۔ کواڑ بند کر لیتے تھے، ڈرتے ڈرتے حجرے کے کواڑ کھولے اندر داخل ہوئے کہ ایک نورانی چہرہ نظر پڑا۔ آواز آئی آیئے آیئے تشریف لایئے۔ غور سے اپنے خادم کو دیکھا اور ایک دم کھڑے ہو گئے۔ معانقہ کیا اپنے پاس بٹھایا تھوڑی دیر کے لیے اپنا تمام کام چھوڑ دیا۔ آج شیخ الادب کہاں چلے گئے؟ اللہ کے یہاں گئے اللہ کو پیارے ہو گئے!

---

[1] اعزاز العلماء شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی امروہی متوفی ۱۳۷۴ھ موافق ۱۹۵۵ء مراد ہیں اور یہ مقالہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

دیکھیے یہ ان کی قبر سر زمین دیو بند کے ''خطہ صالحین'' میں ہے، قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے قدموں میں جگہ پائی ہے۔ ع

''جگر افکار ہم پھرتے ہیں وہ سوتے ہیں مدفن میں''

طلباء اور نو وارد تعزیت کنندگان کے پرے کے پرے جوق جوق مزار پر حاضر ہو رہے ہیں اور ایصال ثواب کر رہے ہیں، وفات کے بعد پہلا جمعہ آیا ہے۔ مہتمم صاحب[1] دارالعلوم گجرات کے سفر سے واپس آئے نماز جمعہ کے بعد دارالحدیث میں ایک پُر اثر تعزیتی تقریر فرما کر مزار شیخ الادب پر پہنچے ہیں، ان کے ہمراہ طلباء کا کتنا ہجوم ہے کہ قبر نظر نہیں آتی۔ اب ہم ان سے قیامت میں ملیں گے، ان شاء اللہ! جنت میں ملاقات ہوگی مگر۔ شیخ الادب کے علوم زندہ ہیں، بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجود ہیں۔ یوں بھی تو دارالعلوم سے باہر آنے کے بعد ان سے مدتوں ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ کبھی سال بھر میں، کبھی دو سال میں ملنا ہوتا تھا۔ وفات سے پانچ چھ دن پہلے نو دس ماہ کے بعد اتفاقیہ ملاقات ہوگئی تھی۔ بس یہ آخری ملاقات تھی۔

اس ملاقات میں خلافِ عادت فرمایا کہ دیو بند میرے ساتھ چلو۔ میں نے عرض کیا کہ آخر شعبان میں حاضر ہوں گا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ دو چار دن ہی میں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے جائیں گے اور ۴ر مارچ کا جمعہ ''خیر المساجد'' میرٹھ میں حضرت شیخ الادبؒ کی اقتدا میں پڑھ کر اگلا جمعہ دیو بند میں اس حال میں پڑھوں گا کہ نظریں شیخ الادبؒ کو ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ شوال میں امروہہ آنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر وہ تو قبر میں جا سوئے، اب کیسے آئیں گے ہائے ان کے آباء کی سر زمین! ان کی سکونت سے تو محروم تھی، اب ان کی گاہے گاہے تشریف آوری سے بھی محروم ہوگئی۔ امروہہ سے کتنا تعلق تھا اس کو نہ پوچھیے بدایوں میں پیدا ہوئے، تعلیم میرٹھ، شاہجہاں پور اور دیو بند میں پائی۔ امروہہ میں ذاتی مکان تک باقی نہ تھا لیکن آبائی وطن ہونے کی وجہ سے نسبت امروہہ کی طرف ہی کرتے رہے۔ ایک

---

[1] فخر الاماثل مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مراد ہیں۔ (محب الحق)

دفعہ فرمایا: کہ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ حافظ زاہد حسن صاحب مرحوم مجھ کو مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ کی تدریسی خدمات کے لیے لے گئے۔ میں نے وہاں پہنچ کر اسباق طلب کیے سب سے پہلے کنزالدقائق میرے سامنے آئی، طلباء نے کہا کہ کل سے شروع کرائیے، میں نے کہا کہ آج ہی شروع کرو۔'' فرماتے تھے خوب یاد ہے کہ کنزالدقائق میرے سامنے آئی بعدہٗ حضرت شیخ الہندؒ کو دیکھا کہ وہ مجھے اپنے حکم سے دیوبند واپس لے گئے۔''

اب بھی شیخ الادبؒ اپنی برزخی توجہات سے مستفیضین کو نواز رہے ہیں۔ پہلے ان کا مکتوب گرامی ڈاکخانوں کی وساطت سے آتا تھا اب دل کو قاصد بنانا پڑے گا۔

قاصد یہ تیرا کام نہیں اپنی راہ لے ☆ اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے؟

دل اسی نامہ و پیام کے اجرا کی امید پر مطمئن ہے ورنہ فیض کی سلسلہ جنبانی سے دل مایوس ہو جاتا تو زندگی اجیرن ہو جاتی۔

مولانا عبدالحی صاحب بڈھانویؒ (رفیق سید احمد شہیدؒ) کی وفات کی اطلاع نواب وزیرالدولہ (ٹونک) کو دیتے ہوئے سید احمد علی شہیدؒ (خواہرزادہ سید احمد شہیدؒ) نے لکھا تھا کہ: یہ وفات ایسا غم انگیز سانحہ ہے کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو تعزیت کرے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت شیخ الادبؒ کی وفات بھی ایسی ہی الم انگیز ہے اس کا اثر بھی صاحبزادگان اور نبیرگان سے گزر کر عالم اسلامی کے ہزارہا افراد پر پڑا ہے۔ مناسب ہے کہ مستفیضین ایک دوسرے کو تعزیت کریں۔

ایسا شفیق استاذ، ایسا مربی استاذ، ایسا دل سوز استاذ آج دنیا کہاں پیدا کرتی ہے! اساتذۂ متقدمین کے واقعات سنے اور پڑھے تھے، آنکھوں سے بھی ہم نے دیکھ لیا کہ جن سعید شخصیتوں سے قدرت کو علمی و روحانی تربیت کا کام لینا ہوتا ہے وہ ایسے ہوتے ہیں۔

دیوبند کے زمانہ قیام میں ان کا جو مربیانہ طرز عمل تھا اس کو میں پھر لکھوں گا اب تو مجھے دارالعلوم سے باہر آنے کے بعد ان کی شفقتوں کو ان کی ہی زبانی بیان کرنا ہے۔

مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی سلمہ[1] کا مکتوب آیا کہ حضرت شیخ الادبؒ پر کچھ لکھا جائے سوچتا تھا کہ کیا لکھوں؟ ابھی تو ان کے تصور سے ہی فرصت نہیں، آنکھوں کے آنسو اگرچہ خشک ہو گئے ہیں مگر دل کی طغیانی نہیں جاتی۔ تعمیل اگرچہ دیر سے ہو رہی ہے اور شاید تکمیل سے بھی قدرے نا آشنا ہے مگر بہر حال اپنے لیے تسکین دل کا ایک سامان بہم پہنچا لیا۔ خیال آیا کہ میرے نام حضرت شیخ الادبؒ کے جو مکتوبات ہیں ان کو جمع کر لیا جائے۔ ایک دو دن صرف اس میں صرف ہوئے کہ جگہ جگہ سے مکتوبات گرامی اکٹھے کیے، صندوقوں میں، الماریوں میں، طاقوں میں، کتابوں میں، تھیلوں میں اور نہ معلوم کس کس گوشے میں یہ تبرکات رکھے ہوئے تھے۔ تلاش کرتے کرتے تھک تھک گیا بالآخر چند مکتوبات مل گئے ۲۰ سال کی منتشر ڈاک میں مکتوبات گرامی آبدار موتیوں کی طرح چمک چمک کر اپنے لکھنے والے کا پتہ بتا رہے تھے۔ ان کو پڑھتا گیا دل کی پیاس بجھاتا رہا اور ایک ایک بات یاد آتی گئی۔ اپنے استاذ معظم کے خطوط احتیاط سے ایک جگہ رکھتا رہتا تو یوں پریشانی نہ اُٹھانی پڑتی۔ ایک آدھ کارڈ شکن کی وجہ سے نصف رہ گیا ہے اس کو بھی حرزِ جاں بنایا ع پھر جمع کر رہا ہوں دل لخت لخت کو

ابھی تو بہت سے مکتوبات اور ہوں گے سامنے آتے رہیں گے اور ان کو آنکھوں سے لگاتا رہوں گا۔ اب یہ جتنے ہیں ان کے کچھ اقتباسات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ پورا پورا مکتوب درج نہیں کروں گا۔ ہر ایک میں سے کچھ کچھ جملے ہوں گے، ان سے حضرتؒ کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر بھی کچھ روشنی پڑے گی۔ میں ان مکتوبات کے آئینہ میں ان کی عنایات دکھانا چاہتا ہوں ہر چند کہ اس میں بعض جملے میرے حق میں ایسے ہیں جن کو نقل کرتے مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے اور اگر کوئی خوش گمان نہ ہو تو اس کو میری خود نمائی اور ریاء وسمعہ پر معمول کرلے گا۔ لیکن میں باوجود شرمندگی کے ان کے اظہار پر آمادہ ہوں، یہ

[1] ۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سابق مدیر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ آپ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے بڑے صاحبزادے خرابیٔ صحت کی وجہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر، طلاق ثلاثہ، مجھے ہے حکم اذاں، ایران اور اس کی اسلامیت وغیرہ۔ (محب الحق)

میرے استاذ کے شفقت آمیز جملے ہیں یہ ان کی شرافت نفس، عظمت خیال اور وسعت قلب کے آئینہ دار ہیں۔ اکابر اپنے اصاغر کے متعلق ایسا ہی خیال رکھا کرتے ہیں اس میں ان کا ہی کمال برآمد ہوا کرتا ہے۔ تمام مکتوبات شائع ہونے کا کہاں موقع ملے گا۔ نہ میں ان تمام کو شائع کرنا چاہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے مکتوبات ہیں جو زیادہ تر شفقت آمیز یادآوری پر مشتمل ہیں۔ میں تو بس حضرت والا سے خیریت معلوم کرلیا کرتا تھا اور ایک دو باتیں لکھ کر عریضہ بھیج دیتا تھا۔ علمی سوال نہیں کرتا تھا ان کی مشغول زندگی کو پیش نظر رکھ کر میں اس کو مناسب بھی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ میرے لیے کچھ غیر معمولی وقت صرف کریں اور اپنی کم علمی پر علمی سوال کا اہل بھی کب تھا۔ اُن عرائض کے جواب میں یہ چند مکتوبات آج میری تسلی کا باعث بنے ہوئے ہیں ع بوئے گل راز کہ جویم جز گلاب

اب یہ مضمون نہ ہوا استاذ علیہ الرحمہ کے تبرکات کا ایک مرقع ہوگیا۔ اپنے پاس ہے بھی کیا یہ انہیں بزرگوں کا صدقہ ہے جو الٹا سیدھا لکھنا، بولنا آ گیا ہے۔

حضرت شیخ الادبؒ اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے جملے کے جملے من وعن سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے غالبًا ایک سے زیادہ بار میرے سامنے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے ''اللہ تعالیٰ کی البیلی سرکار ہے'' اس جملے کو حضرت شیخ الادبؒ اس محبت اور جوش کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ سننے والوں پر خاص اثر پڑتا تھا۔ اب ہم استاذ مرحوم کے تقریری جملے ہو بہو پیش نہ کرسکیں تو کم از کم تحریری جملے ہی سہی۔

میری تو یہ حالت ہے کہ حضرت والا کے ان مکتوبی جملوں کو پڑھ پڑھ کر ان کی یاد تازہ ہورہی ہے اور دل مصروف دعائے مغفرت ہے۔ حضرت والا کے دیگر متوسّلین بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ان جملوں سے مستفیض ہوں گے۔ اور ان کے حق میں دعائے خیر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الادبؒ کی مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

اب ان کے تحریری کلمات طیبات پڑھیے کہیں کہیں تشریح بھی ساتھ ہی ساتھ کرتا

جاؤں گا۔

حضرت مولانا (محمد منظور) نعمانی مدظلہ[1] نے بریلی کے مدرسہ اشفاقیہ کی خدمت کے لیے مجھے دیوبند سے بریلی طلب کیا۔ میں نے حضرت شیخ الادبؒ سے اجازت طلب کی بہت خوش ہوئے۔ وہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلباء کو جلد سے جلد خدمت درس میں مشغول دیکھنا چاہتے تھے۔ جس طرح ایک باپ کو اپنے بالغ بیٹے کی ''گھر گرہستی'' کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اسی طرح اس روحانی باپ کو یہ فکر ہوتی تھی کہ میرا علمی فرزند کسی طرح پڑھانے کا سلیقہ پیدا کر لے اور کسی مدرسہ میں کام کرنے لگے۔ میں ۱۳۵۷ھ میں بریلی آیا سب سے پہلا مکتوب جو بریلی آیا اس کے چند جملے یہ ہیں:

> ''پس از سلام مسنون دیوبند سے تودیع کے بعد آج پہلا عریضہ ارسال کر رہا ہوں اور وہ بھی ایک ذاتی ضرورت سے۔ میرٹھ میں مکان مل جانے سے میں تقریباً مایوس ہو گیا ہوں۔ اس لیے یہ خیال ہو رہا ہے کہ امروہہ میں کوئی صورت ہو تو اچھا ہے۔'' (۲۷؍رجب ۱۳۵۷ھ یومِ جمعہ)

بریلی سے میں نے ہدایات طلب کیں تو تحریر فرمایا

> ''آپ کو میں نصیحت کروں یا للعجب! ہاں میری یہ رائے ضرور ہے کہ آپ تعلیم میں اپنی طرف سے اس کی سعی کریں کہ طلباء کتاب کی بات پوری سمجھ لیں اور تحصیل علم میں محنت کی طرف مائل ہوں۔ کتاب پوری پڑھا دیں اور تقریر میں ان کی استعداد کا خیال رکھ کر ''کَلِّمِ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ'' کی روشنی میں کام کریں اوقات درس کی حتی الامکان پابندی کریں۔ یوم النحر ۱۳۵۷ھ''

تساہل کی وجہ سے ارسال عریضہ میں دیر ہو جاتی تھی اس پر کس خوبی سے توجہ

---

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو مولانا نعمانیؒ بقید حیات تھے اور ماہنامہ الفرقان بریلی سے نکلتا تھا۔ (محبّ الحق)

دلاتے ہیں:

’’آپ کے تعلیمی حالات سن کر خوشی ہوئی اس لیے دل چاہتا ہے کہ گاہے گاہے آپ ضرور یاد فرمایا کریں۔ مولانا (محمد) منظور صاحب کی علالت کا حال ان کے خط تحریر فرمودہ آنجناب سے معلوم ہوا تھا میں نے ایک عریضہ ان کی خدمت میں بغرض دریافت عافیت مزاج ارسال کیا مگر اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا کہیں ایسا تو نہیں کہ چٹھی رساں کو بھی یہ مسئلہ بتلا دیا گیا ہو کہ وہابیوں، دیوبندیوں کو ہر طرح نقصان پہنچانا موجب ثواب ہے۔ براہِ کرم مولانا ممدوح کی عافیت مزاج سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔‘‘ (۴رمضان ۱۳۵۸ھ)

طلباء کے سلسلے میں نصیحت فرمائی:

’’طلباء پر شفقت صحیح معنی میں ہونی چاہیے۔ آپ نہ اتنے نرم ہوں کہ طلباء پڑھنا ہی ترک کر دیں، نہ اتنے گرم ہوں کہ وہ آپ سے مایوس ہو جائیں۔ ضرورت ہے کہ آپ اپنے عمل سے یہ امر ثابت کر دیں کہ آپ ان کی تعلیم کو تمام امور سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اسی طرف ان کو مائل رکھیے اور حتی الامکان سہولت کے ساتھ ان کے اخلاق کی تہذیب کیجیے اور ان کے ذہن نشین کیجیے کہ آئندہ چل کر ان کو اسلامی خدمات انجام دینے ہوں گے۔ بے غیرتی اور غیر مہذب چیزوں پر آپ کی طرف سے گرانی کا اظہار ضروری ہے۔‘‘ (۴رصفر ۱۳۵۹ھ)

ایک عریضہ میں حضرت والا کے احسانات کا میں نے تذکرہ کر دیا، اس کے جواب میں ارقام فرمایا:

’’میں نے بہت دیر تک غور کیا میری سمجھ میں نہ آیا کہ میری وہ کون سی

خدمت تھی جس کا بار آپ پر اتنا ہوا ہے اور یہ معمولی خدمت بھی اگر
خالص خدمت ہی ہوتی تو آپ جو چاہتے فرما لیتے لیکن ایک طامیانہ
خدمت تو خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو ''بجوئے تیرزد'' آپ اور آپ جیسے
...کی خدمت اگر میں نے کی ہے تو اس طمع پر کی ہے کہ آپ حضرات حسن
خاتمہ کی دعا سے میری دستگیری فرمائیں گے۔ (۲۲؍صفر ۱۳۶۰ھ)''

حضرت والا کو مدرسہ اشفاقیہ کے ایک جلسہ میں بریلی مدعو کیا گیا، تشریف لائے یہاں حضرت والا کا وعظ پہلی مرتبہ سننے کا اتفاق ہوا۔ بڑا مؤثر پُر جوش اور جامع وعظ فرمایا۔ میرا اندازہ ہے کہ عوام الناس بھی اس سے بہت متأثر ہوئے۔ احقر نے حضرتؒ کو لکھ دیا کہ حضرت والا کا وعظ بڑا مؤثر تھا اس پر تحریر فرمایا:

''اس مرتبہ بریلی سے واپس ہو کر خیال ہوا کہ آپ کو لکھوں گا کہ
ہمارے اطراف میں مثل مشہور ہے کہ ''سوسنار کی ایک لوہار کی'' آپ
نے میرے اس سفر کی وجہ سے کلفتیں بھی اس قدر برداشت کیں کہ مجھ
کو اس کا ہزارواں حصہ بھی آپ کے قیام دیوبند میں نہ ہو سکیں اور
مدارات بھی اس قدر کی کہ مجھ کو شرم آگئی۔ اب آپ نے تحریر فرمادیا
کہ تیری تقریر مؤثر ہوئی۔ اگر آپ کی اس خبر میں محبت کی آمیزش
نہیں ہے تو یہ تاثیر آپ کی کرامت ہوگی ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ میں
سبق میں بھی تقریر کا عادی نہیں ہوں، میں رمضان میں حسن خاتمہ کی
دعا کا متمنی ہوں۔'' (۲۶؍شعبان ۱۳۶۰ھ)

بریلی سے حضرت والا دیوبند تشریف لے گئے تو قیام گاہ پر حضرتؒ کی ایک ٹوپی میرٹھ کی بنی ہوئی رہ گئی، میں نے اس کو بھجوایا اور یہ لکھا کہ جی تو یہ چاہتا تھا کہ اس ٹوپی کو تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھ لیتا اس پر یوں ارقام فرمایا:

''میری ٹوپی پہنچ گئی تھی مگر وہ ایک اور طالب علم صاحب نے بطور تبرک لے لی اگر آپ اس کو قبول کر لیتے تو شاید زیادہ اچھا ہوتا۔ اگر دوستوں نے ٹوپی اتارنے کی رسم شروع کر دی تو کھدر کی ٹوپیاں بہت سے سروں پر آجائیں گی۔'' (۱۳ر رمضان ۱۳۶۰ھ)

میں نے بریلی چھوڑنے کا قصد ظاہر کیا تو حضرت والا نے تحریر فرمایا:

''اگر مجبوری نہ ہو تو آپ بریلی ترک نہ کریں، مجبوری کی حالت میں انسان سبھی کچھ کرتا ہے۔'' (جمادی الاولی ۱۳۶۱ھ)

بریلی سے مجبوری کی بنا پر امروہہ آ گیا تو حضرتؒ کو فکر ہوئی اور تحریر فرمایا:

''آپ کا تعطل میرے لیے بہت شاق ہے، اشاعت علم کی کسی نہ کسی سلسلے میں مصروف رہنا ضروری ہے۔ کچھ دنوں تک جبریہ تعطل کے بعد بیکار رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس لیے اگر ہو سکے تو امروہہ ہی کے کسی مدرسہ میں تھوڑا بہت تعلیمی کام شروع کر دیجیے۔'' (۱۲ر ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ)

ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''میری دلی خواہش ہے کہ آپ اپنے آپ کو تدریس کی خداداد نعمت سے علیحدہ نہ کریں۔'' (۱۳۶۱ھ)

اب آگے ان مکاتیب کے اقتباسات ہیں جو مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں تعلق کے بعد آئے۔ اس حصہ میں ایک تو اس کا جواب ہے کہ امروہہ کب تک تشریف آوری ہوگی دوسرے حضرت والا یہ چاہتے تھے کہ امروہہ میں مکان خرید لیں۔ اس کا ذکر بھی کہیں کہیں آئے گا۔ باقی شفقتوں اور عنایتوں کی بارشیں ہیں جو ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ (اب میں سوائے سنین کے تاریخوں کی ترتیب کا التزام بالکل نہیں کروں گا)۔

ارقام فرمایا:

''خط پڑھنے کے بعد خیال ہوا کہ اگر دو چار خط اور آ گئے یا اگر تقدیر مساعدت کرے اور میں آپ کی چند روزہ ہمرکابی کا فخر حاصل کرسکوں تو نااہلیت کے باوجود اگر ولی نہیں تو صاحب کرامت ضرور سمجھنے لگوں..... آپ مجھ کو زبان سے ولی نہ بنائیں قلبی توجہات صرف کر کے مجھ کو اس قابل کر دیں کہ میں دنیا سے ایمان کی دولت ساتھ لے کر جاؤں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ بیکار نہیں ہیں۔'' (۱۰ر ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ)

''میرا ارادہ ضرور ہے کہ جلد سے جلد دو چار دن کے لیے امروہہ حاضر ہوں، مگر اول تو میرے تمام ارادے ہی 'تغیر عالم' کا صحیح نمونہ ہیں۔ مگر سفر کا ارادہ جس طرح کہ ہر ساعت رہتا ہے اسی طرح ہر ساعت بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے میں کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کب تک حاضری ہو سکے گی۔'' (۲۸ر شوال ۱۳۶۲ھ جمعہ)

''دار العلوم میں بحمد اللہ اب کسی قسم کا خلفشار نہیں ہے بلکہ پہلے سے زیادہ رونق ہے۔'' (۳ر ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ)

''فسخ نکاح کے مسائل میں غیر مسلم کا فیصلہ اگرچہ شرعی قواعد کے مطابق ہو شرعاً معتبر نہیں۔ نکاح فسخ نہیں ہوتا ہے اور جو نکاح اس طرح کر دیا جائے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام کاری ہے۔ اس صورت میں اچھا یہ ہے کہ دیندار مسلمانوں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی جائے اور رسالہ ''حیلۂ[1] ناجزہ'' کی روشنی میں فیصلہ کر دیا جائے۔''

(۲ر ربیع الاول ۱۳۶۶ھ)

---

[1] حیلۂ ناجزہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں اُن مسائل کو حل کیا گیا ہے جس میں کسی طرح کی گنجائش چاروں ائمہ میں سے کسی کے یہاں موجود ہو اور عموم بلویٰ پر عمل کیا گیا ہے۔ (محب الحق)

''میرے عزیز! دارالعلوم دیوبند میں چہل سالہ قیام کی وجہ سے نام کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل الذیل ہے مگر ایسا بدقسمت ہوں کہ میری نظر میں صرف چند حضرات ہی ایسے ہیں کہ جن سے محبت کی توقع ہے۔ ان میں سے ایک آپ بھی ہیں.... تقریر و وعظ کے متعلق اپنی عاجزی کے ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ امروہہ کوئی معمولی جگہ نہیں ہے.... حضرت..... جیسے خطباء وہاں تقریریں کر چکے ہیں تو ہم جیسوں کو مقررین کی فہرست میں داخل کرنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن آپ کے نزدیک یہ عذر قابل قبول نہیں، نہ سہی۔'' (۳۰؍رجب ۱۳۶۸ھ)

''میرے متعلق جو الفاظ آپ نے تحریر فرمائے ہیں وہ خود سعادت مندی کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ جب خود مجھ کو اپنا صحیح علم ہے تو اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ آپ جیسے.... کا حسن ظن میرے ساتھ ہے تو ان شاء اللہ دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور کام آئے گا۔ رشید میاں پاکستان ہیں، ہندوستان آنے کی سعی کر رہے ہیں۔ حامد میاں کنز پڑھ رہے ہیں۔ احمد میاں سلمہ کے دونوں بچے حفظ کر رہے ہیں جس بچے کو (ارشد میاں سلمہ) آپ میرا شبیہ فرما رہے ہیں، زیادہ ذہین ہے اور نسبتاً پڑھنے کا شوقین بھی ہے.... رہا وعظ تو آپ کو معلوم ہے کہ مجھ کو وعظ فی الحقیقت نہیں آتا ہے۔ دوسرے مجھ کو حیا کرنی چاہیے کہ جس مسجد میں حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ آرام فرما ہوں میں وہاں تقریر کروں۔ ''ایاز قدر خود شناس''۔'' (۶؍ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ)

''میں کسی مصرف کا نہ سہی مگر میری قلبی خواہش یہ ہے کہ امروہہ کا یہ مدرسہ اوج ترقی پر رہے۔ اس وقت کی یہ حاضری دشوار ہے گزشتہ سال

بھی دشواری تھی مگر اس دشواری کو حضرت مولانا مدنی ظلمت فیوضہ کے امر نے حل کر دیا تھا۔ اس مرتبہ ایسا نہ ہو سکا.... مختصر یہ ہے کہ میں تو بہر صورت آپ کا خادم ہوں لیکن چونکہ مدرسہ کا ایک ناکارہ ملازم ہوں اس لیے مدرسہ کی ضروریات مقدم ہیں۔'' (۹ر شعبان ۱۳۶۹ھ)

''ربیع الثانی کے کسی جمعہ کی حاضری کی نسبت ارشاد فرمایا ہے ان شاء اللہ آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ یہ صرف آپ کے حکم کا امتثال ہوگا ورنہ آپ یقین کریں کہ خطابت کے فن سے مجھ کو کوئی دلچسپی نہیں بلکہ بسا اوقات ''تَنسَوْنَ اَنْفُسَکُم'' کا خیال قلب میں افسردگی پیدا کر دیتا ہے۔'' (۲۵ر ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ جمعہ)

''میں نے ''دارالعلوم'' میں آپ کا مضمون حضرت نانوتویؒ[۲] کی شاعری کے متعلق دیکھا، دل بہت خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق مزید عطا فرمائے۔'' (یکم جمادی الثانیہ ۱۳۷۱ھ)

''میری علالت کی خبر نے آپ کو پریشان کر دیا، بزرگوں اور احباب نے تار وغیرہ سے بھی عزت افزائی کی۔ کثرت خطوط نے جواب میں تعجیل سے روک دیا۔ کسی صاحب نے صحت کی خبر شائع کر کے احباب کو مطمئن کیا مگر عیادت کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ امید ہے کہ آپ حضرات میرے لیے حسن خاتمہ کی دعا ضرور فرمائیں گے''

''رہا مرنا سو یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے آج نہ سہی کل'' (۲۵ر رجب ۱۳۷۲ھ جمعہ)

---

[۱] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو حضرت مدنیؒ بقید حیات تھے آپ کا وصال ۱۲ر جمادی الاول ۱۳۷۷ھ موافق ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء میں ہوا۔ [۲] قاسم العلوم والمعارف کی شاعری مقالات فریدی جلد اول میں پڑھیں۔ (محب الحق)

مقالہ (۹)

حضرت شیخ الاسلامؒ کی جامعیت[1]

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی زآفتاب ☆ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے: ''هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.... ''

اس آیہ کریمہ میں چار چیزوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وظائف حیات میں شمار فرمایا گیا ہے۔(۱) تلاوت آیات (۲) تزکیہ نفوس (۳) تعلیم کتاب (۴) تعلیم حکمت۔

وارثین رسول اور نائبین نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام قرن اول سے لے کر صدیوں تک جامعیت کے ساتھ ان چاروں امورِ مہمہ کو انجام دیتے رہے پھر زمانہ کے انقلاب اور ذوق جامعیت کی کمی نے ان چاروں شعبوں کو ''تقسیم کار'' کے طور پر تقسیم کرا دیا۔ تلاوت قرآن مجید کی صلاحیت پیدا کرنے کا کام حفاظ کے سپرد ہوا۔ تزکیہ نفوس، صوفیہ کے ذمہ رہا اور تعلیم کتاب مدرسین کا کام قرار دیا گیا۔ رہی تعلیم حکمت وہ خال خال افراد میں نظر آنے لگی۔ حافظ کے لیے یہ ضروری نہ رہا کہ وہ تزکیہ نفوس کی مہارت رکھتا ہو، عالم دین ہو اور معلم حکمت ہو، صوفی نے عالم دین ہونا، حافظ قرآن ہونا اور حکمت و دانش سے آراستہ ہونا اہم قرار نہیں دیا۔ معلم کتاب نے احسان و سلوک، حفظ قرآن اور حکمت سے زیادہ تعلق نہ رکھا اور جن میں دانش و حکمت تھی انھوں نے بقیہ تینوں شعبوں کی اہمیت محسوس نہیں کی اور اپنی دانش کو قید شریعت سے آزاد اور دائرۂ قانونِ اسلامی سے باہر کر دینے میں کوئی تامل نہ کیا الا ماشاء اللہ۔

---

[1] ماہنامہ ''الحرم'' میرٹھ کے مرتب مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی شہر امام قاضی میرٹھ اور رکنِ مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند و مدرسہ جامع مسجد امروہہ متوفی ۱۵ ر رمضان ۱۴۱۱ھ موافق ۳۱ ر مارچ ۱۹۹۱ء تھے۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں قاموس القرآن، بیان اللسان اور سیرت طیبہ وغیرہ ہیں۔ حضرت مولانا فریدی امروہیؒ اس ماہنامہ کے معاون مرتب تھے۔ یہ مضمون ''الحرم'' میرٹھ کے حضرت مدنیؒ نمبر سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

تاہم متاخرین میں ایسے افراد بھی ظاہر ہوئے جو ان چاروں شعبوں میں کامل تھے۔ سلسلۂ ولی اللہی کو لیجیے کہ اس میں خود حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ان کے صاحبزادگانِ گرامی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ پھر ان کے بعد قاسم العلوم والمعارف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم اسی جامعیت کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے اپنی خوش نصیبی سے جن چند جامع کمالات بزرگوں کو قریب سے دیکھا ہے اور جن کی خدمت میں کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں ایک شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی ہیں، ان کی روشن و تابناک زندگی کے بہت سے پہلو ہیں لیکن میں ''الحرم'' کے حضرت مدنی نمبر میں انھیں چار پہلوؤں پر مختصر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں تا کہ وراثتؔ و نیابت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر رکھ کر حضرت مدنیؒ کی جامعیت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

تلاوتِ قرآن: حضرت مدنیؒ حافظ قرآن بھی تھے۔ اگر چہ بچپن میں حفظ نہ کر سکے تھے مگر ان کی یہ تمنا تھی کہ یہ دولت لازوال (حفظ قرآن) حاصل ہو جائے۔ چنانچہ ''سفرنامہ اسیرانِ مالٹا'' میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: کہ میں چند دعائیں مانگا کرتا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن مجید حفظ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دولت سے بھی مشرف فرمایا اور... مالٹا ہی میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ حفظ کرنے کے بعد اس کا حق بھی ایسا ادا کیا کہ بہت سے خالص حفاظ سے اس طرح ادا نہیں ہوتا۔ بہت سے حافظوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ صرف رمضان میں دور کرتے ہیں اور گیارہ مہینے قرآن کو ''زینت طاق نسیاں'' بنا دیتے ہیں۔ مشاغل کے ہجوم میں خصوصاً ضعف کے زمانہ میں تراویح میں بھی قرآن شریف کا سننا سنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن حضرتؒ کے یہاں رمضان میں تو تراویح و تہجد کے اندر تلاوت قرآن کا اہتمام تھا ہی اس کے علاوہ بھی نوافل میں راتوں کو بیدار ہو ہو کر تلاوت قرآن سے لذت اندوز ہوتے تھے۔ رمضان کیا آتا تھا ان کے لیے موسم بہار

آجاتا تھا۔ ریل میں، جیل میں، مالٹا کے اسارت خانہ میں، مساجد میں، خلوت کدے میں، رمضان کی قیام گاہوں میں، حالت صحت و حالت مرض میں، عالم جوانی اور عالم پیری میں۔ غرض ہر ہر دور میں قرآن کو ذوق وشوق کے ساتھ سنایا۔ ان کے اس ذوق سے کتنے قلوب میں حفظ قرآن کی اہمیت پیدا ہوئی اور کتنے متوسلین نے آپ کی برکت سے اپنے بچوں کو قرآن مجید حفظ کرایا۔ اس کو اللہ ہی جانتا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق فرمایا تھا: کہ اللہ تعالیٰ عمرؓ کی قبر کو نور سے معمور کرے جس طرح انھوں نے رمضان میں (قیام تراویح کے ذریعہ) مساجد کو منور کر دیا۔ حضرتؒ کا ہر ایک متوسل بھی حضرتؒ کے لیے یہی دعا کرے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن کرے کہ انھوں نے اپنے عملی نمونے دکھا کر حفظ قرآن اور تلاوت قرآن کے لیے راہیں کھول دیں اور ہزاروں مسجدوں اور لاکھوں قلوب کو تلاوت قرآن سے جگمگا دیا۔

تزکیہ نفوس:۔ اس سلسلے میں بھی حضرت مدنیؒ نے اپنی دعاؤں اور کوششوں سے کام لیا خود اپنے قلب کو مزیّن کر کے دوسرے نفوس کے لیے مزکّی بنے اور ڈیڑھ سو سے زائد خلفاء اپنے بعد چھوڑے جو تزکیہ نفوس کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ حضرتؒ نے احسان و تصوف کے میدان میں گامزن ہونے کے لیے اہل علم اور عوام الناس دونوں کے واسطے سہولتیں بہم پہنچائیں۔

تحصیل علم اور فراغت کے بعد معاشی افکار میں مبتلا ہو کر اہل علم اپنے نفس کی اصلاح سے غافل ہو جاتے ہیں۔ عوام کا تو کہنا ہی کیا۔ لیکن حضرتؒ ایک طرف درس حدیث میں موقع بموقع احسان و تصوف کے مسائل بیان فرما کر طلباء کو اس ضرورت کا احساس دلاتے رہتے تھے، دوسری طرف اپنے ارشاداتِ عمومی سے ملازمت، تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت میں مشغول رہنے والوں کو بھی ذکر خدا اور اصلاحِ نفس کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ فنی حیثیت سے بھی مسائل تصوف سے حضرتؒ کو زبردست آگاہی اور واقفیت تھی۔

متقدمین و متاخرین صوفیہ کی معتبر اور ٹکسالی تصنیفات و تالیفات ان کے ملفوظات اور مخطوطات پر بڑی گہری نگاہ تھی۔ان کی عبارتیں کی عبارتیں زبانی یاد تھیں۔اپنی تقریر وتحریر میں بے تکلف وہ عبارتیں پڑھتے اور لکھتے چلے جاتے تھے۔مکتوبات قدوسیہ،مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات معصومیہ وغیرہ میں جو اہم اور قابل یادداشت واقعات اور اشعار ہیں وہ حضرتؒ کو از بر تھے۔مکتوبات شیخ الاسلامؒ میں بعض بعض مواقع پر وہ جواہر پارے جو متعدد بزرگانِ دین کے خزانوں سے حاصل کیے گئے ہیں، ناظرین کو ملیں گے۔توحید وجودی اور توحیدِ شہودی پر جو تحریری مباحث اور محاکے پچھلی صدیوں میں ہوئے ہیں ان سے بھی پوری طرح واقف تھے۔مسئلہ ''تصور شیخ'' پر حضرتؒ نے جو فیصلہ اپنی تحریر میں فرمایا ہے اور جس پر سب سے آخری دستخط ہوئے ہیں (اور جواب بھی غیر مطبوعہ ہے) وہ تحریر اس مسئلہ میں قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔

کتابی تصوف کے علاوہ عملی احسان وتصوف میں بھی آپ بہترین ماہر سلوک رہنما تھے۔آپ نے متقدمین کی سی محنتیں اس راہ میں کیں۔وقت کے کاملین سے اپنا تعلق رکھا اور برابر اپنے قلب کی صفائی اور تجلیہ میں مشغول رہے۔حضرت قطب گنگوہیؒ اور خود شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے فیوض سے براہِ راست متمتع ہوئے۔پھر حضرت قطب گنگوہیؒ کے پرانے خلفاء سے بھی اپنا خاص تعلق رکھا اور ان کی توجہات اپنی جانب مبذول کرائیں۔سچ پوچھیے تو حضرت شیخ الہندؒ ہی وہ روحانی مربی تھے جنھوں نے اس باکمال روحانی فرزند کو ''وادیٔ عشق ومحبت'' میں سفر کرنے کی دعوت دی اور بنظر غور دیکھا جائے تو اپنے والد ماجد سید حبیب اللہ مرحوم سے یہ ذوق روحانیت ورثے میں حاصل کیا تھا۔وہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے سرچشمۂ فیوض سے مستفیض تھے۔ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جو کوئی علماء وصلحاء سے محبت رکھتا ہے اس کا بیٹا یا پوتا ان شاء اللہ ضرور عالم ہوگا۔ سید حبیب اللہؒ کا حضرت گنج مرادآبادیؒ جیسے درویش صفت عالم دین کی صحبت میں رہنا نہ

صرف ان کی ہفت پشت کی سعادت کا ذریعہ بنا بلکہ عالم اسلامی میں سعادت وحکمت کے سوتے جاری ہو گئے۔ مدرسہ شرعیہ ''مدینہ منورہ'' کا قیام ایک طرف اسی گنج مرادآبادیؒ بزرگ کا غیر محسوس فیض ہے تو شیخ الاسلامؒ کی شخصیت کی تعمیر میں بھی اول اول اسی بزرگ کے برکات پنہاں نظر آتے ہیں۔

آج اچھے اور سچے بزرگانِ دین سے اپنا تعلق درست کرنا مادی دنیا میں تعجب اور مستحیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن اس سے دینی وروحانی ترقیات کے کتنے دروازے کھلتے ہیں اس کا اندازہ مادی عینک سے کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ جس وقت حضرتؒ کے والد ماجد اپنے مرشد کے وصال کے بعد ہجرت پر آمادہ ہوئے حضرتؒ کی اہلیہ کے ماموں صاحب نے حضرتؒ کے والد ماجد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ (مولانا) حسین احمد کو ہندوستان چھوڑ دیا جائے۔ میں ان کو حکیم عبدالعزیز (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) سے طب پڑھوانا چاہتا ہوں تو معلوم ہے خانقاہ گنج مرادآبادی کے حاشیہ نشین سید حبیب اللہ مغفور نے کیا جواب دیا تھا؟ خدا کی قسم آب زر سے لکھنے کے قابل جواب ہے اور تمام ان اہل علم حضرات کے لیے لائق عبرت ہے جو فراغت کے بعد علم کی برکات سے خود بھی محروم رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی محروم رکھتے ہیں۔ سنیے نقش حیات کے ''نقاش'' نے خود ہی اپنے قلم سے یہ جملہ نقل کیا ہے کہ میرے والد نے یہ جواب دیا تھا: ''کہ میں حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد گدھے پر سوار کروں؟'' یعنی ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ فراغت علم دین کے بعد طب کے اندر مشغول کر دیا جائے۔ اللہ اکبر! کتنی محبت تھی علم ودین سے اور کتنا اونچا نصب العین تھا باوجودیکہ خود عالم دین نہ تھے لیکن اللہ والے عالم کی صحبت میں رہ کر ایسا سچا جذبہ اور علم دین سے لگاؤ پیدا کرلیا تھا کہ اپنے فرزند کے عالم دین بننے کے بعد گوارہ نہ کیا کہ علم طب جو بقول شخصے ''ستارِ علوم'' ہے (تمام دیگر علوم کو چھپا دینے والا ہے) اس کو حاصل کیا جائے۔ یوں دیکھا جائے تو علم ابدان دنیاوی نقطۂ نظر سے بڑا اعلیٰ وعمدہ علم ہے لیکن علم ادیان کے مقابلہ میں اس کی کیا

حیثیت ہے؟ اگر والد ماجد خدانخواستہ راضی ہو جاتے اور حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی مرحوم کی خدمت میں لکھنؤ بھیج دیتے تو حضرتؒ کی فطری ذہانت وذکاوت کے پیش نظر یہ یقینی امر تھا کہ وہ حکیم عبدالعزیز مرحوم کے صحیح اور لائق جانشین ہو جاتے بلکہ ان سے بھی زیادہ ترقی کر جاتے اور کہیں کے افسر الاطباء ہوتے، رئیس الحکماء ہوتے اور پورے ملک میں حاذق الملک اور شفاء الملک کے لقب سے مشہور ہو جاتے لیکن پھر زبدۃ السالکین، قدوۃ العارفین، شیخ الحدیث اور شیخ الاسلام کیسے بنتے؟ ان کا آستانہ روحانی امراض کا شفاخانہ کیسے بنتا؟ مدنی فیوض کے سرچشمے ہند و بیرون ہند میں اس دور آخر میں کیسے جاری ہوتے۔

درس اور تعلیم کتاب:۔ مربی استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی وصیت تھی کہ چاہے ایک دو طالب علم ہوں پڑھاتے ضرور رہنا۔ اس وصیت پر آخر وقت تک عمل کر کے دکھا دیا۔ خود مرکزِ علم و دین اور منبع تقویٰ و یقین یعنی مدینہ منورہ میں کئی سال تک درس دیا اور ہندوستان میں امروہہ، سلہٹ اور کلکتہ کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں تشنگانِ علوم، قرآن وحدیث کو سیراب کیا۔ اعداد و شمار نے بتایا کہ دارالعلوم کے سن تاسیس ۱۲۸۳ھ سے لے کر ۱۳۷۶ھ تک کے فارغ التحصیل طلباء کی آدھے سے زائد تعداد حضرت شیخ الاسلامؒ کے حلقۂ درس سے برآمد ہوئی ہے۔ جس محنت و جانفشانی سے درس دیا ہے اور جس خوبی سے علمی تحقیقات فرمائی ہیں ان کو وہی طلباء اچھی طرح جان سکتے ہیں جو ان کے درس میں شریک رہ چکے ہیں۔ لمبے لمبے سفر در پیش ہیں، جگہ جگہ کانفرنسوں، جلسوں، دینی تقریبوں، تقریبات نکاح، مجالس شوریٰ اور تقریبات سنگ بنیاد مدارس وغیرہ میں طلب کیا جا رہا ہے۔ وہاں حسب وعدہ وقت پر پہنچنا، صاف، سلیس اور عام فہم زبان میں تقریر فرمانا اور اس طرح درس عمومی کا فائدہ پہنچانا، پھر واپس آ کر طلباء کے اسباق کا جاری رکھنا، دن کو بھی پڑھانا، رات کو بھی پڑھانا، سفر کا تھکان اور پیرانہ سالی کا ضعف کوئی چیز شغف درس میں مانع و حارج نہیں۔ پوری تیاری کے ساتھ درس کو ذہنی طور پر مرتب کر کے دارالحدیث میں تشریف لاتے تھے اور تمام حل طلب مشکل مقامات کو اس

طرح حل فرماتے تھے کہ ایک غبی سے غبی طالب علم بھی نفس مطلب سمجھ لیتا تھا۔ظاہر ہے کہ یہ بات ایک طویل تجربہ، ایک بہترین ذہانت اور کافی محنت ومشقت کو چاہتی ہے۔مشکل مسائل کو آسان طریقہ پر بیان کر دینا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب ایک کامیاب و ہمدرد معلم اپنے فکرِ رسا اور ذہنِ بلیغ کے ذریعہ اپنے اوپر محنت کا بوجھ ڈال کر دوسروں کے لیے تسہیل کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرے۔حضرتؒ کتنی محنت اور جد وجہد سے معانی عالیہ کو طلباء کے ذہنوں میں اتارتے تھے۔اس کو وہی حضرات اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں جو میدانِ تعلیم کے شہسوار ہیں اور منزل تحقیق وتلاش کے شناساں ہیں۔

مجھے تو اپنے زمانۂ تعلیم میں برابر یہ حیرت رہی کہ حضرتؒ مطالعہ کس وقت کر لیتے ہیں؟ باہر مہمانوں کا ہجوم، درجنوں خطوط کے روزانہ جوابات، بیعت ہونے والوں کو تلقین اور اسفار کا اہتمام اور اس کے ساتھ اتنا شاندار محققانہ درس۔یہ سب کثرت ذکر، اتباع سنت اور بزرگوں کی توجہات کی برکات تھیں کہ حیرت انگیز طریقہ پر امورِ مہمہ کو روزانہ پوری قوت وشوکت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

درس حدیث میں قرآن کے معانی بھی حل ہوتے تھے، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشے بھی نمایاں ہوتے تھے۔فقہ کے مسائل بھی سمجھائے جاتے تھے، معانی وبیان سے بھی آگاہ کیا جاتا تھا، اسماء الرجال اور علم لغت سے بھی شناسا کیا جاتا تھا، تاریخ وجغرافیہ سے بھی تعلق پیدا کیا جاتا تھا؛ غرض کہ وہاں دارین کے فوائد مرتب ہوتے تھے۔یہیں سے تزکیہ نفس، احسان وتصوف کی لگن بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ہوسکتا تھا کہ حضرتؒ ''الکتاب'' کے صحیح مصداق قرآن مجید کی تعلیم دیتے اور اسی کی تفسیر کرتے لیکن آپ محدثین کے طریق پر درس حدیث کے راستے سے ہی قرآن کی عظمت پیدا کرتے، تعلیم قرآن کا راستہ کھولتے تھے۔درحقیقت احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی قرآن کی عملی تفسیر ہوتی ہے اور قرآن کے شانِ نزول اور اس کے مطالب ومعانی کا پتہ چلتا ہے۔

حدیثِ دلفروزش بسکہ شد مجموعہ حکمت ☆ حکیمانِ جلدمی سازند اوراق مجلّد را

تعلیم حکمت:۔ تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاستِ بدن کی مکمل تعلیم جس طرح قرآن و حدیث میں موجود ہے وہ کہاں مل سکتی ہے؟ اس لیے ایک کامیاب معلم قرآن و حدیث کا معلم حکمت ہونا کچھ تعجب خیز بات نہیں۔ پھر جس شخصیت کے اندر ذکر الٰہی کا نور جلوہ افروز ہوا اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی نے جس کے قلب کو روشن کر دیا ہو اس کا معلم حکمت و دانش ہونا تو کچھ بھی بعید نہیں۔

بہت سوں کو حیرت تھی کہ ایک طرف غیر مسلمانہ شعائر سے نفرت اور دوسری طرف سیاسی معاملات میں غیر مسلموں سے اشتراکِ عمل؟ مگر دینی بصیرت اور حکمت کا یہی تقاضا تھا کہ ''اَھْوَنُ الْبَلِیَّتَیْنِ'' پر عمل کر کے فرنگی کی گرفت کو کمزور کر دیا جائے اور اپنے ملک کو آزاد کرا کے تمام ممالک اسلامیہ کو آزاد و محفوظ کر لیا جائے۔ حضرتؒ کے خطبہ ہائے صدارت کو بغور پڑھو، ان سے ان کی عقل و دوراندیشی کا کچھ اندازہ ہوگا۔ انھوں نے انگریزی کرتوتوں کے رازہائے سربستہ اس طرح کھولے ہیں کہ بڑے بڑے سیاسیین ہند حیرت زدہ ہیں۔ خود انگریز کو ان انکشافات سے کتنی تشویش لاحق ہوگئی تھی اس کا اندازہ ماہرین سیاست کو بخوبی ہے لیکن جن کے اندر دینی فراست اور حکمت کی کمی تھی ان سے کیا کہا جائے؟ انھوں نے اپنی نادانی سے غلط الزامات لگائے، بات کو سمجھا نہیں اور سمجھنے سے پہلے بہتان تراشیاں شروع کر دیں۔ اس میں قصور عوام کا نہ تھا، ان بڑوں کا تھا جو مئے فرنگ سے بری طرح سرمست ہوگئے تھے اور جو خالص مسلمانانہ ذہن و فکر سے عاری ہو کر عام مخلوق خدا کا درد اپنے اندر نہیں رکھتے تھے۔

ہندوستان و پاکستان آج تو دو مستقل حقیقتیں ہیں، تقسیم کے مسئلہ پر بحث کرنے کا نہ آج وقت ہے، نہ ضرورت لیکن آنے والے مؤرخ کا قلم کون روک سکتا ہے جب کہ وہ بتائے گا اور ان شاء اللہ تعالیٰ پوری قوت اور بصیرت سے بتائے گا کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جو ایک بوریہ نشین محدّث و درویش تھے، ان کا نظریہ اس سلسلے میں کتنا اعلیٰ، کتنا

مناسب اور کتنا مفید تھا۔ مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے لیے بھی۔

یہ حکمت ہی کا تقاضا تھا کہ ضروریاتِ زمانہ اور مقتضیاتِ زمانہ پر پوری نظر رہتی تھی۔ اقتصادی و معاشرتی مسائل کو اپنی تقریروں اور اپنی تحریروں میں حل فرماتے تھے۔ شادی وغمی کے رسم و رواج نے جو مسلمانوں کی اقتصادی حالات کو تباہ کر دیا ہے اس رسم و رواج کے خلاف پوری قوت کے ساتھ حضرتؒ نے آواز بلند فرمائی اور یہ ایک معلم حکمت ہی کی نگاہِ دوررس ہوتی ہے جس کی وجہ سے حق و باطل میں امتیاز آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ذکر حق اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات سے نوازے۔ آمین!

مقالہ (۱۰)

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے درسِ حدیث کی ایک جھلک[1]

کتاب ماضی کا ایک ورق

اب سے ۲۲، ۲۳ سال پہلے کی بات ہے ۱۳۵۴ھ میں ماہِ شوال کے پہلے ہفتہ میں مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ سے رخصت ہو کر دورۂ حدیث کی شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند پہنچا۔ اب صحیح تعداد تو معلوم نہیں البتہ ۲۰۰ سے زیادہ طلباء اس سال دورے حدیث میں تھے۔ ان میں غیر منقسم ہندوستان کے ہر صوبے کے بھی تھے قندھار، غزنین اور طالقان وغیرہ کے بھی اچھے اچھے ذہین وذکی اور ذی استعداد طلباء ان میں متعدد تھے۔ اس وقت معلوم ہوا تھا کہ دورے میں بعض طلباء ایسے آئے ہیں جو بعدِ فراغت ۷، ۸ سال تک تمام کتابیں پڑھا چکے ہیں۔ یہاں پر محض حضرتؒ کے فیوض سے متمتع ہونے اور اپنے شبہات کو حل کرنے کے لیے شامل دورہ ہوئے ہیں۔

مجھے حضرت شیخ الادبؒ کی عنایات بھی حاصل تھیں، اتفاق کی بات ناظم حجرات نے ان کے حجرے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا حجرہ دیا جس کا دروازہ دارالعلوم کے صدر دروازے سے متصل ہے۔

ابھی حضرتؒ سلہٹ سے واپس نہیں آئے تھے۔ انتظار ہو رہا ہے۔ بہت سے پچھلے سال کی تقاریر ترمذی و بخاری نقل کر رہے ہیں اور منتظر آمد ہیں، لیجیے ۲۷ رشوال ۱۳۵۴ھ کو حضرتؒ سلہٹ سے تشریف لے آئے۔ تمام دارالعلوم میں دھوم مچ گئی، مہمان خانہ مہمانوں

---

[1] یہ مقالہ روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے ''شیخ اسلام'' نمبر سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

سے لبریز ہوگیا۔ مدرسین، ملازمین، طلباء، اہل شہر سب خوش خوش نظر آرہے ہیں۔ دارالعلوم کے درودیوار پر ایک تازگی نمودار ہوگئی۔ محفل میں سب موجود تھے لیکن جانِ محفل نہ تھا تو کتنی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ لو اب وہ دارالحدیث میں تشریف لا رہے ہیں۔ مسند درس پر رونق افروز ہو گئے۔ خطبہ مسنونہ پڑھ کر ترمذی شریف شروع فرما رہے ہیں۔ پہلے تبرکاً ''سورۂ تین'' کی تفسیر ہو رہی ہے۔ ایسی تفسیر کہ دلوں کے غنچے وا ہو رہے ہیں۔ فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چار قسمیں کھا کر فرماتا ہے کہ ''ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے۔ جب انسان اپنے مقام سے گرا تو اس کو اسفل سافلین میں ٹھکانہ ملا۔'' اس کے بعد حدیث کی تعریف اس کا موضوع، اس کی غایت پھر امام ترمذیؒ کی سوانح عمری مفصل بیان ہو رہی ہے۔ پھر یہ فرما رہے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے اس کتاب پر زیادہ زور کیوں دیا ہے۔ اور اس کا درجہ کیا ہے۔ یہ سب باتیں بڑے دل نشین اور اثر انگیز طرز میں بیان کرکے پہلا افتتاحی درس ختم فرما دیتے ہیں۔ اب یہ یاد نہیں کہ بخاری بھی اسی دن شروع کرائی تھی یا اس کے بعد۔ بخاری کے آغازِ درس میں بھی امام بخاریؒ کی سوانح عمری اور ان کی کتاب کا مرتبہ نہایت تفصیل سے بیان فرمایا۔ بخاری شریف شروع کراتے وقت حضرتؒ اپنی سند حدیث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک بیان فرمایا کرتے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ اس سال بھی بیان فرمائی۔ اس سند کی تحویل چھوڑتے ہوئے صرف ایک طریق کو یہاں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں، حضرت شیخ الاسلامؒ نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے انھوں نے قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے انھوں نے حضرت شاہ عبدالغنی فاروقی مجددی مہاجر مدنیؒ سے انھوں نے مشہور آفاق حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ سے انھوں نے اپنے نانا رأس المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے انھوں نے اپنے والد ماجد تاج المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے۔ خوب یاد پڑتا ہے کہ حضرتؒ نے سند بیان کرنے کے بعد شیخ الہندؒ کے مشہور شاگردوں کا تذکرہ بھی

فرمایا اور فرمایا کہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا مفتی کفایت دہلویؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے باکمال شاگرد ہیں اور از راہ انکساری اپنے متعلق فرمایا کہ میں حضرتؒ کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں۔

پھر ایک دو دن درس دینے کے بعد حضرتؒ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ حج سے واپس ہو کر سب سے پہلے دہلی اُترے۔ جمعیۃ علماء کے اجلاس کی صدارت کرنی تھی۔ ۶رمحرم الحرام ۱۳۵۵ھ کو دہلی سے دیوبند تشریف لائے۔ ۷رمحرم کو اسباق شروع فرما دئے۔ اسی تاریخ کو بعد نمازِ عصر تمام حاضرین کو کھجوریں تقسیم فرمائیں اور آب زمزم پلایا، ایک تقریر بھی فرمائی۔

۸رمحرم ۱۳۵۵ھ سے میں نے حضرتؒ کی درسی تقریر لکھنے کا التزام[1] کرلیا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے دیوبند آئے ہوئے پہلا ہی سال تھا اس لیے سلیقہ کے ساتھ نہ لکھ سکا۔ متعدد طلباء ایسے تھے جنھوں نے تقاریر شیخ کو سلیقہ کے ساتھ خوشخط لکھا۔ میرے ایک ساتھی مولانا علی احمد خیلی (اسلام آبادی) تھے۔ انھوں نے حضرتؒ کی تقاریر ترمذی کو از اول تا آخر عربی میں لکھا۔ اس کا ایک جز ''ہدیۃ المجتبیٰ من فیوض البحر المدنی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

حضرتؒ ترمذی میں خاص طور پر بڑی مبسوط تقریر فرماتے تھے۔ مسئلہ کے ہر ہر گوشے کو واضح کر دیتے تھے۔ اسناد و متون پر سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔ ایک ایک لفظ کی تشریح کرتے تھے اور مسلک امام اعظمؒ کو ساتھ ہی ساتھ ثابت کرتے جاتے تھے۔ بعض اہم مسائل میں تنقیحات بھی قائم فرماتے تھے اور ایک ایک تنقیح پر خوب دل کھول کر تقریر فرماتے تھے۔ بالآخر مسلک امام کو بڑی خوبی کے ساتھ راجح ثابت کر دیتے تھے۔ بسا اوقات ایک

---

[1] حضرت مدنیؒ کی یہ درسی تقریر کی کاپی مولانا فریدیؒ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا اعزاز علیؒ کے درسِ شمائل ترمذی کی تقریر بھی وہیں موجود ہے اور شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کے درسِ تفسیر کی تقریر بھی وہیں پر ہی موجود ہے۔ کاش یہ تینوں تقاریر شائع ہو جائیں تو اہل علم کو اس سے بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔ (محب الحق)

ایک حدیث کئی کئی دن میں حل فرمائی ہے اور مسلک امام کو خاص طور پر روزِ روشن کی طرح ظاہر کردیا ہے۔ طلباء چاروں طرف سے شبہات واعتراضات وارد کررہے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض اعتراضات مہمل بھی ہوتے لیکن بہت سے وزنی بھی ہوتے تھے۔ حضرتؒ کشادہ پیشانی کے ساتھ سب کے جوابات دے رہے ہیں اور مطمئن کررہے ہیں۔ کبھی نہیں دیکھا کہ اعتراضات کی بوچھار سے منقبض یا مکدر ہوئے ہوں۔

ترمذی جلد اول کو آخر تک اسی تحقیق وتدقیق سے پڑھایا۔ بخاری شریف کے دو تین پارے نہایت تحقیق سے پڑھا کر پھر روانی کے ساتھ پڑھایا۔ البتہ کتاب المغازی، کتاب الحیل اور کتاب التفسیر میں پھر انتہائی تحقیق کے ساتھ مبسوط تقریریں فرمائیں اور مشکل مقامات کو اچھی طرح ذہن نشین کروایا۔ حضرتؒ کا طریقہ درس کچھ ایسا تھا کہ بخاری کا ایک پارہ پڑھ لینے کے بعد ہی ایک ذہین طالب علم کے اندر ایک خاص استعداد جلوہ گر ہوجاتی تھی اور وہ ترجمۃ الباب اور حدیث کے درمیان مطابقت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلیتا تھا۔

حضرتؒ دیگر متعدد کتب حدیث اور شروح حدیث کا حوالہ دیتے جاتے تھے۔ ان کی عبارتیں پڑھتے جاتے تھے۔ جس سے مطالعہ کا ذوق پیدا ہوجاتا تھا۔ اور راہِ تحقیق کشادہ ہوتی تھی۔

حضرتؒ خود بھی قرأت حدیث فرماتے تھے۔ جب وہ خود قرأت فرماتے تھے دارالحدیث کے بام ودر اس وقت فرطِ شوق میں وجد میں آجاتے تھے۔ ایک عجیب کیف آور سماں ہوتا تھا۔ اللہ اللہ!! وہ دل سے نکلی ہوئی جذبات سے لبریز، ذوقِ عرفان سے مالا مال آواز، وہ پُر شوکت لہجہ، وہ حوض کوثر سے تعلق رکھنے والی زبان، کیا کہوں ان کی ہر ہر شان وادا میں کیا تاثیر تھی۔ یہ باتیں جب یاد آتی ہیں دل پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔

حضرتؒ کے اندر ایک خاص قسم کا رعب تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شفقت آمیز سلوک بھی۔ اپنے کفش برداروں سے ان کی کسی غلطی پر ناراض بھی ہوجاتے تھے اور پھر جلدی

ہی ناراضگی دور بھی ہو جاتی تھی۔ خلافِ شریعت عمل پر فوراً ٹوک دیتے تھے اور سخت غصہ کا اظہار فرماتے تھے اور جب اس کا طرزِ عمل صحیح ہو جاتا تھا تو حضرت سے زیادہ نرم وہ کسی کو نہیں پاتا تھا۔ غریب الوطن طلباء کو وہ اتنا خوش رکھتے تھے کہ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھول جاتے تھے۔

حضرتؒ آخر سال میں دن رات پڑھاتے تھے۔ رات کے بارہ بجے تک سبق ہو رہا ہے۔ رات کا وقت ہے اکثر طلباء ذوق وشوق کے عالم میں درس حدیث سن رہے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جن پر نیند غالب آ گئی ہے۔ حضرتؒ کی نگاہ فوراً سونے والے پر پہنچ جاتی تھی۔ اور اس سونے والے سے فرماتے تھے۔ اُٹھیے اُٹھیے منہ دھویئے، پانی کے مٹکے دارالحدیث کے برآمدے میں رکھے ہوئے تھے۔ وہاں اس طالب علم کو بھیجا جاتا تھا جب وہ اُٹھتا تو حضرتؒ یہ مصرعہ پڑھ دیتے ع ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

اس کے بعد کوئی اونگھ بھی رہا ہوتا تو ہوشیار ہو جاتا تھا اور وہ صاحب جنھوں نے مٹکوں کی سیر کر لی ہوتی تھی پھر سونے کا ذرا مشکل سے نام لیتے تھے۔

حضرتؒ درمیان درس میں حسب موقع نکات تصوف، اسرار و معارف، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخی واقعات اور موجودہ زمانہ کے مقتضیات پر بھی روشنی ڈالتے رہتے تھے۔ موقع کے لطائف اور اشعار سنا کر بھی طلباء کو تازہ دم کر دیا کرتے تھے۔ کبھی محفل درس میں اعتراضات وشبہات سے سکوت ہوتا تھا تو خود ہی اس سکوت کو ختم فرما کر کوئی ایسی بات ارشاد فرما دیتے تھے جس سے سب طلباء کو نشاط حاصل ہو جائے۔ اس سال چند ایسے طلباء تھے جو فطرتاً زیادہ بولنے والے اور بے تکلف قسم کے تھے، یہ طلباء ''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ'' کے مصداق ہو گئے تھے۔ یہ خود نہ بولیں تو حضرت ان کا نام لے کر درمیانِ تقریر میں کچھ ارشاد فرما دیتے تھے۔ اسی قسم کے ایک طالقانی طالب علم تھے، وہ بہت دریافت کرتے رہتے تھے اور بڑے مزے کے سوالات کیا کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے حضرتؒ کو اور سب طلباء کو ہنسی آ جاتی تھی۔ ایک دن ترمذی کا سبق ہو رہا تھا خطبہ جمعہ کے وقت تحیۃ المسجد

پڑھنے نہ پڑھنے کی بحث ہے۔ حنفیہ نے عند الخطبہ نماز کو منع کیا ہے۔ اس پر دلائل پیش کرتے ہوئے حضرتؒ نے فرمایا کہ (دیکھنا یہ ہے) کہ جن رکعتوں کے پڑھنے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (عند الخطبہ) حکم فرمایا ہے وہ تحیۃ المسجد ہے یا اور کوئی نماز؟ دعویٰ آپ کا خاص ہے اور استدلال عام، ثابت کیجیے کہ عند الخطبہ تحیۃ المسجد کا ہی حکم فرمایا ہے۔ یہاں سے تحیۃ المسجد ثابت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ طالقانی سے دریافت کیا جائے دو اور دو کتنے تو وہ کہے چار روٹیاں۔ طالقانی اپنا نام سن کر فوراً چونک پڑے اور جھٹ سے بولے: حضرت دو اور دو کیا چار نہیں ہوتے؟ حضرتؒ نے تقریر کو جاری رکھا اور تمام طلباء کو ایک نشاط تازہ حاصل ہو گیا۔

ایک لطیفہ اور یاد آیا "زکوٰۃ الاموال" کا باب ہے، اس میں بنت مخاض، بنت لبون، حقہ اور جذعہ کا ذکر آتا ہے ایک طالب علم نے اپنی دانستگی سے دریافت کیا کہ "حُقہ" کے کیا معنی ہیں؟ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا حُقہ نہیں ہے، حِقہ ہے۔ محفل درس میں ہنسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

حضرتؒ درمیان درس میں طلباء سے اخلاقیات پر بھی بہت کچھ فرماتے رہتے تھے۔ اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں ورنہ کچھ ارشادات اس سلسلے کے بھی پیش کرتا۔

احقر بھی درمیان میں کچھ نہ کچھ دریافت کر لیا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ حضرتؒ نے ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے کچھ تنقیحات فرمائی تھیں۔ ہر ہر تنقیح پر بحث فرما رہے تھے درمیان میں احقر نے ایک سوال پیش کر دیا۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا: حضور! اتنی جلدی کیوں فرما رہے ہیں آگے اس کا جواب بھی آرہا ہے۔ آپ "وکان الانسان عجولا" کے مصداق ہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی اس بزرگانہ تنبیہ کے بعد آئندہ دخل در معقولات کی کبھی ہمت نہ ہوئی۔

طلباء پر بڑی شفقت تھی معلوم ہوا تھا کہ پوشیدہ طریقہ پر بہت سے نادار طلباء کی امداد فرماتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شیخ الاسلامؒ اس وصیت پر ہمیشہ عمل پیرا رہے جو آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلباء کے متعلق فرمائی ہے۔

کمال یہ تھا کہ باوجود کہ دو سو سے زیادہ طلباء دورہ حدیث میں رہتے تھے اور صرف آخری سال کے چند ماہ درس میں شرکت ہوتی تھی مگر اس کے باوجود طلباء کے ناموں سے بھی واقف، ان کے اوطان سے بھی واقف، ان کی استعداد سے بھی واقف، فارغ ہونے کے بعد بھی حضرت والا کے خدام حضرتؒ سے ملاقی ہوتے تو فوراً پہچان لیتے۔ حضرتؒ کی یادداشت غیر معمولی یادداشت تھی کثیر التعداد فیض یافتگان وخدام کو پہچان لینا اور اکثر وبیشتر کے نام ووطن سے واقف ہونا یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

میرے زمانہ میں (۱۳۵۵ھ میں) جب بخاری شریف ختم ہوئی تو رات کا وقت تھا، تقریباً ایک بجے ختم بخاری سے فارغ ہوئے۔ مہمان خانہ کے پاس تانگہ تیار کھڑا تھا۔ سلہٹ کے لمبے سفر کی تیاری تھی۔ دارالحدیث سے اُٹھے، مکان پر پہنچے، مہمانوں کا ہجوم تھا، طلباء اور مدرسین کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ سب سے مصافحہ کیا اور تانگہ پر سوار ہوگئے۔ بس ایک سنناہٹ چھا گئی۔ جب کبھی وہ تھوڑے عرصہ کے لیے بھی باہر کو تشریف لے گئے ہیں تو دارالعلوم کے در ودیوار پر ایک اداسی سی چھا گئی ہے۔ اب وہ تو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے مگر ان کے فیوض وبرکات تا قیامِ قیامت موجود رہیں گے۔ انھوں نے مسند درس ومسند مشیخت پر فائز رہ کر ایسے ایسے باکمال افراد تیار کیے ہیں جو اطراف واکناف عالم میں ان کے نام کو روشن کرنے کے لیے کافی اور ان کے حق میں مستقل صدقہ جاریہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہم خدام کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے اور پسماندگان خصوصاً حضرت میاں اسعد صاحب کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو امیر الہند وصدر جمعیۃ علماء ہند بقید حیات تھے۔ آپ کا وصال ۷؍محرم ۱۴۲۷ھ موافق ۶؍فروری ۲۰۰۶ء میں ہوا اور قبرستان قاسمی دیوبند میں تدفین ہوئی۔ (محب الحق)

مقالہ (۱۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ کے دو مکتوبِ[1] گرامی اور ان کا پس منظر

چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں ہندوستان کے اندر ایک نئے فتنہ کا ظہور ہوا۔ یہ فتنہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ملت اسلامیہ کے حق میں نہایت ہی مضر اور خطرناک فتنہ تھا۔ اس کا اثر جاہل عوام پر زیادہ ہوا۔ اس فتنے کے بانی مولوی احمد رضا خاں بریلوی تھے جو سنی حنفی قادری برکاتی لکھے اور لکھوائے جاتے تھے، اور جنھوں نے اکابر دیو بند کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنالیا تھا۔ دراں حالیکہ یہ اکابر بھی سنی حنفی چشتی صابری تھے۔ کہا جاتا ہے اور تحقیق کرنے پر یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ اس فتنے کے اندر فرنگی کا ہاتھ تھا اور اس کے چشم ابرو کے اشارے پر یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ مولوی احمد رضا خان بریلوی نے پہلے حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ پر ہاتھ صاف کیا۔ ان کو ستر وجوہ سے کافر کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور بڑے طمطراق سے یہ کہا کہ جو ان کو کافر نہ کہے وہ کافر ہے۔ پھر خیال آیا کہ مولانا شہید دہلویؒ کو کافر کہنے یا کہلوانے کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا اس لیے کہ اب ان کی تحریک بظاہر ختم ہو چکی اور ۱۸۵۷ء کی فرنگی ستم کیشیوں نے مجاہدین اسلام پر کاری ضرب لگا دی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دار العلوم دیو بند کو نشانہ بنایا جائے جو ان اکابر نے ۱۸۵۷ء کے دس سال بعد قائم کیا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ ضعیف نہ ہونے پائے اور جہاں تک ہو سکے فروغ ملت بیضاء میں جدوجہد کی جائے۔ فرنگی

---

[1] یہ مقالہ منعقدہ سیمینار ۱۸، ۱۹؍ مارچ ۱۹۸۸ء دہلی میں پڑھا گیا۔ ''شیخ الاسلام اور حیات وکارنامے'' سے لیا گیا ہے۔ مولانا فریدی امروہیؒ کا یہ مقالہ آخری ہے۔ اس کے بعد علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ۵؍ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ موافق ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے خالق کائنات کے حضور پہنچ گئے۔ (محب الحق)

بھی سمجھتا تھا کہ دارالعلوم کا یہ نظام تعلیم میری سازش کو کھوکھلا کر دے گا اور میرے پروگرام میں خلل ڈالے گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ درسگاہ مجاہدین کی ایک نئی پارٹی تیار کر لے۔ انگریز کھلم کھلا اس کے خلاف کوئی حکومتی مظاہرہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی حکمت عملی کا تقاضا تھا کہ اس اسلامی ادارہ کو چھیڑا نہ جائے مگر اس کو ابھرنے کا موقع بھی نہ دیا جائے۔ اس لیے اس نے اس کا وقار گھٹانے اور اس کی بات کو بے اثر کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ بڑا ہتھکنڈا یہ تھا کہ خود مسلمانوں میں سے اور مسلمانوں میں بھی سنی حنفیوں میں سے ایسے لوگوں کو ہمنوا بنا کر اپنا کام نکالا جائے جو پروپیگنڈے میں کمال رکھتے ہوں اور اپنی بات کو منوانے کے لیے ایک خاص ذہن رکھتے ہوں۔ لہٰذا اس سلسلے میں مناسب اور ضروری سمجھا گیا کہ ''حرمین شریفین'' کے علماء اور مفتیان کرام سے اس جماعت حقّہ کے خلاف فتویٰ لے کر تمام دنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً اسے بدنام کیا جائے۔ اس تیر سے دو شکار کرنے تھے ایک دارالعلوم دیوبند کے وقار کو اور اس کی حیثیت کو برباد کرنا، دوسرے فیض آبادی خاندان کو جو سید حبیب اللہؒ کے ساتھ ''مدینہ منورہ'' پہنچا تھا اور جس کے ایک فرد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تھے جو دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے حلقۂ درس کے نمایاں فیض یافتہ تھے اور جو ''مسجد نبویؐ'' میں ''گنبد خضرا'' کے زیر سایہ مدت سے درس حدیث دے رہے تھے اور جو قطب الوقت حضرت گنگوہیؒ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ علماء حرمین کے فتاویٰ کی زد میں لا کر حکومت حجاز سے شہر بدر کرایا جائے۔ اس کے لیے ''حسام الحرمین'' نام کا ایک رسالہ مولوی احمد رضا خاںؒ نے مرتب کیا اور بڑی چالاکی اور ہشیاری سے اکابر دیوبند کی عبارتوں کو کتر بیونت کر کے حجاز کے کچھ علماء سے فتاویٰ حاصل کر لیے مگر شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ نے اسی وقت جب کہ مولوی احمد رضا خاں حجاز میں موجود تھے اور اپنی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے ان کا تعاقب کیا اور ان کے منصوبے کو باطل کر کے شکست فاش دی۔ حضرتؒ اگر مولوی احمد رضا خاں کا تعاقب نہ کرتے اور علماء حرمین کو اصل حقیقت سے

آ گاہ نہ فرماتے تو دارالعلوم اوراس کے اکابر کے وقار کو بڑی ٹھیس لگتی۔ مولوی احمد رضا خاں اس سے پہلے ندوۃ العلماء کے خلاف ۱۳۱۶ھ میں حجاز سے کچھ فتاویٰ منگوا چکے تھے اوران کو ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا۔ اس کا نام ''فتاوی الحرمین لرجف المین'' ہے۔ ندوہ کے خلاف فتاویٰ حاصل کرنے کا محرک بھی غالباً چشم فرنگی کا اشارہ ہوگا۔ میں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے پاس ایک مرقع دیکھا ہے جس میں اکابر علماء کے خطوط، ان کی تحریریں، معلومات سے لبریز یادداشتیں موجود ہیں۔ اس میں حضرت مولانا مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء کا ایک مکتوب گرامی بھی ہے جوانھوں نے احمد رضا خاں کے تخریبی عمل سے متاثر ہوکر کسی ذمہ دار ندوہ کو لکھا ہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے انھوں نے اپنے مکتوب میں اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ندوہ کے خلاف فتاویٰ شائع ہونے پر ایسا بروقت تعاقب نہ ہوسکا جیسا دارالعلوم دیوبند کی طرف سے حضرات اکابر دیوبند کے خلاف فتویٰ لینے پر مولوی احمد رضا کا تعاقب ہوا۔

مولوی احمد رضا خاں کے اس تکفیری کاروبار کا جو ردعمل ہوا اس نے ان کو بڑا پریشان اور مبہوت کر دیا تھا۔ اس تخریبی کاروائی کی روداد اور اس کے بروقت جواب کی سرگزشت ''الشہاب الثاقب'' مؤلفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں قاسم العلوم والمعارف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، رشید ملت والدین مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر کیے جانے والے رضائی حملوں کا بھرپور دفاع کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ مولانا حسین احمد نجیب، رفیق دارالتصنیف والتالیف دارالعلوم کراچی نے کیا ہے۔ ''المہند علی المفند'' مؤلفہ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ نے حسام الحرمین کا پورا پورا رد کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا منظور نعمانی نے بھی فیصلہ کن مناظرہ میں ہر چہار مذکورہ بالا اکابر دیوبند کا دفاع کیا ہے۔ یہ کتاب بھی حسام الحرمین کا ایک جواب ہے۔ یہ تمام مذکورہ بالا کتابیں ''عقائد علماء دیوبند اور حسام الحرمین'' کے نام سے دارالاشاعت کراچی سے یکجا شائع ہوئی ہیں۔ اس

کتاب کا پیش لفظ مولانا محمد تقی عثمانی نے اور مقدمہ مولانا حسین احمد نجیب نے لکھا ہے۔اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے چند اقتباسات پیش کر کے حضرت مدنیؒ کے دو اہم مکتوب ناظرین کے سامنے لاؤں جو ۱۹۱۱ء کے ہیں اور فتنہ رضا خانیت سے متعلق ہیں:

''جب کبھی انگریزی استعمار سے ہندوستان کی آزادی کی بات آئے گی تو علماء دیوبند کا تذکرہ سرفہرست ہوگا۔ اکابر دیوبند میں تحریک سید احمد شہیدؒ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں تھانہ بھون کی اسلامی حکومت، شاملی کا جہاد، تحریک شیخ الہندؒ ریشمی رومال کی تحریک ایسی حقیقتوں کے چند عنوان ہیں جن سے متعصب مورخ بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔'' (عقائد علماء دیو بند ص ۱۸)

اس روحِ جہاد کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ انگریز مفکروں نے یہ تجویز کیا کہ علمائے دیو بند سے ہندوستانی مسلمانوں کا رابطہ ختم کر دیا جائے جب رابطہ نہ ہوگا تو روح جہاد خود بخود دم توڑ دے گی۔اسی ''مقدس مقصد'' کے تحت پنجاب سے ایک نبی کھڑا کیا گیا، بدایوں اور بریلی سے علماء دیوبند کو کافر ثابت کرنے والا ایک گروہ تیار ہو گیا۔شکم پرور پیروں کا وہ طبقہ جو مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اذیت ناکیوں کا سبب بنا تھا، اس گروہ کی پشت پناہی کے لیے لا کھڑا کیا گیا۔(عقائد علمائے دیو بند ص ۲۱)

حضرت نانوتویؒ پر یہ کھلی تہمت لگائی کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی یعنی نبی آخر الزماں ہونے کے منکر ہیں۔اس مقصد کے لیے موصوف کی شہرہ آفاق کتاب ''تحذیر الناس'' کی تین الگ الگ صفحات کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے نکال کر ان میں تقدیم وتاخیر کر کے، پہلے اپنی ایک مسلسل عبارت ترتیب دی پھر ان کے عربی ترجمہ میں انتہائی علمی بددیانتی کا مظاہرہ کر کے اس کو ایسے معنی پہنائے جن کے کفریہ کلمات ہونے میں کسی ادنیٰ مسلمان کو بھی ذرہ برابر بھی شک نہیں ہوسکتا اور یہ سب خاں صاحب کی طبع زاد جدّت طرازی کا کرشمہ تھا۔(عقائد علماء دیو بند ص ۳۰، ۳۱)

حضرت گنگوہیؒ کی طرف ایک ایسا جعلی فتویٰ منسوب کیا گیا کہ جس میں آپ کی طرف اس تحریر کی نسبت کی گئی:

(معاذ اللہ) اگر کوئی اللہ کی نسبت یہ کہتا ہے اور اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کو کافر مت کہو۔ (عقائد علماء دیوبند ص ۳۱)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی کتاب ''البراہین القاطعہ'' کی ایک عبارت کو سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے اپنے الفاظ میں ایسا مختصر مطلب نکالا جو سراسر کفر کے معنی پر دلالت کر رہا ہے وہ یوں کہ:

موصوف اپنی کتاب براہین قاطعہ میں (معاذ اللہ) شیطان کے علم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زیادہ کہتے ہیں اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلم قرار دیتے ہیں۔ (عقائد علماء دیوبند ص ۳۱)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تالیف ''حفظ الایمان'' ص ۷ کی عبارت کو قطع وبرید کے بعد اپنے یہ معنی پہنائے:

(معاذ اللہ) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم زید وعمرو بلکہ چوپایوں کے برابر ہے۔

اکابر علماء دیوبند کی تحریروں کو یوں من مانے معنیٰ والفاظ پہنا کر اور عبارتوں میں قطع وبرید اور تقدیم وتاخیر کر کے ان کو حتی الامکان بھیانک بنا کر علماء مکہ مکرمہ کے سامنے ''المعتمد المستند'' کے خوبصورت نام کے ساتھ پیش کر دیا۔ (عقائد علماء دیوبند ص ۳۱)

حسام الحرمین اور علماء مکہ مکرمہ: مکہ مکرمہ شرفہا اللہ کے باشندوں خصوصاً علماء کرام سے عقیدت تقریباً ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے اس لیے ان کا ہر قول عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مگر حقیقت اور عقیدت کی بنیادیں ہمیشہ یکساں نہیں ہوتیں۔ سرزمین حرم کی طرف منسوب ہر فرد بشر کے لیے یہ ضروری تو نہیں کہ علم وتفقہ اور تقویٰ ودیانت کے ایک

ہی معیار پر پورا اترتا ہو۔ مذکورہ بالا معاملے میں بھی اسی حقیقت کا مظاہرہ سامنے آیا۔ احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جب اپنا رسالہ ''حسام الحرمین'' اہل مکہ کے اصحاب علم کے سامنے پیش کیا تو اس پر مختلف طبقات علماء کرام میں علیحدہ علیحدہ ردعمل ہوا۔ متوسطین علماء میں سے جن حضرات نے اپنی آرا ظاہر کیں انھوں نے کسی حد تک احتیاط سے کام لیا اور اپنی تقریظات میں ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے کسی خاص فرد پر حکم، صرف اسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے جب کہ حسام الحرمین میں مذکورہ عبارت اسی کی ہو اور اس کا یہ عقیدہ بھی ہو۔ (عقائد علماء دیو بند ص ۳۲)

''مکہ مکرمہ'' کے جن بڑے علماء نے حسام الحرمین کی تصدیق سے انکار کیا وہ یہ ہیں:
(۱) مولانا الشیخ حب اللہ مکی شافعیؒ (۲) مولانا شیخ شعیب مالکیؒ (۳) مولانا شیخ احمدؒ (۴) مولانا شیخ عبدالجلیل آفندی حنفیؒ (۵) الشیخ احمد رشید مکی حنفیؒ (۶) شیخ محب الدین حنفی مہاجر مکیؒ (۷) الشیخ محمد صدیق افغانی مہاجر مکیؒ۔ (عقائد علماء دیو بند ص ۳۲، ۳۳، ۳۴)

علماء ''مدینہ منورہ'' میں جن علماء نے حسام الحرمین کی تصدیق سے انکار کیا وہ یہ ہیں:
(۱) حضرت مولانا شیخ یٰسین مصری شافعیؒ (۲) مولانا شیخ عبداللہ نابلسیؒ (۳) مولانا شیخ عبدالحکیم بخاری حنفیؒ (۴) الشیخ السید ملا سعفر بخاریؒ (۵) مولانا شیخ سید محمد امین رضوان شافعیؒ (۶) مولانا شیخ آفندی مامون برّیؒ (۷) مولانا شیخ فاتح طاہری مالکیؒ (۸) صدر محکمۂ عدل شیخ اسماعیل آفندی ترکیؒ۔ (عقائد علماء دیو بند ص ۳۶، ۳۷)

اصل حقیقت کی وضاحت کے لیے حضرت مدنیؒ کی کوششیں اور ان کے نتائج:

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ احمد رضا خاں صاحب اور ان کے رسالہ حسام الحرمین کی حقیقت کو آشکارا کر دیا بلکہ آپ نے سید اسحاق صاحب بردوائیؒ کے ذریعہ اس رسالہ حسام الحرمین میں لکھے گئے علماء دیو بند کی طرف منسوب عقائد سے متعلق تحریروں کی صحت پر مناظرہ کا پیغام بھیجا تو جواب یہ دیا گیا کہ

تم ہمارے قرین نہیں ہو۔اپنے اساتذہ کو لاؤ۔ جو کہ مناظرہ سے فرار کا بہترین راستہ تھا کیونکہ ہندوستان سے اکابر علماء دیوبند کا حجاز پہنچنا آسان نہ تھا......... علماء کبار مدینہ منورہ کی طرف سے حسام الحرمین پر تصدیق کرنے سے انکار شروع کر دیا گیا اور جن لوگوں نے غلطی سے تصدیق کر دی تھی انھوں نے بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا تو اب خاں صاحب نے یہی غنیمت جانا کہ جو کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تصدیقات حاصل ہوگئیں ہیں اسی پر اکتفا کیا جائے اور جلد واپس جانا چاہیے۔اگر مدینہ منورہ میں مزید قیام کیا تو (چونکہ) حقیقت حال واضح ہو چکی ہے لہٰذا یہ لوگ کہیں اپنی اپنی تقریظات واپس ہی نہ لینا شروع کر دیں۔ چنانچہ فوراً واپسی کا رخت سفر باندھا اور ہندوستان واپس پہنچ گئے۔

حسام الحرمین کی تالیف اور اس پر تصدیقات کا یہ کام ایسی صورت حال میں مکمل ہوا کہ علماء حرمین، علماء دیوبند اور ان کے عقائد کے بارے میں صحیح معلومات نہ رکھتے تھے۔ نہایت رازداری کے ساتھ اس لیے (یہ کام) تکمیل پا گیا کہ راز ابھی کھلا نہ تھا اور خان صاحب کے علمی اور سیاسی حدود اربعہ سے حرمین شریفین کے علماء اب تک آشنا نہ تھے۔ (عقائد علماء دیوبند ص ۴۹، ۵۰)

علمائے حرمین نے اس سلسلے میں ۲۶ رسوالات مرتب کر کے علماء دیوبند کے پاس جواب کے لیے ارسال کئے۔ان کی ابتدا میں مکر وفریب کے گزشتہ واقعات کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔یہ تحریر عربی زبان میں ہے ترجمہ یہ ہے:

اے علمائے کرام اور سردارانِ عظام! تمہاری جانب چند لوگوں نے وہابی عقائد کی نسبت کی ہے اور چند اوراق اور رسالے ایسے لائے ہیں جن کا مطلب غیر زبان ہونے کے سبب ہم نہیں سمجھ سکے۔اس لیے امید کرتے ہیں کہ ہمیں حقیقت حال اور قول کی مراد سے مطلع کرو گے۔اور ہم تم سے چند امور ایسے دریافت کرتے جن میں وہابیہ کا اور اہل سنت و جماعت سے خلاف مشہور ہے۔(عقائد علماء دیوبند ص ۶۷، ۶۸)

اس استفسار کے جواب میں حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ نے ایک معرکۃ الآرار سالہ تیار کیا جس کا نام ''المہند علی المفند'' ہے اور جس پر امروہہ، بجنور، دیوبند، دہلی، سہارنپور، مراد آباد، میرٹھ کے نامور علماء کرام کے دستخط موجود ہیں۔ ان میں نمایاں اسماء: شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، سید العلماء مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ، مولانا حافظ محمد احمد ابن قاسم العلوم والمعارفؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہیں۔

مولوی احمد رضا خاں آخر صفر ۱۳۲۹ھ مطابق فروری ۱۹۱۱ء کو عرس حضرت شاہ بلاقیؒ میں مراد آباد آنے والے تھے، اس عرس ہی میں مولوی نعیم الدین مراد آبادی کی طرف سے جلسۂ دستار بندی کا بھی اہتمام تھا۔ مولوی احمد رضا خاں حضرات علماء دیوبند سے مناظرہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ حضرات اکابر دیوبند نے اپنی امادگی کا اظہار کیا اور لکھا کہ آپ مراد آباد میں مناظرہ کے لیے تیار ہو کر آ جائیں، جیسا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن محدثؒ دیوبندی اور مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دار العلوم دیوبندؒ کی ایک مشترکہ تحریر سے ظاہر ہے جو مولوی احمد رضا خاں کے نام ہے اور اس کی نقل مجھے مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی مفسر محشی بیضاوی امروہیؒ کے کاغذات سے ملی ہے۔

نقل خط شیخ الہند حضرت مولانا دیوبندیؒ و مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ بنام مولوی احمد رضا خاں صاحب:۔ نحمدہ ونصلی علی

رسولہ الکریم۔ جامع الاشتات جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب اصلح اللہ بالنا و بالکم۔ اظہار مایلیق بشانکم کے بعد واضح ہو۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مولانا اشرف علی صاحب سے حفظ الایمان کے متعلق مناظرہ کا عزم کر لیا ہے۔ گو ابھی اس مناظرہ کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی مگر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ مراد آباد کسی عرس کی شرکت کے لیے آنے والے ہیں، مولانا اشرف علی صاحب حسب قرارداد معاہدہ آپ سے وقت معین پر مناظرہ کریں گے اور آپ کے مواخذات پر حفظ الایمان کا جواب دیں گے۔ مگر چونکہ آپ نے حضرت مولانا قاسم الخیر

والبرکات اور حضرت مولانا رشید الملت والدین کی نسبت بھی داد ایمانداری دی ہے اور آپ اس میں مدعی ہیں اس لیے ہم کو حق ہے کہ آپ سے آپ کے دعاوی کا ثبوت طلب کریں بلکہ حسب قاعدہ ''الاقدم فالاقدم'' آپ کو اول ہر دو حضرات مرحومین کہ متعلق تصفیہ کرنا ضروری ہے اور ان نزاعات کو اس موقع پر مرادآباد میں طے کرلیا جاوے اور مسلمانوں میں جو اختلاف واقع ہو رہا ہے اس کو رفع کردیا جاوے۔ اس لیے ہم آپ کی خدمت میں اطلاع دیتے ہیں کہ آپ اس خاص کام کے لیے تیار ہو کر مرادآباد کا قصد فرماویں۔ ہم بالاصالۃ مشافہۃ (زبانی) گفتگو کریں گے، آپ بفور پہنچنے اس تحریر کے، اپنے پہنچنے کے وقت سے اطلاع دیں تاکہ ہم لوگ پہلے سے مرادآباد پہنچ جاویں۔ اگر آپ نے ہماری اس تحریر کا کچھ جواب نہ دیا تب بھی بغرض اظہار حق واقع اختلاف ہم لوگ مرادآباد کا قصد ضرور کریں گے۔ مکرر یہ کہ آپ سے اصالۃ گفتگو ہوگی۔ وکالت معتبر نہ ہوگی اور اگر اصالۃ گفتگو سے انکار کرکے کسی وکیل مسلّم کو پیش کریں گے تو اس وقت ہم کو بھی اختیار ہوگا کہ اپنی طرف سے وکیل مسلّم پیش کردیں۔

آگے کو اس مناظرہ کی صحیح روداد نہ معلوم ہوسکی مرادآباد کے اخبارات میں ''نیّر اعظم'' ایک بڑے درجہ کا اخبار تھا اس میں یقیناً یہ روداد شائع ہوئی ہوگی مگر مجھے نیّر اعظم کا فائل نہ مل سکا، جس سے اس موقع کی روداد کا علم ہوتا۔ رسالہ ''ضیاء الاسلام'' میں بھی اس کی روداد ضرور چھپی ہوگی مگر صفر یا ربیع الاول ۱۳۲۹ھ کا کوئی پرچہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ مدرسہ شاہی مرادآباد کی ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کی روداد بھی مدرسہ میں موجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پوری معلومات بہم نہیں پہنچ سکیں۔ البتہ پندرہ روزہ اخبار ''دبدبہ سکندری رامپور'' کے ۲۷ر صفر ۱۳۲۹ھ کے پرچے سے اتنا معلوم ہوا کہ مولوی احمد رضاں خاں صاحب عرس حضرت شاہ بلاقیؒ میں آئے تھے۔ ۴ر ربیع الاول ۱۳۲۹ھ کے پرچے میں ''عرس ومناظرہ'' کے عنوان سے ایک مختصر روداد شائع ہوئی ہے جو انھیں کے کسی بے نام و نشان ہمنوا کی ہے۔ اس روداد کے اخر میں بجائے نام کے یکے از حاضرین جلسہ تحریر ہے۔

اس روداد کا ایک جملہ یہاں نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

''الحمد للہ..... کہ ۲۶ ؍صفر یوم یک شنبہ کو دن کے ا؍ بجے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت.... شاہ محمد احمد رضا خاں صاحب حنفی قادری برکاتی بریلوی مدظلہم الاقدس جلسۂ دستار بندی اور ایک دینی خدمت کے لیے جو مناظرہ کی صورت میں فرقہ غیر مقلدین سے تھی بریلی سے روانہ ہو کر مراد آباد آئے۔''

تعجب ہے کہ اس بے نام ونشان نامہ نگار نے اپنی روداد میں ہر جگہ یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مناظرہ غیر مقلدین کے مقابلہ میں ہونا تھا نیز اکابر دیوبند میں سے کسی ایک کا بھی نام تحریر نہیں کیا ہے حالانکہ خود مولوی احمد رضا خاں نے اپنے ایک خط[1] میں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام ہے لکھا:

''.......معاہدہ میں ۲۷ ؍صفر وصول تعین تاریخ مناظرہ کے لیے مقرر ہوئی ہے... لہٰذا فقیر اس عظیم ذوالعرش کی قدرت ورحمت پر توکل کر کے یہی (۲۷) صفر روز جان افروز دوشنبہ اس کے لیے مقرر کرتا ہے....''

اب میں حضرت شیخ الاسلام کے دونوں مکتوب[2] ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ان دونوں مکتوبات سے واضح ہوتا ہے کہ اکابر دیوبند مناظرہ کا عزم بالجزم لے کر مراد آباد آئے تھے۔

مکتوب نمبر ۱: مخدومی ومکرمی جناب فیض مآب مولانا صاحب زید مجدہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کل ایک عریضہ ارسال خدمت ہو چکا ہے، ملاحظہ نظر فیض اثر سے گزرا ہوگا۔ یہ اشتہار مرسل خدمت ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ بفور ملاحظہ اس کو کاپی پر

---

۱ اس خط کی نقل بھی احقر کے پاس موجود ہے جو حضرت حافظ صاحبؒ کے کاغذات سے مجھے ملی ہے۔

۲ یہ دونوں مکتوب حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی مفسر، محشی بیضاویؒ کے نام ہیں جو اُس وقت مدرسہ شاہی مراد آباد کے صدر المدرسین تھے۔ حضرت حافظ صاحبؒ کے کاغذات میں سے یہ دونوں مکتوبات مجھے حاصل ہوئے جو براہ راست حضرت شیخ الاسلامؒ کے قلم سے ہیں۔ (فریدی)

چڑھوا کر جلد طبع کرا دیجیے۔ بعدہٗ تمام مراد آباد میں تقسیم کرا دیں اور بریلی بھی بہت جلد روانہ کر دیں اور وہاں بھی مشتہر ہو جاوے۔ اشتہار بڑے ورق پر ہونا چاہیے، ہم سب ہر طرح تیار ہیں۔ ذرا آپ حضرات بھی بخوبی تیار ہو جاویں۔ اگر اس کے واسطے کوئی خاص چندہ نہ کیا گیا تو ہم بطور خصوص ان مصارف کے متکفل ہوں گے مگر تاخیر نہ ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں قابل مزید غور و توجہ یہ امر ہے کہ بروز جمعہ حضرت مولانا[1] دامت برکاتہم و جناب حافظ[2] صاحب مدظلہم ہاپوڑ و امروہہ ہوتے ہوئے شام کے دس بجے کی گاڑی میں حضرت مولانا[3] امروہی مدظلہم کو ہمراہ لیتے ہوئے مراد آباد پہنچیں گے۔ بعونہ تعالیٰ! یہ امر نہایت قابل اہتمام ہے کہ بروز جمعہ صبح کو چند آدمی آپ کی طرف سے مولانا مدظلہم کی خدمت میں امروہہ پہنچ جاویں اور ان سے درخواست مراد آباد کر کے ان کی پیش قدمی کریں۔ یہاں سے دو تین قطعہ رجسٹری ان کے پاس روانہ کی جا چکی ہیں۔ مولانا دامت برکاتہم کو یہ حضرات لے کر شام کے وقت اسٹیشن امروہہ پر آ جاویں تا کہ جملہ حضرات کی رفاقت ہو جاوے اور یکبارگی مراد آباد میں پہنچیں۔ مولانا کے واسطے وہاں بھی جائے قیام وغیرہ کا اہتمام خاص ہونا ضروری ہے۔ غرضکہ یہ امور نہایت قابل توجہ والتفات ہیں۔ سرگرم رہیں۔ مولوی بدرالحسن صاحب سہسوانی اگر (ان) حضرات سے پہلے پہنچ جاویں تو جس بات کی ان کو ضرورت واقع ہو اس کی انجام دہی میں مدد ضرور فرماویں۔ جناب مولانا مولوی قدرت اللہ صاحب کی خدمت میں مضمون واحد ہے۔ غالباً احقر ان اکابر کی ہمراہی میں نہ آ سکے بلکہ اگر منظور ایزدی ہے تو شب شنبہ کی ڈاک گاڑی میں ساڑھے تین بجے وہاں پہنچے گا اور ان شاء اللہ تعالیٰ جناب مولوی انور شاہ صاحب کے ہی ہمراہ ہوگا۔ سہارنپور میں بروز جمعہ بعض ضروریات ہیں مسودہ درخواست ارسال خدمت ہے، اس کو مشورہ فرما کر و نیز مولوی حامد حسن صاحب کو دکھلا کر کسی باوجاہت شخص سے درخواست دلا دیں اور اگر اس کے علاوہ اور کوئی رائے مناسب

---

[1] شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی محدث دیوبندیؒ مراد ہیں۔ [2] حافظ محمد احمد صاحب ابن قاسم العلوم والمعارفؒ مراد ہیں۔ [3] سید العلماء مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ متوفی ۱۳۳۰ھ مراد ہیں۔ (محب الحق)

معلوم ہوتو وہ کی جاوے مگر کانوں تک پہنچا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مکتوب نمبر ۲: مخدومی ومکرمی جناب فیض مآب مولانا مولوی عبدالرحمٰن صاحب وحاجی محمد اکبر صاحب وحاجی فضل الٰہی صاحب ومنشی عبدالرزاق صاحب ومنشی محمد اسماعیل صاحب و منشی محمد ابراہیم صاحب زید مجدہم!

بعد از سلام مسنون الاسلام! عرض آنکہ آج معزز نامہ آپ جملہ حضرات کا وارد ہو کر باعث سرفراز ہوا۔ چونکہ قبل ازیں کل اور پرسوں لگا تار دو خط رجسٹری کردہ آپ کی خدمت میں روانہ کر چکے ہیں۔ اس لیے بظاہر کوئی ضرورت اس وقت عریضہ ارسال خدمت کرنے کی نہیں تھی مگر مزید اطمینان کے واسطے ارسال کرتا ہوں۔ آپ حضرات بخوبی اطمینان رکھیں اگر منظور الٰہی ہے تو کل ان شاء اللہ العزیز ہر دو حضرات بعد جمعہ یہاں سے روانہ ہو کر براہ امروہہ ۱۰ بجے وہاں پہنچ جاویں گے۔ ان اکابر کو اس قدر اہتمام ہے کہ باوجودیکہ کل تار بمبئی سے حجاج کے پہنچ جانے کا آچکا ہے مگر ہرگز اس کا خیال نہ کیا گیا اور ہر طرح عازم بالجزم ہیں۔ مولوی ابراہیم صاحب کا یہیں خط آ گیا وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ اسی گاڑی میں ہاپوڑ سے مل جاویں گے۔ حضرت مولانا امروہی مدظلہم کے پاس غالباً آپ نے دو ایک حضرات کو روانہ کر دیا ہوگا۔ احقر ہر چند ہمراہ نہ ہوگا مگر آخر شب کی گاڑی میں حاضر ہو جاوے گا۔ جناب عالی! نہایت مناسب اور ضرور ہے کہ جملہ حضرات کا قیام ایک ہی جگہ ہو جس کے لیے مسجد شاہی کے حجرے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا امروہی مدظلہ کے واسطے کوئی خاص کوٹھری انسب ہوگی۔ مولوی کفایت اللہ صاحب شاہجہانپوری وغیرہ حضرات بھی مولوی ابراہیم صاحب کے ساتھ ضرور پہنچیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز! دیگر ایں کہ ہمارے کھانے کا انتظام شام کے وقت نہ فرمائیں۔ کھا کر آویں گے نیز ایں کہ اکابر کی رائے ہے کہ کل بعد از جمعہ مولانا مولوی عبدالرحمٰن صاحب ایک وعظ خاص اس بارے میں ضرور فرمادیں و نیز آپ اس اجتماع میں جلسۂ جمعیۃ کا بھی استحکام کرلیں۔ جملہ

حضرات سلام مسنون فرماتے ہیں۔ مولوی قدرت اللہ صاحب سے سلام مسنون کہہ دیں۔

فقط والسلام احقر الطلباء حسین احمد غفرلہ ۲۳؍صفر ۱۳۲۹ھ بروز جمعرات

آخر وہی ہوا جس کی توقع تھی خان صاحب خود تاب مناظرہ نہ لا سکے۔ محمد سعید کوتوال شہر کے ذریعہ اپنا کام نکال لیا اور نقض امن کا اندیشہ اس انداز سے ظاہر کیا کہ عوام الناس یہ سمجھیں کہ فریق ثانی نقض امن کا بہانہ بنا کر فرار چاہتا ہے۔

میرا مقصود درحقیقت حضرت شیخ الاسلامؒ کے ان دو مکتوب گرامی کا پیش کرنا اور ان کا پس منظر دکھانا تھا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ ۱۳۲۴ھ میں حجاز مقدس میں اسلاف واکابر کے خلاف برپا ہونے والے فتنہ کا سد باب اور تعاقب جس عظیم شخصیت نے کیا تھا ہندوستان کے اندر ۱۳۲۹ھ میں اسی فتنہ کا مقابلہ اور دفاع سرزمین مرادآباد پر اسی شخصیت نے پوری جانفشانی اور بیدار مغزی کے ساتھ کیا اور پھر ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق مارچ ۱۹۱۱ء میں مرادآباد میں ہونے والی جمعیۃ الانصار کی عظیم الشان مؤتمر کا منعقد کرنا حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ ناظم جمعیۃ الانصار کے ساتھ اسی شخصیت کا کارنامہ تھا جس کے چھ اجلاس حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ کی زیر صدارت ہوئے اور جس نے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ پورے ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک دی اور جس کے نتیجہ میں ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء نہایت شان وشوکت کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی۔ حضرتؒ کی زندگی کا یہ بھی قابل ذکر پہلو ہے جس کا بیان کرنا ضروری تھا ورنہ تو ان کی شخصیت ایک جامع شخصیت تھی۔ ان کا نصب العین اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔ انھوں نے درس حدیث وقرآن کا مشغلہ تمام عمر جاری رکھا اور متقدمین صوفیہ کے طرز پر سلوک کی منزلیں طے کر کے تادم آخر مجالسِ ذکر وشغل کو جاری رکھا۔

تقسیم ہند کے بعد دس سال تک وہ حیات رہے اور اس دس سال کے عرصہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور جس طرح انھوں نے مسلمانوں کے قدم یہاں جمائے اور ہمت وجرأت کی تلقین کی ان کا ذکر تو ایک ضخیم کتاب میں بھی نہیں سما سکتا۔ انھوں نے تقسیم

کے بعد شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک مسلسل دورے کیے اور رات دن اسی فکر میں لگے رہے کہ مسلمانانِ ہند دینداری اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا انعام تھا کہ تقسیم کے بعد حضرتؒ کو دس سال تک اصلاح ورشد و ہدایت کا موقع ملا، ورنہ نامعلوم تقسیم کے بعد مسلمانان ہند کا کیا حال ہوتا۔ حضرتؒ نے بلا تخصیص مسلک ہر ایک مسلمان کی ہمدردی فرمائی اور جو لوگ حضرت کے سیاسی مسلک کے سخت مخالف تھے اور جنھوں نے ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا ان کو بھی تسلی دی اور ان کے بھی کام بنائے، جن لوگوں نے اکابر دیوبند کے خلاف مسلسل جدو جہد کی تھی ان کو بھی راحت و آرام پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ تمام فروعی اختلافات پس پشت ڈال کر عامۃ المسلمین کی نفع رسانی مدنظر رکھی اور اپنی تقریروں و تحریروں میں بالکل یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ ہندوستان میں جن مسلمانوں کی حمایت کی جا رہی ہے ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے ان کے بزرگوں کے خلاف سخت نامناسب ہنگامے برپا کیے تھے اور خود ان کے خلاف بھی ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

مقالہ (۱۲)

ایک عظیم شخصیت[1] ایک اجمالی مطالعہ

نسیمے از حجاز آید کہ نا ید ☆ سرود رفتہ باز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ''آں فقیہے'' ☆ دگر دانائے راز آید کہ ناید

حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ کی سوانح حیات کے بہت سے گوشے ''الفرقان'' کے شیخ الحدیث نمبر میں آئیں گے۔ لکھنے والے حضرتؒ کے تمام اہم حالات و وقائع پیش کریں گے۔ ان کے تدریسی، تبلیغی، مذہبی، سیاسی، اصلاحی اور معاشرتی کارناموں پر واقفانِ حال، سیر حاصل روشنی ڈالیں گے اور حضرتؒ کے زہد و تقویٰ اور روحانیت و فراست کا ایمان افروز تذکرہ کریں گے۔ مجھ ناکارہ نے چاہا کہ اس بزم خاص میں میری بھی شرکت ہو جائے۔ حضرت مولانا نعمانی کو اپنے مختصر مقالہ کی اطلاع دے کر تاخیر کے ساتھ اس بے کیف اور بے ربط تحریر کو پیش کر رہا ہوں۔ اختصار پیش نظر تھا اور ایک عظیم شخصیت کے واقعات زندگی تفصیل چاہتے تھے۔ اس کشمکش کے عالم میں اور معذوری و بے بضاعتی کی شمولیت میں یہ مختصر اور اجمالی سوانحی خاکہ پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری اس حقیر کوشش کو شرفِ قبول بخشے اور حضرت شیخ الحدیثؒ کو بھرپور جزائے خیر اور جنت فردوس سے نوازے۔ آمین

پیدائش: جناب محمد یوسف صاحب کاندھلوی کی صاحبزادی کے بطن سے حضرت مولانا یحییٰ کاندھلویؒ کا ایک صاحب کمال فرزند پیدا ہوا، جو آگے چل کر ملت اسلامیہ کا ایک روشن چراغ اور نور کا مینارہ بننے والا تھا، جس کا نام ''محمد زکریا'' رکھا گیا اور جو جوانی ہی میں اپنے جواہر علمیہ کے باعث ''شیخ الحدیث'' کہلایا۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کی پیدائش ۱۰ رمضان ۱۳۱۵ھ کو

---

[1] ایک عظیم شخصیت سے مراد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم سہارنپوری مہاجر مدنیؒ ہیں۔ یہ مقالہ ماہنامہ الفرقان لکھنو کے شیخ الحدیث نمبر سے لیا گیا ہے۔ (محب الحق)

شب پنج شنبہ میں ہوئی۔ تراویح کے بعد مبارک باد دینے والوں کا ایک بڑا مجمع مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے مکان پر موجود تھا۔ حضرت شیخ الحدیثؒ آگے چل کر حافظ قرآن، مفسر قرآن، محدث بے نظیر، فقیہ بے بدل اور شیخ طریقت و معرفت ہوئے۔ حضرت شیخ کے دادا کا اسم مبارک مولانا محمد اسماعیل تھا۔ آپ کے تایا مولانا محمد میاںؒ اور چچا مولانا محمد الیاسؒ تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت: گنگوہ میں آپ کی ابتدائی تعلیم ہوئی اور آپ کی تربیت کا بھی وہیں پورا پورا خیال رکھا گیا۔ عجیب بات ہے کہ آپ نے سات برس کی عمر تک کسی مکتب میں سبق نہیں لیا۔ باپ کی تربیت اسی وقت سے شروع ہوگئی جبکہ آپ کا شعور بیدار ہو رہا تھا۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور تھوڑی مدت میں حافظ قرآن ہو گئے۔ بہشتی زیور اور فارسی کی کچھ کتابیں اپنے چچا جان سے پڑھیں۔ حضرت گنگوہیؒ اس وقت گنگوہ میں ''آفتاب لب بام'' تھے اور عمر کا آخری زمانہ طے کر رہے تھے۔ ۱۳۲۳ھ میں ان کا وصال ہوا۔ حضرت شیخ عالم طفلی میں ہی اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ حضرت گنگوہیؒ کی مجلس میں جاتے تھے۔ اس وقت کے بہت سے واقعات حضرت شیخ الحدیثؒ نے ''آپ بیتی'' میں نقل فرمائے ہیں اور زبانی بھی سنائے جو بڑے دلچسپ ہیں۔ بعد میں حضرت محمد یحییٰؒ کے ساتھ آپ سہارنپور آ گئے اور خود مولانا یحییٰ صاحبؒ نے اپنے ہونہار فرزند کو محنتی بننے کی ترغیب دی۔ حضرت مولانا یحییٰؒ کا اندازِ تعلیم و تربیت عجیب و غریب تھا۔ مولانا عبداللہ گنگوہیؒ بھی حضرت مولانا یحییٰؒ کے شاگرد تھے اور چار سال کے قریب مدت میں انھوں نے مولانا عبداللہ گنگوہیؒ کو تمام علوم دینیہ کی تکمیل کرا دی تھی۔ یہی وہ مولانا عبداللہ ہیں جن کی دو کتابیں[1] آج کل مدارس عربیہ کے ابتدائی نصاب میں داخل ہیں۔ کامیاب درس و تدریس کا دوسرا تجربہ خود اپنے فرزند شیخ الحدیثؒ پر ہوا اور یہ انہی کی تعلیم و تربیت کا فیض تھا کہ حضرت شیخ الحدیثؒ آفتاب علم بن کر چمکے۔ قطب عالم حضرت گنگوہیؒ کے روحانی فیوض و برکات اور گنگوہ

---

[1] ۱۔ تیسیر المبتدی، ۲۔ تیسیر المنطق (فریدی)

کی نورانی فضااوراس وقت کے مشائخ کاندھلہ کے اثرات کوبھی شیخ الحدیث کی سیرت سازی میں بڑادخل ہے۔حضرت شیخ الحدیثؒ کے والد ماجد نے آپ کی بڑی سخت نگرانی کی اورآپ کے اخلاق واطوار کی درستگی میں بڑی دوربینی اور بلند نظری سے کام لیا۔خود حضرت شیخ الحدیثؒ اپنی مشہور کتاب ''الاعتدال فی مراتب الرجال ''میں تحریر فرماتے ہیں:

''میری ابتدائی تربیت جن اصولوں کے ماتحت ہوئی ہے وہ یہ تھے کہ مجھے سترہ سال کی عمر تک نہ کسی سے بولنے کی اجازت تھی نہ بلامعیت والد ماجد صاحب یا چچا جان کے کہیں جانے کی اجازت تھی اوراس کی بھی اجازت نہ تھی کہ میں اپنے اکابر کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کی مجلس میں بلا والد صاحب اور چچا جان کے ساتھ ہوئے بیٹھ سکوں کہ مبادا میں سبق کی جماعت میں یا حضرتؒ کی مجلس میں کسی پاس بیٹھنے والے سے کوئی بات کرلوں۔ مجھے دو تین آدمیوں کے سوا کسی سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔تنہا مکان جانے کی اجازت نہ تھی یہاں تک کہ جماعت کی نماز میں بھی مخصوص حضرات کی زیر نگرانی شرکت کرتا تھا۔اس دور کی آپ بیتی اگر میں سناؤں تو الف لیلیٰ بن جائے کہ کس قدر حکیمانہ اور مصلحت آمیز تشدد مجھ پر رہا اور کس قدر سخت مجرم قیدیوں کی سی زندگی گزری کہ زہریلی فضاؤں اور صحبتوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔اللہ کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کے فضل نے مجھے نبھانے کی توفیق عطا فرمائی جس کی برکات اب دنیا ہی میں پا رہا ہوں۔''

متوسط وانتہائی عربی تعلیم: حضرت شیخ الحدیثؒ کے والد ماجد کا تقرر ۱۳۲۸ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں ایک مدرس ومعلم کی حیثیت سے ہوا۔اسی سال آپ سہارنپور آکر مظاہر علوم میں داخل ہوگئے جبکہ آپ کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور صرف میر، پنج گنج، فصول

اکبری، کافیہ، مجموعہ اربعین، ترجمہ پارہ عم، قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد۔ یہ کتابیں اپنے والد صاحب کی نگرانی میں تکمیل کو پہنچائیں۔ کتب معقول کے استاذ مولانا عبداللطیف ناظم مظاہر علومؒ اور مولانا عبدالوحید سنبھلیؒ تھے۔ ۱۳۳۳ھ میں دورۂ حدیث شریف کی ابتدا ہوئی اور ابن ماجہ کے علاوہ تمام کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ ابن ماجہ مولانا ثابت علیؒ کے پاس پڑھی۔ ۱۳۳۳ھ میں حضرت مولانا خلیل احمدؒ، حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حجاز مقدس چلے گئے تھے۔ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کی ہندوستان واپسی پر ان سے دوبارہ بخاری شریف و ترمذی شریف پڑھی۔ شعبان ۱۳۳۳ھ میں آپ حدیث شریف کے علاوہ تمام درسیات سے فارغ ہو چکے تھے۔ شوال ۱۳۳۳ھ میں آپ نے دورۂ حدیث اپنے والد محترم سے پڑھا کیونکہ حضرت مولانا خلیل احمدؒ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے اور واپسی نہیں ہوئی تھی۔ دورہ کی تعلیم کا زمانہ بڑے انہاک کے ساتھ مطالعہ میں گزارا اور دو باتوں کا خصوصی اہتمام رکھا۔ ایک یہ کہ ناغہ نہ ہونے پائے۔ دوسرے بغیر وضو حدیث نہ پڑھی جائے۔

والد ماجد کا سانحہ ارتحال: ۱۳۳۴ھ میں آپ کے والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اب تمام تر ذمہ داریاں گھر کی اور متعلقین کی آپ پر آ گئیں۔ والد صاحبؒ کے اوپر جو قرض تھا اس کو بھی ادا کرنے کا تہیہ کیا چنانچہ وہ ادا ہوا۔ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے سایۂ عاطفت اور ان کی رہنمائی میں اپنے ایام گزارنے لگے۔

عقد نکاح: حضرت مولانا یحییٰؒ کی وفات کے بعد حضرت شیخ کی والدہ ماجدہ کی سخت علالت کا سلسلہ بڑھتا گیا اور ان کی یہ خواہش ہوئی کہ اپنے اکلوتے فرزند کی تقریب شادی اپنے سامنے کرا دیں۔ چنانچہ آپ کا نکاح مولانا رؤف الحسن کاندھلویؒ کی دختر نیک اختر سے ہوا۔ مولانا رؤف الحسن صاحبؒ کی دوسری دختر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے عقد نکاح میں تھیں جو حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے حضرت شیخ کے چار رشتے تھے۔ ایک یہ کہ دونوں چچا بھتیجے تھے، دوسرے دونوں آپس میں ہم زلف

تھے یعنی مولانا رؤف الحسن صاحب کی ایک صاجزادی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے عقد میں آئیں اور دوسری صاجزادی شیخ الحدیثؒ کی زوجہ بنیں، تیسرے دونوں آپس میں سمدھی بھی تھے اور وہ اس طرح کہ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے صاجزادے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی شادی حضرت شیخؒ کی صاجزادی سے ہوئی۔ مولانا محمد ہارون مرحوم اسی رشتہ سے حضرت شیخؒ کے نواسے تھے، چوتھے یہ کہ مولانا محمد الیاسؒ خسر اور حضرت شیخؒ داماد تھے۔ مولانا محمد طلحہ سلمہ اسی رشتہ سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے نواسے ہیں۔

اولاد: حضرت شیخؒ کی پہلی شادی مولانا رؤف الحسن کاندھلویؒ کی صاجزادی سے ہوئی جن سے پانچ صاجزادیاں اور تین صاجزادے ہوئے[1]۔ صاجزادیوں میں سے سب سے بڑی مولانا محمد یوسفؒ کے نکاح میں آئیں۔ مولانا محمد ہارون مرحوم ابن مولانا محمد یوسفؒ ان ہی کے بطن سے تھے۔ دوسری مولانا انعام الحسن صاحب کی اہلیہ محترمہ ہیں جن کے بطن سے مولانا زبیر سلمہ ہیں۔ تیسری مولانا حکیم الیاس صاحب سہارنپوری کو ہوئیں، ان کے صاجزادوں میں مولانا محمد شاہد سلمہ اور ان کے بھائی بہن ہیں۔ چوتھی لڑکی کا شادی کے بعد انتقال ہو گیا۔ پانچویں اور سب سے چھوٹی صاجزادی کا نکاح مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے بڑی صاجزادی کے انتقال کے بعد ہوا۔

حضرت شیخؒ کی دوسری زوجہ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی صاجزادی ہیں۔ ان کے بطن سے دو لڑکیاں اور ایک صاجزادے میاں محمد طلحہ ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نکاح مولانا محمد عاقل صاحب استاذ مظاہر علوم اور دوسری کا نکاح مولانا حافظ محمد سلمان صاحب استاذ مظاہر علوم سے ہوا۔

---

[1] مولانا محمد شاہد سلمہ ربہ نے احقر کے استفسار پر جو گرامی نامہ بھیجا اس میں یہ تحریر ہے۔ پہلی اہلیہ مرحومہ سے تین صاجزادے تھے: (۱) محمد موسیٰ یہ رمضان ۱۳۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۷، ۸ ماہ حیات رہ کر ۹/ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ کو انتقال ہوا۔ (۲) محمد ہارون رجب ۱۳۴۹ھ میں ان کی ولادت ہوئی، مختصر عمر میں انتقال ہوا۔ (۳) محمد یحییٰ ۶/جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ میں تولد ہوئے اور مختصر عمر میں انتقال ہوا۔ (مکتوب مولانا محمد شاہد بنام احقر) فریدی

مظاہر علوم کی مدرسی: یکم محرم ۱۳۳۵ھ کو مظاہر علوم کے پندرہ روپے ماہوار پر استاذ مقرر ہوئے۔اس وقت حضرت شیخ کی عمر بیس سال کی تھی۔کئی درس گاہوں کی طرف سے بڑی بڑی تنخواہوں کی پیش کش کی گئی مگر آپ کو مظاہر علوم چھوڑنا گوارانہ ہوااور اپنے استاذ و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے زیر سایہ رہنا ہی پسند کیا۔

پہلے سال اصول الشاشی، علم الصیغہ کے علاوہ چار پانچ سبق نحو و منطق اور فقہ کی ابتدائی کتابوں کے پڑھانے کے لیے سپرد ہوئے۔بڑی محنت اور توجہ سے اپنے اسباق متعلقہ کو پڑھایا جس کی وجہ سے تمام طلباء نہایت خوش رہے۔آپ کا طریقۂ تعلیم بھی بڑا دل کش، جاذب توجہ اور اثر آفریں و ذوق افزا تھا۔تمام حلقہ درس آپ کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتا تھا اور بات بہت سہل اور آسان کر کے پیش کرتے تھے۔تمام ضروری باتیں جو قابل یادداشت ہوتی تھیں ان کو اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان فرمادیتے تھے۔اپنے والد ماجد سے جو طریقۂ تعلیم آپ نے حاصل کیا تھا اس کا کامیاب تجربہ آپ برابر کرتے رہے۔

حضرت سہارنپوریؒ سے بیعت: شوال ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت اقدس سہارنپوریؒ حجاز میں طویل قیام کے ارادہ سے جارہے تھے اور بکثرت لوگ بیعت ہورہے تھے تو حضرت شیخ الحدیثؒ نے حضرت سہارنپوریؒ سے بیعت ہونے کا ارادہ کرلیا اور اپنے مربی و آقا سے درخواست کی، اس پر حضرت سہارنپوریؒ نے ارشاد فرمایا: کہ جب مغرب کے بعد نوافل سے فارغ ہو جاؤں تو آ جانا۔مولانا عبداللہ گنگوہیؒ نے بھی جو خلافت و اجازت سے مشرف ہو چکے تھے تجدید بیعت کی درخواست کی تھی۔دونوں حضرات وقت مقررہ پر حاضر ہو کر حضرت اقدس سہارنپوریؒ سے بیعت ہو گئے۔حضرت مولانا محمد یحییٰؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے بھی اس بیعت کے منظر کو دیکھا اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ بھی اس موقع پر حاضر تھے۔

۱۳۴۴ھ میں حضرت اقدس سہارنپوریؒ مستقل قیام کے ارادہ سے حجاز تشریف

لے گئے، شیخ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت سہارنپوریؒ کا ہر مرتبہ کا سفرِ حجاز اس امید کے ساتھ ہوا کرتا تھا کہ شاید اس بار جنت البقیع کی مٹی نصیب ہو ۱۳۴۴ھ کا یہ سفر حج آپ کا آخری سفر ثابت ہوا اور آپ ۱۳۴۶ھ میں جنت البقیع میں سپرد خاک ہوئے۔ حضرت شیخ کی ہندوستان کو واپسی حضرت سہارنپوریؒ کی حیات میں ہو چکی تھی۔ وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ میں حضرت سہارنپوریؒ نے بڑے اہتمام سے چاروں سلسلوں میں بیعت وارشاد کی آپ کو اجازت مرحمت فرمائی اور اپنے سر سے عمامہ اُتار کر حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے برادر اکبر حضرت مولانا سید احمد فیض آبادیؒ ثم مدنی کو دیا تا کہ وہ حضرت شیخ کے سر پر باندھ دیں۔ جب وہ عمامہ سر پر باندھا گیا تو شیخ کی شدت گریہ سے چیخیں نکل گئیں۔ حضرت پیر ومرشد سہارنپوریؒ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ رائے پوریؒ اس موقع پر بھی موجود تھے اور ان کو اس پورے واقعہ کی اطلاع تھی۔ ہندوستان میں تشہیر ہو جانے کے خوف سے حضرت شیخؒ نے حضرت رائے پوریؒ کے پاؤں پکڑے اور ان سے اس بات کا عہد لینا چاہا کہ وہ ہندوستان پہنچ کر اس اجازت کی اطلاع نہ کریں۔ مگر حضرت رائے پوریؒ اس حقیقت کے اخفا پر تیار نہ ہو سکے اور آپ کے ذریعہ اس کی تشہیر ہو گئی۔ پھر بھی حضرت شیخؒ نے عرصہ تک بیعت لینے سے پہلو تہی کی اور جو کوئی اس نیت سے آتا اس کو دوسرے مشائخ سے بیعت کراتے۔ بالآخر حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے حکم فرمانے سے یہ سلسلہ جاری ہوا اور ان ہی کے حکم سے سب سے پہلے آپ نے کاندھلہ میں اپنے خاندان کی مستورات کو بیعت کیا۔

شیخ الحدیث اور بذل المجہود: درحقیقت ''بذل المجہود'' کی ترتیب وطباعت کا کام بھی حضرت شیخ الحدیثؒ کا ایک زریں کارنامہ ہے جس نے ان کے اندر علم حدیث کا اعلیٰ درجہ کا ذوق پیدا کیا اور ان کے درس حدیث کو بھی کامیاب سے کامیاب تر بنایا۔ مولانا محمد شاہد سلمہ حضرت شیخ کے متعلق ''تاریخ مشائخ چشت'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ نے

جس طرح کامل طور سے اپنے آپ کو اپنے حضرت کے سپرد کیا، اپنی دماغی اور علمی صلاحیتوں کو حضرت کی خاطر قربان کیا، اس کا ایک نمونہ بذل المجہود کی شکل میں آج ہزاروں صفحات پر بکھرا ہوا موجود ہے۔ حضرت شیخ کو اپنی دماغی صلاحیت، ذہنی ذکاوت اور اپنے بیش قیمت اوقات کا لحظہ لحظہ اور لمحہ لمحہ اس کی نذر کرنا پڑا۔ خود حضرت سہارنپوریؒ نے اس کا بار بار اعتراف کیا اور بذل المجہود کی موجودہ شکل وصورت کو شیخ کا مرہون منت بتلایا۔ واقعہ یہ ہے کہ بذل المجہود، ابوداؤد کی ایک ایسی عظیم الشان شرح ہے جس نے حدیث پاک کی بالاتری کو برقرار رکھتے ہوئے مسلک حنفی کی حقانیت کو بھی اظہر من الشمس کیا ہے۔

تصنیفات وتالیفات: حضرت شیخ کی تصنیفات بڑی تعداد[1] میں ہیں ان سب کا ذکر کرنا مختصر سوانح حیات اور مختصر واقعات زندگی کے ساتھ مناسب نہیں۔ اس لیے چند اہم اور مشہور ومعروف اور قابل ذکر کتب کے اسماء پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ کی تصنیفات وتالیفات عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں اور ان کی تاثیر، جاذبیت، شہرت ومقبولیت حافظ شیرازی کے اس مصرعے کی مصداق ہے ع

قبول خاطر ولطف سخن خداداداست

(۱) خصائل نبویؐ: شمائل ترمذی کی وجد آفرین اور عشق انگیز اردو شرح ہے۔

(۲) اوجز المسالک: موطاء امام مالک کی ایک مستقل مقدمہ کے علاوہ چھ جلدوں میں بہترین عربی شرح ہے۔ جس کو ۱۳۴۵ھ میں شروع کر کے ۱۳۷۶ھ میں ختم کیا گیا۔ حجاز کے مالکی علماء ومشائخ نے بھی اس شرح کو بہت پسند کیا۔

---

[1] حضرت شیخ کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد ایک سو پانچ ہے جن کو مولانا سید محمد شاہد زید مجدہم نے فہرست تالیفاتِ شیخ میں تمام کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں مطبوعہ بھی ہیں اور غیر مطبوعہ بھی۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کون سی کتاب کے کتنی زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں اور اس زبان کا عکس بھی دیا ہے۔ فہرست تالیفاتِ شیخ مطالعہ کے قابل ہے۔ (محب الحق)

(۳) لامع الدراری[1]: تین جلدیں۔ (۴) حاشیہ کوکب الدری[2] دو جلدیں (۵) الاعتدال فی مراتب الرجال (۶) حکایاتِ صحابہؓ (۷) فضائل نماز (۸) فضائل ذکر (۹) فضائل تبلیغ (۱۰) فضائل قرآن (۱۱) فضائل رمضان (۱۲) فضائل صدقات (۱۳) فضائل حج (۱۴) فضائل درود شریف (۱۵) قرآن اور جبریہ تعلیم (۱۶) حجۃ الوداع والعمرات: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع اور چاروں عمروں کا مفصل ومبسوط تذکرہ جو عربی زبان میں ہے اور بعد میں اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے علمی وفنی نوادر ہیں جن میں سے بعض کو مکتوبات علمیہ اور مکتوباتِ تصوف وغیرہ سے موسوم کر کے مولانا شاہد میاں سلمہ نے شائع کرایا ہے۔ آئندہ بھی امید ہے کہ وہ حضرت شیخ کے تمام غیر مطبوعہ علمی سرمائے کو اسی طرح طبع سے آراستہ کر دیں گے۔ جن میں کتب درسیہ کی شروح بھی ہیں اور اہم رسالے بھی ہیں جن کی رہنمائی میں طلباء و مدرسین اپنے منازل تحقیق و مطالعہ کو بآسانی طے کر سکتے ہیں۔

یہ بات بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ حضرت شیخ کی بہت سی تالیفات متعدد بار مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی ہیں۔ فضائل قرآن دس زبانوں میں، فضائل رمضان گیارہ زبانوں میں، فضائل تبلیغ چودہ زبانوں میں، حکایات صحابہؓ تیرہ زبانوں میں، فضائل نماز چودہ زبانوں میں، فضائل ذکر سات زبانوں میں، فضائل حج چار زبانوں میں، فضائل صدقات چھ زبانوں میں، فضائل درود شریف چار زبانوں میں۔

---

[1] یہ کتاب حضرت گنگوہیؒ کی تقاریر بخاری شریف کی تعریب ہے جس کو حضرت مولانا محمد یحییٰؒ نے معرب و مرتب اور حضرت شیخ نے حواشی اور مقدمہ سے مزین فرمایا ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ اس کے اختتام پر حضرت شیخ نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں ایک ہزار سے زائد علماء، صلحاء، طلباء اور عقیدتمند عوام دور ونزدیک کے شریک ہوئے۔ اندرون خانہ بھی مہمان مستورات کو اس تقریب میں کھانا کھلایا گیا۔

[2] یہ قطب عالم حضرت گنگوہیؒ کی تقریرات ترمذی کا مجموعہ ہے۔ اس کی تعریب بھی حضرت مولانا محمد یحییٰؒ نے کی تھی۔ اس کتاب پر حضرت شیخ الحدیثؒ نے حاشیہ لکھا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ (فریدی)

آخر میں صرف فضائل تبلیغ کے تراجم کی زبانوں کی تفصیل جو چودہ ہے پیش کرتا ہوں: (۱) عربی (۲) برمی (۳) انگریزی (۴) ہندی (۵) مدراسی (۶) ملیالم (۷) تامل (۸) گجراتی (۹) ملیشیائی (۱۰) بنگالی (۱۱) فارسی (۱۲) تیلگو (۱۳) افریقہ میں بولی جانے والی ایک زبان سہالی (سہیلی) (۱۴) فرانسسی۔

اسفارِ حج اور ہجرت: حضرت اقدسؒ نے "مدینہ منورہ" کا قیام اختیار کرنے اور ہجرت کی نیت[1] کرنے سے پہلے سات حج ادا کر لیے تھے جن کی تفصیلات کو میاں محمد شاہد سلمہ نے اپنے قلم سے لکھے ہوئے حالات شیخ میں درج کر دیا ہے۔ ان سات حجوں کے بعد بھی کئی حج ادا فرمائے۔

اعتکاف: "آپ بیتی" جلد سات میں حضرت شیخ الحدیثؒ نے لکھوایا ہے کہ:

> "اس ناکارہ کے پاس احباب کے رمضان گزارنے کا سلسلہ تو تقریباً ۳۰، ۴۰ سال سے ہے۔ شروع میں تو ۱۰، ۱۲ آدمی ہوتے تھے اور اس ناکارہ کا یہ معمول تھا کہ رمضان کے چند روز ان مہمانوں کو اپنے پاس رکھ کر رائے پور حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں رمضان گزارنے کے واسطے بھیج دیتا اور ایک پرچہ بھی لکھ دیتا کہ ان کو حضرت کی خدمت میں رمضان گزارنے کے واسطے بھیج رہا ہوں۔ اس کی وجہ سے حضرتؒ کی توجہات عالیہ میرے مہمانوں پر خصوصی رہتی تھیں۔
>
> اس کے بعد مجمع ہر سال بڑھتا رہا اس لیے رائے پور بھیجنے

---

[1] مولانا محمد شاہد سلمہ بجواب استفسار رقمطراز ہیں: "حضرت نور اللہ مرقدہ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں جو بندے کے پاس محفوظ ہے تحریر فرمایا ہے کہ میں نے تابیعہ کی خبر سن کر ہجرت کی نیت کر لی۔ حضرتؒ نے اپنے ایک روزنامچہ میں ۲۱ رجون ۱۹۷۷ء سہ شنبہ کی تاریخ میں تحریر فرمایا ہے کہ آج کی تاریخ میں زکریا کا تابیعہ ملا۔ ان دونوں باتوں کو ملانے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ۲۱ رجون ۱۹۷۷ء موافق ۵ ررجب ۱۳۹۷ھ میں ہجرت کی نیت فرمائی۔ صراحتاً کہیں تاریخ نیت ہجرت نہیں ملی۔" (مکتوب شاہد بنام فریدی)

کا مستقل اہتمام تو چھوٹ گیا کہ حضرتؒ کے بھی رمضان پاکستان وغیرہ میں ہونے لگے۔ ۱۳۸۲ھ میں حضرت رائے پوریؒ کے وصال کی وجہ سے مجمع میں اور اضافہ شروع ہو گیا۔ ۱۳۸۴ھ میں تو مولانا یوسف صاحبؒ کی معیت کا اعتکاف چھوڑ کر ۱۵ نفر سہارنپور پہنچے مگر یہاں جگہ نہیں تھی۔ ان بیچاروں کا اعتکاف بھی رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائے۔ زکریا نے اس سال پورے ماہ کا اعتکاف مدرسہ قدیم کی مسجد میں کیا تھا۔ اس وجہ سے جگہ کی اور تنگی ہو گئی۔ اس لیے ۱۳۸۵ھ سے دار الطلباء جدید کی مسجد میں رمضان گزارنا شروع کیا۔ وہاں بھی ہر سال مجمع بڑھتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ اس سال ۷۰ نفر معتکف تھے۔ آخر میں ۲۰۰ تک تعداد پہنچ گئی۔ ۱۳۸۶ھ میں معتکفین ۲۰۰ تک شروع ہی سے ہو گئے۔ ۱۳۸۷ھ میں تقریباً ۵۰ نفر کو یہ کہہ کر انکار کرنا پڑا کہ مسجد میں جگہ نہیں رہی۔ دار الطلباء جدید میں خیمے لگانے پڑے۔ طلباء کے جو حجرے خالی تھے ان میں مہمانوں کا ٹھہرانا شروع کیا۔ ۱۳۸۹ھ میں اس ناکارہ کا حرمین شریفین میں رمضان گزرا۔ چونکہ ۱۳۹۳ھ کا رمضان بھی اس ناکارہ نے حرمین شریفین میں گزارا تھا اس لیے احباب کا اندازہ یہ تھا کہ ۱۳۹۴ھ میں مجمع بہت ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس سال شروع رمضان ہی سے آٹھ نو سو کا اندازہ تھا اور آخر رمضان میں عزیزی مولوی نصیر الدین نے کہا کہ آج ۱۸۰۰ مہمان ہیں۔"

عمر کے آخری دور میں ایک مرتبہ فیصل آباد (لائل پور) میں اور دوسری مرتبہ جنوبی افریقہ میں بڑے مجمع کے ساتھ اعتکاف کیا۔ رمضان کی آخری تاریخوں میں خصوصاً ۲۷ کی

شب میں سہارنپور میں ایک بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ معتکفین میں سیکڑوں علماء، ہزاروں حفاظ وقراء، تہجد گزار، شب بیدار اور ذاکرین وشاغلین موجود ہوتے تھے۔ ہندوستان کے متعدد صوبوں اور علاقوں کے علاوہ بیرونِ ہند سے حتیٰ کہ حجاز مقدس سے بھی وابستگانِ حضرت شیخ رمضان میں سہارنپور آجاتے تھے۔

احقر کئی سال رمضان المبارک کے آخر عشرے میں ایک دو دن کے لیے خدمت بابرکت میں گیا ہے۔ عجیب نورانی عالم ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بارش کی طرح برستی محسوس ہوتی تھیں۔ حضرت شیخ کی وفات کے بعد جب امسال پہلا رمضان آیا تو احقر دیوبند سے سہارنپور پہنچا۔ حضرت شیخ بہت یاد آئے اور ان کی مجالس بھی تصور میں آتی رہیں۔ حضرت مفتی محمود الحسن[1] گنگوہی دامت برکاتہم نے امسال حضرت شیخ کی نیابت میں اعتکاف کیا۔ اور ایک اچھا خاصا مجمع ان کی توجہ سے بھی جمع ہو گیا۔ ہر طرح کا انتظام معتکفین اور واردین کے لیے ان کی طرف سے کیا جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے آستانۂ شیخ الحدیثؒ سے تعلق رکھنے والے مہجورین کو بہت کچھ تسلی وتشفی کا سامان بہم پہنچا۔

وفات: یکم شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء کو پیر کے دن شام کے ۵ بجکر ۴۰ منٹ پر مدینہ منورہ میں حضرت کا وصال ہوا۔ کچھ کم ۸۷ سال کی عمر ہوئی۔ قبل نمازِ عشا جنازہ باب السلام سے حرم شریف لے جایا گیا۔ بعد نمازِ عشاء حرم شریف کے امام شیخ عبداللہ زاحم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنازہ کو باب جبریل سے جنت البقیع[2] کی طرف لے کر چلے۔ بقول ڈاکٹر اسماعیل میمنی مدنی بے پناہ ہجوم تھا۔ ایسا ہجوم کسی اور شخص کے جنازہ میں شاید ہی

---

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو مفتی صاحبؒ بقید حیات تھے۔ آپ کا وصال جنوبی افریقہ میں ۱۷ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ موافق ۲ ستمبر ۱۹۹۶ء میں ہوا اور وہیں ابدی آرام گاہ بنی۔ (محب الحق)

[2] حضرت شیخ نے مولانا حاجی خورشید صاحب رامپوری کو مولانا ذوالفقار مرحوم رامپوری کی خبر وفات سے مطلع ہو کر ایک خط میں تحریر فرمایا ہے "مولانا ذوالفقار صاحب کے حادثۂ انتقال پر قلق تو طبعی چیز ہے مگر موت کی جو کیفیت آپ نے لکھی اور جنت البقیع کا مستقل قیام قابل مسرت ہے۔ (فریدی)

دیکھا گیا ہو۔ قبر شریف حضرت شیخ کی منشا کے مطابق اہل بیتؒ کے احاطہ اور حضرت سہارنپوریؒ کی قبر شریف کے قریب تیار کی گئی تھی۔ وہیں حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ و سلم کے ظل عاطفت میں اور صحابہؓ واہل بیتؓ اور اکابر امتؒ کے زیر سایہ قیامت تک کے لیے آسودۂ خاک ہوئے اور عمر بھر کی وہ تمنا پوری ہوئی جس کی خاطر روز وشب بے قرار و بے چین رہے اور بقول جگر مرادآبادیؒ

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر ☆ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت شیخ کے تلامذہ اور خلفاء: حضرت شیخ کے تلامذہ اور درس حدیث کے مستفدین کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ مظاہر علوم کی رودادوں کو مطالعہ کیے بغیر ان کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان میں بکثرت مشاہیر علماء وفضلاء اور درس وافتاء کے بہت سے ماہرین اور صاحب تصانیف حضرات بھی ہیں جنھوں نے ہند و بیرون ہند میں اپنے فیوض علمیہ سے طلباء اور تشنگانِ علوم کو سیراب کیا ہے اور ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی مسند درس پر متمکن ہو کر تمام اطراف عالم میں سلسلہ فیض جاری کیے ہوئے ہیں۔ آپ کا سلسلہ طریقت بھی دور دور تک پھیلا ہوا ہے، وہ افراد جنھوں نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی ہے ان کی تعداد بلا مبالغہ لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ آپ کے مجازین کی تعداد صوفی محمد اقبال مدنی کی فہرست کے مطابق ۱۰۹ ہے۔ اس ناکارہ کے علاوہ سب کے سب صاحبان علم وفضل اور حاملان زہد وتقویٰ ہیں۔ ان میں چند حضرات وہ ہیں جو شریعت وطریقت کے آفتاب و مہتاب کہے جاسکتے ہیں۔ حضرت شیخ کو مسجدوں، درسگاہوں، کتب خانوں اور خانقاہوں کے آباد کرنے کا جس قدر خیال تھا اس کا اندازہ وہ اشخاص بخوبی لگا سکتے ہیں جنھوں نے براہِ راست حضرت والاؒ سے ملاقاتیں کی ہیں اور حضرت کی تصنیفات وتالیفات اور ملفوظات کا مطالعہ کیا ہے۔

مرتب کی کتاب اور مبصر

''سید العلماء'' مبصر: مولانا عبدالحمید نعمانی ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی

جناب مولانا محبّ الحق صاحب دھُن اور لگن کے آدمی ہیں اور جب آدمی میں دھُن اور لگن ہوتو وہ کچھ نہ کچھ ایسا کام ضرور کر جاتا ہے جو قابل توجہ بن جاتا ہے۔ مذہب، سماج، تذکرہ، سوانح، سیاست، صحافت اور شعروادب پر اتنی کتابیں شائع ہو رہی ہیں کہ اگر آدمی عمر نوحؑ بھی لے کر آئے تو وہ مطالعہ کے لیے کم پڑ جائے۔ اس لیے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ضروری اور کام کی وہ کتابیں ہی پڑھی جائیں جو مسرت و بصیرت کا سامان بہم پہنچائیں یا کم از کم سماج کے اوبڑ کھابڑ اور استیصال و ریاکاری کے خلاف مقدس نفرت کا جذبہ ہی پیدا کر دیں۔ ہم مذکورہ بالا موضوعات پر جب فرصت کے لمحات میسر آتے ہیں تو یہ تحریریں پڑھ کر مسرت و بصیرت کا سامان کرتے ہیں۔ کتابیں بہت آتی ہیں کہ ان پر کچھ لکھا جائے بہت سے حضرات کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ تحسین و تعارف ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ علمی دیانت کے منافی ہے اور قاری کی حق تلفی بھی کہ اسے اپنے اصل احساسات میں شریک نہ کیا جائے۔

ان صفحات پر جناب مولانا محبّ الحق کی متعدد تالیف و ترتیب کردہ کتابوں پر تبصرہ کئے گئے ہیں۔ ایک بار انھوں نے پھر اپنی کوشش و جستجو سے زیر تبصرہ کام کی کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کی ہے۔ یہ کتاب درحقیقت ''عظیم محقق عالم مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ'' کے ان سوانحی سلسلۂ مضمون کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے ماہنامہ ''دارالعلوم دیوبند'' میں حضرت نانوتویؒ کے نامور تلامذہ میں شامل نامور شاگرد سید العلماء مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ کے حالات زندگی پر نو قسطوں میں تحریر کیا تھا۔ اس قسطوار تحریر کو مفید حاشیے اور کچھ اضافی مواد کے ساتھ مولانا محبّ الحق نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ۷۶ صفحات کی کتاب میں محدث امروہیؒ کی زندگی کے مختصراً تمام ضروری گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی جلد اور سرورق بہتر ہے تاہم حواشی مٹے مٹے سے ہیں تھوڑی روشنائی بچانے کے چکر میں حاشیہ کے حسن و افادیت کو نقصان پہنچا ہے۔ آئندہ کی اشاعت میں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

حضرت محدث امروہیؒ کی کچھ تحریریں، تقریریں اور خطوط کے جو اقتباسات دیے گئے ہیں ان پر واضح طور سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے اثرات اور رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے یہاں بڑوں کی سرگرمیوں اور مختلف مواقع پر ان کے کیے کاموں کی پوری کیا

ضروری تفصیلات تحریر کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اگر یادداشتوں کو روزنامچے کے شکل میں منضبط کرنے کا تھوڑا اہتمام ہوتا تو ہمارے سامنے وہ ضروری چیزیں ہوتی جو عدم توجہی کی وجہ سے تاریکی میں ہیں۔ قادیانیت اور غیر مقلدیت وغیرہ کے تعلق سے جو تھوڑی سی تفصیلات اور یادداشت سے اقتباسات دیے گئے ہیں ان سے مذکورہ موضوعات پر کام کرنے والوں کو بڑی روشنی ملے گی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے فتنے ماضی میں پیدا ہوئے ہیں اور وہ کس کس رنگ میں شکل بدل کر آئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں مرتب مولانا محبّ الحق نے امروہہ اور اس کی اہم شخصیات اور وہاں کے مختصر قدیم اور جدید حالات کے تناظر میں روشنی ڈالنے کے ساتھ آخر میں جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ کے شروع سے اب تک کہ ذمہ داروں سے روشناس کرایا ہے۔

کتاب کے حواشی مفید ہیں ایک حاشیہ میں مولانا محب الحق نے یہ تحریر کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تین بڑی شخصیات کے بھائی قادیانی ہو گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بھائی ابوالنصر غلام یاسین آہ، مولانا محمد علی جوہر کے بھائی ذوالفقار علی گوہر اور شاعر علامہ اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ علامہ اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد کے بارے میں متضاد باتیں علامہ اقبال پر لکھی جانے والی تحریروں میں ملتی ہیں۔ اس موضوع پر بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ مولانا آزاد کے بھائی ابوالنصر غلام یاسین آہ کے بارے میں دوسرے حضرات بھی قادیانیت کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی بھی یہ بات کہتے تھے۔ غالباً یہ فیروز بخت احمد کو معلوم ہو شاید اس لیے کہ وہ اپنے سگے دادا کے بجائے دادا کے بھائی سیاسی علمی طور سے نمایاں مولانا آزاد کے پوتے کے طور پر سامنے آنا بہتر سمجھتے ہیں۔ بڑوں کے نام کے ساتھ خود کو جوڑ کر سامنے لانے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ سہارنپور کے مولانا سید محمد شاہد اپنی کتابوں میں شخصی تعارف میں اپنے باپ دادا کے بجائے نواسۂ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ لکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قاری اصل انتساب کے علم سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس زیر تبصرہ کتاب میں حضرت محدث امروہیؒ کے خاندان، نام ونسب، ابتدائی تعلیم، تکمیل تعلیم، مختلف مدارس میں تدریسی خدمات، علمی آثار، مناظرے، تلامذہ، طریقہ درس، شاعری، مدرسہ اسلامیہ امروہہ کا اہتمام، فتاویٰ، درس قرآن، عادات واخلاق وغیرہ جیسے بیسوں عنوانات کے تحت حضرت محدث امروہیؒ کو سامنے لایا گیا ہے۔ اکابر کے سوانح وتذکرہ کے ذیل میں یہ قابل مطالعہ کتاب ہے۔

مرتب کی دیگر کتابیں

۱. فیضانِ نسیم: مولانا فریدیؒ کے حالات، ملفوظات اور مکتوبات

۲. سیرت ذوالنورینؓ: امیر المومنین خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے مختصر حالات

۳. مکتوباتِ نعمانی: مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مکتوبات بنام نواب عزیز الٰہی خاں مرحوم حسن پوری۔

۴. مکتوباتِ مشاہیر: بنام نواب عزیز الٰہی خاں مرحوم حسن پوری

۵. اردو تفاسیر و تراجم: علماء دیوبند کی تفسیری خدمات

۶. مقالاتِ فریدی (جلد اول): مولانا فریدی امروہیؒ کے مقالات

۷. سید العلماء: حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ کی سوانح حیات